سِ علیہ طیلسانین عثمانیہ کا سہ ماہی رسالہ

جلد اول
جنوری ۱۹۳۷ء

نمبر ۱
بہمن ۱۳۴۶ف

مجلہ طیلسانین

مجلس علمیہ طیلسانین جامعہ عثمانیہ کا سہ ماہی علمی و ادبی رسالہ

ناشر

مجلس علمیہ طیلسانین عثمانیہ
بازار گھانسی
حیدرآباد دکن

مجلس ادارت

۱۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ام اے (عثمانیہ) پی ایچ ڈی (لندن)
پروفیسر اُردو جامعہ عثمانیہ۔ صدر

۲۔ عبدالمجید صدیقی ام اے، ال ال بی (عثمانیہ) پروفیسر تاریخ جامعہ عثمانیہ رکن

۳۔ غلام دستگیر رشید ام اے (عثمانیہ) لکچرار فارسی نظام کالج رکن

۴۔ سید محمد ام اے (عثمانیہ) لکچرار اُردو وفارسی گورنمنٹ سٹی کالج معتمد

منتظم اعزازی

سید مهدی حسین (عثمانیہ)

مجلۂ طیلسانین

فہرست مضامین

جلد اول	جنوری ۱۹۳۷ء م بہمن ۱۳۴۶ ف	نمبر ۱

مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱۔ اداریہ	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ ام اے (عثمانیہ) پی ایچ ڈی (لندن) پروفیسر ادبیات اردو جامعہ عثمانیہ	۳
۲۔ افادات فلسفہ	ڈاکٹر میر ولی الدین ام اے (عثمانیہ) پی ایچ ڈی (لندن) پروفیسر فلسفہ جامعہ عثمانیہ	۹
۳۔ اب ایک شعر کے سانچے میں ڈھل رہا ہوں میں	عبدالقیوم خاں باقیؔ ام اے (عثمانیہ)	۲۰
۴۔ عہد ابراہیم عادل شاہ ثانی کے متولیان ریاست (مقالہ)	سید علی محسن ام اے (عثمانیہ)	۲۱
۵۔ مشرق	مخدوم محی الدین ام اے (عثمانیہ)	۷۷
۶۔ فقہ اسلامی کی ابتداء اور ترقی	محمد غوث ام اے ال ال بی (عثمانیہ)	۷۸
۷۔ طیلسانین سے خطاب	عبدالسلام ذکی بی اے (عثمانیہ)	۹۹
۸۔ اُردو ادب بیسویں صدی میں (مقالہ)	سید علی حسنین زیباؔ ام اے (عثمانیہ)	۱۰۱

۹۔ تنقید و تبصرہ		۱۳۳
۱۰۔ سالانہ رپورٹ انجمن طیلسانئین عثمانیہ	عبدالرحیم بی اے (عثمانیہ) معتمد انجمن	۱۳۴
۱۱۔ سالانہ رپورٹ عثمانیہ بلدی جماعت	صاحبزادہ میر وزیر علی بی اے (عثمانیہ)	۱۴۷

سید مہدی حسین (عثمانیہ) منتظم اعزازی

نے

"زندہ طلسمات فائن آرٹ پرنٹنگ پریس" میں چھپوا کر دفتر مجلۂ طیلسانئین بازار گھانسی حیدرآباد دکن سے شایع کیا۔

تنقید ۱۹۵۹ — اداریہ

یہ مجلہ طیلسانیئن عثمانیہ کا ترجمان ہے۔ اس میں انہیں کے حالات وخیالات ہر تیسرے ماہ پیش کئے جائیں گے، اس کی اشاعت میں بڑی دقتیں پیش آئی ہیں، یہی وجہ ہے کہ آج سے کئی سال پیشتر شایع ہونے کی جگہ یہ اس قدر تعویق سے جاری ہو رہا ہے۔ سرکار سے مجلہ کی اشاعت کی اجازت حاصل کرنی اور دوسری مشکلات سد راہ تھیں۔ بحمد اللہ اب یہ دونوں منزلیں طے ہو چکی ہیں، اور توقع ہے کہ یہ دیر سے آنے والا ہر طرح سے درست ثابت ہوگا، اور ملک کی توقعات جو اس سے وابستہ ہیں خاطر خواہ پوری ہوں گی۔

جامعہ عثمانیہ کے قیام کے بعد سے اگرچہ ایک ایسی عظیم الشان جامعہ کے شایان شان تعداد میں طیلسانیئن نہیں نکلے، لیکن یہ ملک کی خوش قسمتی ہے کہ جامعہ نے کمیت سے زیادہ کیفیت پر زور دیا اور اگرچہ کما حقہٗ تعداد نہیں ہے لیکن جتنے بھی سپوت ہر سال اس جامعہ سے سندیں حاصل کر کے نکلتے ہیں اُن میں ایک کافی تعداد ایسے طیلسانیوں کی ہوتی ہے جو اپنے عرصۂ عمل میں برابر سرگرم کار رہتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اُن کے علمی وادبی کارنامے مبصرین کی نظروں میں قابل قدر قرار پاتے ہیں۔

انجمن طیلسانیئن عثمانیہ کی ہر سالانہ کانفرنس میں فرزندان جامعہ عثمانیہ کی علمی وادبی فتوحات کی نمایش کیجاتی ہے، جو کوئی اس نمایش کو دیکھ کر باہر نکلتا ہے اُس پر ملک کے نونہالوں کے کارناموں کا ایک خوش آئند اثر مترتب ہوتا ہے۔ سائنس، ریاضی، فلسفہ، طب، انجینیری، تاریخ، تنقید، شعر وسخن، افسانے اور ڈرامے، غرض علم وفن کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس میں طیلسانیوں کی اس مختصر سی جماعت نے اپنی ذہنی کاوشوں سے اضافہ نہ کیا ہو، اور خوشی کی بات تو یہ ہے کہ بعض اصحاب نے اپنے اپنے موضوع سے متعلق اجتہادی شان حاصل کر لی ہے۔

انجمن طیلسانئین عثمانیہ کی کانفرنسوں کی ان علمی نمائیشوں کی سیر کرنے والوں سے یہ امر مخفی نہیں ہے کہ فرزندان جامعہ عثمانیہ کے بعض علمی کارنامے ابھی زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوئے کیونکہ ہر نمائش میں بعض قلمی مسودات بھی اُن کی نظر سے گذرتے ہیں اور یہ مشتے نمونہ ازخروارے ہیں، جملہ طیلسانئین عثمانیہ کو ایسے ذرائع حاصل نہیں ہیں کہ وہ اپنی تصنیفات وتالیفات وتراجم یا مقالوں یا مضامین کو شایع کرکے منظرعام پر لاسکیں۔ افسوس ہے کہ ملک میں باوجود ہمہ جہتی ترقی کے ایسے اشاعت خانے اب تک قائم نہ ہوسکے جو علمی وادبی کتابوں کو شایع کرکے ایک طرف تو مصنفین و مولفین کی امداد کرتے اور دوسری طرف اُردو ادبیات کے خزانے کو مالا مال کرسکتے۔

ان حالات کے بپیش نظر ضروری تھا کہ کوئی ایسا ادارہ قائم کیا جاتا جو جامعہ عثمانیہ کے سپوتوں کے علمی کارناموں کو منظرعام پر لانے کی کوشش کرتا اور اس ادارے کا انجمن طیلسانئین عثمانیہ ہی سے متعلق ہونا مناسب بھی تھا۔ مسرت کا مقام ہے کہ اس انجمن کے کارکنوں کو شروع ہی سے اس کا احساس رہا اور انھوں نے ایک مجلس علمیہ بناکر یہ کام اس کے تفویض کردیا۔

مجلس علمیہ گذشتہ دو تین سال سے طیلسانئین عثمانیہ کے علمی وادبی کارناموں کے تحفظ واشاعت کے متعلق غور وخوص اور عملی تجاویز میں مصروف ہے۔ اُس نے اپنی برادری کی علمی فتوحات کی نشر و اشاعت کے کام کا آغاز اس مجلہ کی اجرائی سے کیا ہے۔ اس مجلہ میں طیلسانئین کے بلند پایہ علمی وادبی مضامین اور شعر و سخن کے نمونوں کے علاوہ فی الحال اُن مقالوں کو بھی بالاقساط شایع کیا جارہا ہے جن کو ام اے وام یس سی وغیرہ کے امتحانوں کے لیے طیلسانئین عثمانیہ نے قلمبند کیا تھا! ور جن کو ممتحنوں نے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور لکھنے والوں کو امتحان میں کامیاب قرار دیا۔ ان میں سے اکثر مقالے اچھی تحقیقات کا نتیجہ اور ضروری معلومات کے حامل ہیں۔ ان کی اشاعت سے علم وفضل ومعلومات اور ادبیات اُردو میں معتدبہ اضافہ ہوگا۔

مجلس علمیہ نے یہ التزام کیا ہے کہ مجلے میں شایع کرنے کے ساتھ ساتھ ان مقالوں کو کتابی صورتوں میں بھی شایع کردیا جائے۔ چنانچہ جہاں کسی مقالے کی جملہ اقساط اس مجلہ میں چھپ جائیں گی اُس کے ساتھ ہی وہ مقالہ کتابی صورت میں بھی عوام کے ہاتھوں تک پہنچ جائے گا۔ اس طرح سے توقع ہے کہ چند سال میں طیلسانئین عثمانیہ کے

جملہ بلند پایہ مقالے جو اس وقت اہل ذوق کی نظروں سے پوشیدہ ہیں منظر عام پر آجائیں گے۔

مجلہ طیلسانئین میں اس امر کا بھی لحاظ رکھا جائے گا کہ اُردو کی اعلیٰ درجے کی جملہ مطبوعات پر مستند اور معیاری تنقیدیں طیلسانئین ہی سے لکھوائی جائیں، کیونکہ آج خدا کے فضل سے طیلسانیوں کی برادری میں ہر علم و فن کے ماہر افراد موجود ہیں، اور یہ تنقیدیں جہاں اُن کی علمی و فنی معلومات کی آئینہ دار ہوں گی اُردو زبان و ادب کے رجحانات اور جدید ترین ضروریات کی مشیر و رہنما بھی ثابت ہوں گی۔

اہل ذوق نوجوانوں اور پُر خلوص کارکنوں کی اُردو زبان کو عہد حاضر میں بےحد ضرورت ہے، اور کوئی تعجب نہیں اگر جامعہ عثمانیہ کے سپوت اپنی زبان کی خدمت گذاری میں دوسروں سے پیش پیش ثابت ہوں۔ اُن کا سب سے اہم فریضہ یہ ہے کہ اُردو زبان کے تحفظ و استحکام کے لیے ہر طرح کے ایثار کو گوارا کریں۔ عہد حاضر میں اُردو زبان کی کشتی ایک تلاطم خیز سمندر میں ڈگمگا رہی ہے، ضرورت ہے کہ اس کی ناخدائی کے لیے ایسے ہی تازہ دم اور مستعد نوجوان آگے بڑھیں۔ ہندوستان کی کوئی اور جامعہ اپنے فرزندوں سے اُردو زبان کی امداد اور تحفظ کے لیے اس طرح توقع نہیں رکھ سکتی جس طرح جامعہ عثمانیہ کی توقعات اس کے سپوتوں سے وابستہ ہیں۔

اتفاق کی بات ہے کہ اُردو زبان و ادب کے خدمت گذار ہر سال کم ہوتے جا رہے ہیں، اور افسوس اس کا ہے کہ اُن کی جگہ لینے والے نظر نہیں آتے۔ اس سال منشی پریم چند، حضرت اصغر گونڈوی، نور الحسن نیر جیسے خدمتگذاران اُردو نے دنیا سے منھ موڑ لیا، ان میں سے ہر ایک اُردو زبان و ادب کی خدمت میں منہمک تھا۔ اُردو ادب کی عجیب بدبختی ہے کہ طیلسانئین عثمانیہ کی برادری میں سے بھی ایک نوجوان خدمت گذار اُردو مولوی شیخ چاند صاحب ام اے، ال ال بی، ریسرچ اسکالر (مصنف ملک عنبر، ایکناتھ و مرزا رفیع سودا (حیات و کلام پر تبصرہ) نے بھی بے وقت انتقال کیا۔ وہ اگرچہ نوجوان تھے لیکن محنت و ریاضت اور اُردو کی خدمت کرتے کرتے بوڑھے ہوگئے تھے کثرت کار نے اُن کے تنومند قویٰ کو ایسا مضمحل کر دیا تھا کہ وقت سے پہلے وہ موت کے آہنی پنجے کا شکار ہوگئے۔ مرحوم نے انجمن ترقی اُردو کی بڑی تندہی سے خدمات انجام دیں۔ اُردو شاعروں کے جملہ تذکرے اور قدیم اُردو کتابیں وغیرہ جو گذشتہ چند سال سے انجمن نے شایع کیں ان سب کی ترتیب و تہذیب و فراہمی مواد وغیرہ میں مرحوم نے جو زحمتیں اُٹھائی ہیں ان کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ انجمن کی لغتوں کے کام میں بھی انھوں نے جانکاہ حصہ لیا ہے، روزانہ مسلسل چھ چھ گھنٹے وہ مختلف مترجمین کے

پاس سے آئے ہوئے مسودوں کی ترتیب اور اُن کو مطبع میں جانے کے قابل بنانے اور پروفوں کے دیکھنے میں صرف کیا کرتے تھے۔ مولوی عبدالحق صاحب کو قدیم اُردو کتابیں جمع کرنے اور دور دراز دیہات اور مقامات میں سفر کرکے کتابیں حاصل کرنے میں بھی شیخ چاند مرحوم سے زیادہ کسی اور نے مدد نہیں دی۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے ان تمام نایاب اور بیش بہا قلمی نسخوں کی بسیط فہرستیں بھی مرتب کرلی تھیں، افسوس ہے کہ وہ اپنے کام کو پھلتا پھولتا نہ دیکھ سکے۔ انھوں نے رسالۂ اُردو میں جو تحقیقی مضامین اور اُردو کی مطبوعات پر تنقیدیں لکھی ہیں وہ سب ظاہر کرتی ہیں کہ اگرچہ وہ اُردو زبان وادب پر کام کرنے والوں میں سب سے کم عمر تھے لیکن کثرتِ مطالعہ اور اُردو ادب کے سچے ذوق نے اُن کے نقطۂ نظر اور معلومات کو بڑے بڑے ادیبوں اور انشا پردازوں سے زیادہ سنجیدہ اور وقیع بنادیا تھا۔ مولوی صاحب کی نگرانی میں انھوں نے اُردو زبان اور ادب پر کافی دسترس حاصل کرلی تھی اور کام کرنے کی ایسی صلاحیت پیدا کرلی تھی کہ اگر وہ زندہ رہتے تو مولوی صاحب کے سچے جانشین اور اُردو زبان کے مخلص خدمتگذار ثابت ہوتے۔ اس جواں مرگ کی موت سے مولوی عبدالحق صاحب کے ساتھ ساتھ جملہ طیلسانئین عثمانیہ کو سخت صدمہ پہنچا۔

طیلسانئین عثمانیہ ایک اور ہستی کی وفات سے خاص طور پر متاثر ہوئے اور یہ ہستی اگرچہ عمر کے لحاظ سے جوان نہیں تھی لیکن کام کرنے کے ولولوں اور ہمت کے نقطۂ نظر سے نوجوانوں سے زیادہ قابل قدر تھی، یہ مسٹر میکنزی نائب معین امیر جامعہ ہیں جن کی وفات نے جامعہ کے جملہ بہی خواہوں کو مایوس کردیا۔ اس قلیل عرصے میں جامعہ کی خدمت کے لیے آنجہانی نے جس طرح سے کام کا آغاز کیا تھا وہ ظاہر کرتا ہے کہ اُن کی ذات سے جامعہ عثمانیہ پوری طرح بہرہ مند ہوتی طیلسانئین عثمانیہ آئندہ ان صدموں کو بھلا نہ سکتے اگر نواب مہدی یار جنگ بہادر جیسی علم دوست اور پُرخلوص ہستی اُن کی کاربراری اور رہنمائی کے لیے موجود نہ ہوتی۔

نواب مہدی یار جنگ بہادر ایک عالم و فاضل اور محسن اُردو "باپ" کے قابل فخر فرزند ہیں۔ انھیں علم وفضل کا ذوق ورثہ میں ملا ہے اور اب یہ بھی ثابت ہوچکا ہے کہ اُردو زبان وادب کی دلچسپی اور امداد کے لحاظ سے بھی وہ اپنے والد کے سچے جانشین ہیں۔ جامعہ اور طیلسانئین کے مفاد کو ہر وقت ترجیح دیتے رہتے ہیں۔ طلبا دوستی میں حیدرآباد میں آج اُن کی نظیر نہیں معلوم ہوتا ہے کہ طالب علموں سے ملنے میں انھیں دلی مسرت ہوتی ہے اور علم دوستوں کی ملاقات کے لیے وہ اپنے مصروف اوقات میں سے

کچھ نہ کچھ حصہ ضرور نکال لیتے ہیں۔ ہم اس کو جامعہ عثمانیہ اور ملک کی خوش قسمتی سمجھتے ہیں کہ نواب مہدی یار جنگ بہادر کو تعلیمات اور جامعہ کی وزارت سے سرفراز کیا گیا۔ نواب صاحب کو اُردو سے اس قدر دلچسپی ہے کہ باوجود گوناگوں مصروفیتوں کے اُردو کانفرنس کی شرکت کے لیے علیگڈھ جانے کا موقع نکال لیا اور وہاں ہر اجلاس میں خاص طور پر دلچسپی لی اور آخری اجلاس کی صدارت بھی فرمائی اس میں آپ نے اُردو زبان کے متعلق بصیرت افروز خطبہ ارشاد کیا جو اس کانفرس کی مطبوعہ رپورٹ میں شایع ہو چکا ہے۔ یہ سب اُمور ظاہر کرتے ہیں کہ نواب مہدی یار جنگ بہادر سے بہتر معین امیر جامعہ ہم کو نہیں مل سکتا تھا۔ ہم کو یقین ہے کہ آپ اپنی جامعہ کے ذریعہ تعلیم یعنی زبان اُردو کے استحکام اور فرزندان جامعہ کی اُردو خدمتگزاریوں کی قدرافزائی فرماتے رہیں گے۔

اس سلسلہ میں علیگڈھ کی اُردو کانفرنس کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ انجمن ترقی اُردو نے گذشتہ دس سال کے عرصہ میں اُردو زبان کی خدمت میں قابل قدر حصہ لیا ہے اور اب ضرورت تھی کہ وہ اپنے دائرۂ عمل کو وسیع کرکے اُردو کے تحفظ و استحکام کے لیے بھی تیار ہو جائے۔ گذشتہ چند سال میں ہندوستان کی سیاسی فضا بہت کچھ بدل چکی ہے۔ برادران وطن جو پہلے باہمی اتحاد و اتفاق کا پرچار کیا کرتے تھے اور اسی لیے باہمی اختلافات اور تفرقوں کو دُور کرنے کی خاطر ہندوستانی کو تمام ہندوستان کی مشترکہ زبان قرار دیا تھا اب ہندی کی طرف مائل ہو گئے ہیں اور اُردو کی مخالفت میں کسی پاس و مروت کا لحاظ رکھے بغیر سرگرم کار ہیں۔ ایسی صورت میں انجمن ترقی اُردو جیسے منظم اور مستعد ادارہ کا اہم فریضہ ہے کہ وہ تمام ہندوستان میں اپنی شاخیں پھیلائے اور ایک مرکزی مقام سے اُردو کی تحفظ و اشاعت اور تبلیغ کا کام شروع کرے۔ اب وہ زمانہ باقی نہیں رہا کہ شعراء و مصنفین اپنے اپنے کنج خمول میں بیٹھے ہوئے خیالی اور مصنوعی شعر و سخن اور تصنیفات سے جی بہلائیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ وہ میدانوں میں نکل کر اُردو بولنے والوں کے احساسات کو گرمائیں تاکہ ان کی کوششوں سے تمام اُردو دنیا میں اپنی زبان کی حفاظت و استحکام کا خیال برقی رو کی طرح دوڑ جائے۔

اس ضرورت کے پیش نظر مولوی عبدالحق صاحب انجمن ترقی اُردو کے مستعد معتمد نے اکتوبر ۲۴ و ۲۵ ر سنہ ۱۹۳۶ء کی تاریخوں میں علیگڈھ میں ایک کانفرنس منعقد کی جس میں ہندوستان کے مختلف مقامات سے اُردو زبان و ادبیات کے متعدد ماہرین جمع ہوئے تھے۔ پہلے اجلاس میں کانفرنس نے ایک مجلس مشاورت بھی مقرر کر دی تھی جس نے

بعد غور وخوض حسب ذیل کمیٹیاں بنائی اور اُن کے ارکین کا انتخاب کیا۔ (۱) اصلاح زبان کی کمیٹی (۲) ادبی کمیٹی۔ (۳) اشاعت خانہ کمیٹی۔ اس کے علاوہ طے پایا کہ برطانوی ہند اور دیسی ریاستوں میں اُردو کی اشاعت کے مرکز قائم کئے جائیں، چنانچہ ہر صوبہ میں اس قسم کے مرکز متعین کئے گئے۔

اس اثناء میں انجمن ترقی اُردو کی طرف سے آل انڈیا اُردو کانفرنس کی ۸۶ صفحوں کی رؤداد بھی شایع ہوئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انجمن نے اپنے کام کو محض کانفرنس تک محدود نہیں رکھا، بلکہ وہ برابر سرگرم کار ہے۔ ضرورت ہے کہ متذکرۂ بالا کمیٹیوں کے اجلاس بھی جلد منعقد ہوں تاکہ بہت جلد عملی کام کا آغاز ہو سکے۔ اس قسم کے کاموں میں ہاتھ بٹانا طیلسانئین عثمانیہ پر بھی فرض ہے اور یقین ہے کہ اگر انھیں کام کا موقع دیا جائے تو وہ اپنی جملہ قوتوں کے ساتھ اس میں منہمک ہو جائیں گے۔

طیلسانئین جامعہ عثمانیہ کا ایک ضروری فریضہ اپنے ملک و مالک کی وفاداری اور خیرخواہی ہے۔ اور اس خصوص میں اس جامعہ کی خوش قسمتی قابل رشک ہے، کیونکہ یہ بارہا ثابت ہو چکا ہے کہ اس کے سپوت اپنے ملک اور مالک کی بہبودی اور جاں نثاری کو ہر وقت اپنا طرۂ امتیاز سمجھتے ہیں۔

یہ اطلاع اُردو زبان و ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یقیناً موجب مسرت ہوگی کہ حیدرآباد کی مشہور درسگاہ سٹی کالج نے اُردوئے قدیم کے بڑے شاعر ولیؔ اورنگ آبادی کا دو صد سالہ جشن یادگار منانے کا اعلان کیا ہے۔ اس سلسلے میں بہ سرپرستی نواب سالار جنگ بہادر، دکنی تصنیفات اور تصاویر کی ایک بے نظیر نمائش بھی منعقد ہوگی۔ حیدرآباد کے بعض مشہور اور صاحب ذوق امیروں کے ذاتی کتب خانوں کی وہ نادر اور نایاب کتابیں اور تصویریں منظر عام پر آئیں گی جن کے آج تک نام ہی سُنے جاتے تھے۔ ہم جناب صدر صاحب سٹی کالج اور دیگر کارکنان جشن یوم ولیؔ کو اس ادبی خدمت پر مخلصانہ مبارکباد دیتے ہیں۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

ام اے (عثمانیہ)، پی ایچ ڈی (لندن)، پروفیسر ادبیات اُردو جامعہ عثمانیہ

افادات فلسفہ

آخر یابد ہر کہ ز صد قش جوید　　　تخمے کہ بجا فتاد آخر روید

گویند کہ ہر کہ یافت حرفے نہ زند　　　نے نے غلط است ہر کہ یابد گوید　　　(شاہ بدخشی)

ہیگل کا قول ہے کہ "جس مہذب قوم کا فلسفہ نہیں ہوتا اس کی مثال ایک عبادت گاہ کی سی ہے جو ہر قسم کی زیب و زینت سے آراستہ و پیراستہ ہے لیکن جس میں قدس الاقداس ہی کا وجود نہیں"۔ جس طرح ہر متمدن قوم کا ادب و فن ہوتا ہے، معاشری و مذہبی زندگی ہوتی ہے، اسی طرح اس کا فلسفہ بھی ہوتا ہے۔ مشرق میں اپنشدوں اور مغرب میں فلاطون کے زمانے سے فلاسفہ کا یہ کام رہا ہے کہ نصب العینوں کی تشکیل کریں اور یہ بتلائیں کہ حیات انسانی کے کن کن تجربات کو اہم یا مرکزی قرار دیا جائے اور اس طرح قوم کی رہبری کریں۔ فلسفہ زندگیوں کو بدلتا رہا ہے اسی معنیٰ میں یہ تخلیقی ہے۔ "تہذیب یا تمدن عملی فلسفہ ہے"۔

کن افادات کی بنا پر فلسفہ کو یہ رتبہ حاصل رہا ہے؟ ان ہی کی مختصر تشریح اس وقت پیش کی جا رہی ہے ؏

ہشدار کہ راہ خود بخود گم نہ کنی!

(۱) فلسفہ عملی ہے۔ بر اول قدم پر عام یقین کے خلاف ہم یہ بتلائیں گے کہ فلسفہ عملی ہے۔ نوالس نے کہا تھا کہ "فلسفہ طبخ نان کے کام کا نہیں، لیکن وہ ہمیں خدا، آزادی اور حیات بعد الموت کا یقین دلاتا ہے"۔ فلسفہ آپ سے مخاطب کرتا ہے

یک دم غم جاں بخور غم ناں تا کے　　　در پرورش ایں تنِ ناداں تا کے

اندر رہِ طبل شکم و نائے گلو　　　ایں رقصِ زنخ بضربِ دنداں تا کے　　　(رومی)

تنِ ناداں کی پرورش میں ہمہ تن مصروف ہو کر آپ اس سے انکار کیجئے۔ شک کے جنوں میں خندہ زناں ہو کر پوچھئے کیا واقعی فلسفہ خدا، آزادی، حیات بعد الموت کا یقین دلاتا ہے؟ بس بس ؏

در خود نگر و فضولی آغاز مکن

کیا فخر رازی نے یہ اعتراف نہیں کیا تھا کہ ؎

ہفتاد و دو سال فکر کردم شب و روز — معلوم شد کہ ہیچ معلوم نشد

ہاں فلسفہ ہمیں ان چیزوں کا یقین عطا نہیں کرتا، جو چیزیں ہمیں آسانی سے ملتی ہیں، ہم ان کی قدر بھی تو نہیں کرتے! فلسفہ طبخ نان کے کام کا نہیں، لیکن یہ ضرور طباخ کی زندگی میں نئے معنی پیدا کرتا ہے اور خود طبخ نان کو اہمیت بخشتا ہے۔ کوتاہ و تنگ نظر افادی مقاصد، مادی منافع، فلسفہ کے محرک ہیں اور نہ کبھی رہے ہیں تاہم گلبرٹ چیسٹرٹن کے اس قول میں ایک صداقت پنہاں ہے کہ "لینڈ لیڈی کے لیے جو کسی کرایہ دار کو اپنے مکان میں لینا چاہتی ہے یہ جاننا ضروری ہے کہ اس کرایہ دار کی آمدنی کیا ہے؟ لیکن اس سے زیادہ ضروری یہ جاننا ہے کہ اس کا فلسفۂ حیات کیا ہے؟"

اگر انسان کی زندگی کے لیے صرف روٹی ہی ضروری اور کافی ہے، اگر رقصِ زنخ و ضربِ دنداں ہی کو وہ مشغلۂ حیات سمجھتا ہے تو پھر وہ صاف طور پر بغیر شرم و حیا کے کیوں نہیں پوچھتا کہ شاعری اور موسیقی و گلہائے شاداب کا کیا عملی فائدہ ہے؟ ان سے وہ کیوں محظوظ ہوتا ہے؟ موجودہ تمدن کی تن آسانیوں کے باوجود انسان کا ذہن حیرت و محبت سے متہیج ہوتا ہے اور صداقت و جمال و خیر کا شیفتہ و فریفتہ ہے" اور یہی فلسفہ کے اقدار ہیں۔

لیکن ذرا اس امر کی تحقیق تو کیجیے کہ ہم کسی چیز کو عملی کیوں کہتے ہیں اور کب کہتے ہیں؟ وہ کیا خصوصیات ہیں جن کی بنا پر وہ عملی کہلاتی ہے؟ بلا شبہ ہم عملی کے معنی کو صرف روپیہ کمانے کی قابلیت ہی کی حد تک محدود نہیں کر سکتے گو ہمارا یہ یقین ہے کہ فلسفہ اس قابلیت میں کسی قسم کا نقص نہیں پیدا کرتا بلکہ انسان کو ایک مرفہ الحال جماعت کا رکن بنانے میں مدد کرتا ہے، لیکن فلسفہ کی حقیقی عملیت کے ایک اور معنی ہیں، فلسفہ عملی ہے اس لیے کہ وہ

(۱) تمام مسائل زندگی پر غور و فکر کرنے کی عادت پیدا کرتا ہے

(۲) تمام اشیاء، واقعات، تجربات اور تمام اشخاص کو ان کے تمام علائق و اضافات میں رکھ کر سمجھنے میں مدد دیتا ہے

(۳) ہمارے مقاصد و غایات، ہماری تعلیم، صنعت و حرفت، حکومت و مملکت، اخلاق و آداب و مذہب پر کامل و متوافق طور پر غور و فکر کرنے پر ابھارتا اور آمادہ کرتا ہے

(۴) حیات انسانی کے معنی اور اس کی قدر و قیمت کے متعلق ایک باعزت نظری تصور قایم کرنے میں مدد دیتا ہے۔

مختصر یہ کہ زندگی پر جب بحیثیت مجموعی نظر ڈالی جائے تو نہایت ضروری معلوم ہوتا ہے کہ فرد کو جماعت یا معاشرہ میں ایک پاک وصاف وکارآمد زندگی بسر کرنی چاہیئے۔ شہری ہونے کی حیثیت سے وہ محض روپیہ کمانے کی مشین نہیں بلکہ وہ ایک شوہر بھی ہے اور باپ بھی، وہ ایک ہمسایہ ہے جو نظم وقانون، صحت عامۂ مکانات کے حسن وآسایش اور نئی پود کی صحت اخلاقی سے گہری عملی دلچسپی رکھتا ہے۔ ان چیزوں سے عقلی دلچسپی رکھنا زندگی پر من حیث کل نظر ڈالنا ہے اور یہی فلسفہ ہے۔ سقراط نے ہمیں تنبیہ کی تھی کہ "جس زندگی کا غائر نظر سے امتحان نہ کیا گیا ہو وہ زندگی بسر کرنے کے قابل نہیں" اب انسان ہونے کے معنی عملی ہونے کے ہیں۔ اور عملی ہونے کے معنی زندگی کی غایات واقدار اور ان کے حصول کے ذرائع پر غور وفکر کرنے کے ہیں۔

آکسفورڈ یونیورسٹی کا مشہور فلسفی شلر کہتا ہے کہ "یہ نہایت جرأت کے ساتھ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ تہیج فکری اپنی بدایت وماہیت کے لحاظ سے بالکلیہ عملی ہے۔ فلسفہ کے انتہائی مسائل وہی ہیں جو زندگی کے عملی مسائل کے نتائج تک پہنچنے سے حاصل ہوئے ہیں۔ ان کا تعلق اس نظریہ سے ہے جس کی توثیق ہر عمل کو کرنی چاہیئے۔"

(۲) فلسفے کے مختلف شعبے خود مفید ہیں:۔

فلسفے کے مختلف شعبوں پر نظر ڈالو تو تمھیں خود ان مسائل واغراض کے مفید ہونے کا یقین ہو جائے گا۔ مثلاً، منطق استدلال کے حصول سے بحث کرتی ہے۔ وہ انتاج صائب کے شرائط کا مطالعہ کرتی ہے۔ کیا ہم سب فکر واستدلال کے معاملہ میں غیر محتاط ومتناقص واقع نہیں ہوئے ہیں؟ کیا ہمیں کسی دائرۂ عمل میں کمال حاصل کرنے کے لیے یا کسی معاملہ میں عملی طور پر کامیاب ہونے کے لیے تفکر واستدلال میں متوافق ہونے کی ضرورت نہیں؟ ان مسائل سے کوئی دوسرا مضمون بحث نہیں کرتا۔

اخلاقیات حیات اخلاقی کے اصول ومعیارات سے بحث کرتی ہے۔ "مفتاح خزاین سعادت دنیوی" پیش کرتی ہے، راہ عمل سجھاتی ہے، نیکی کی طرف لے جاتی ہے۔ آدمیت کو لحم وشحم وپوست پر مشتمل نہیں قرار دیتی بلکہ "صفائے دوستی" اصل انسانیت قرار دیتی ہے۔ دیکھو اس رباعی میں اخلاق کے کیا گر بیان ہوئے ہیں۔

با نفس جہاد کن شجاعت ایں است | بر خویش امیر شو امارت ایں است
انگشت بہ حرف عیب مردم مگذار | مفتاح خزائن سعادت ایں است

کیا یہ انسان کو حقیقی معنی میں عملی اور کامیاب بنانے کے لیے کافی نہیں اور کیا ان کی ہر فرد بشر کو ضرورت نہیں؟

فلسفۂ معاشرت حیات انسانی کے ان غایات و اقدار سے بحث کرتا ہے جن کا تحقق حیات معاشری و اوارات مدنیہ میں ہوتا ہے جس کے علم کے بغیر زندگی حقیقی معنی میں کامل نہیں ہوتی۔ علمیات یا نظریۂ علم فکر کے شعوری و غیر شعوری مفروضات کا امتحان کرتا ہے۔ مذہبی، اخلاقی، سیاسی، معاشیاتی و تعلیمی ادبیات پر خامہ فرسائی کرنے والے، نیز علمائے سائنس نہ اتنی فرصت رکھتے ہیں اور نہ انھیں اس قدر دلچسپی ہوتی ہے کہ ان تجریدی معاملات کا امتحان کریں، خصوصاً شاعری ایسے تصورات سے مملو ہوتی ہے جس کے تضمنات و مدلولات کا امتحان ضروری ہوتا ہے۔ مابعد الطبیعیات کائنات و زندگی کا ایک جامع نقطۂ نظر پیش کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ یہ اور فلسفہ کے دوسرے شعبے ان سوالات کی تحقیق کرتے ہیں جن کے اٹھانے پر عقل انسان مجبول و مجبور ہے۔ تہذیب کی ساری تاریخ میں قدیم اہل یونان سے لے کر ہمارے زمانہ تک انسان نے ان مسائل کی تحقیق میں بے اندازہ سرور حاصل کیا ہے، اور اس تحقیق سے جو بصیرت حاصل ہوئی ہے وہ اسکے لیے آرام جاں ثابت ہوئی ہے۔ اس کی دلکشی ہمیں اپنی طرف جذب کرتی رہی ہے۔ فلسفہ سائنس سے زیادہ دلچسپ اور دلکش ہوتا ہے، اس کے مقابلہ میں سائنس کی دلچسپی ضرب کی تختی میں جو دلفریبی ہے اس سے زیادہ نہیں۔

(۳) فلسفہ علم کو جامعیت بخشتا ہے۔

فلسفہ علم میں وحدت پیدا کرتا ہے، حیات فکری میں وحدت پائی جاتی ہے، لہٰذا علم میں بھی وحدت ضروری ہے۔ عقل نظریات میں توافق و جامعیت کی متلاشی ہوتی ہے، اسی کی تشفی کرتے ہوئے فلسفہ زندگی کے تمام مخصوص اغراض میں رشتۂ وحدت کا جویا ہوتا ہے۔ سائنس (علوم) انسان و عالم کے متعلق واقعات، نظریات و قوانین کا توضیحی و علی بیان پیش کرتے ہیں۔ یہ محض طریقے اور راستے بتلاتے ہیں، فلسفہ ان کے برخلاف ترکیبی و توجیہی واقع ہوا ہے۔ یہ زندگی کے وسیع تر غایات و مقاصد و اقدار سے بحث کرتا ہے۔ یہ ہمیں اقدار کی دنیا میں لے جاتا ہے۔ جب غایات و اقدار پر غور و فکر کر لی جاتی ہے، عام اصول کا استحکام ہو جاتا ہے تو پھر زندگی کے ہر عملی اقدام پر رہبری و ہدایت کا چراغ ضیا پاشی کے لیے ہمارے سامنے موجود رہتا ہے۔

(۴) فلسفہ ہمیں یہ سکھلاتا ہے کہ کس چیز کے متعلق سوال کریں اور سوال کس طرح کریں:-

بعض دفعہ فلسفہ کے خلاف یہ کہا جاتا ہے کہ فلسفہ نہ کسی مسئلہ کو حل کرتا ہے اور نہ کسی سوال کا قطعیت کیساتھ جواب دیتا ہے۔ سائنس کے برخلاف جو ضروری اور اہم سوالات کے مخصوص جواب دیا کرتی ہے فلسفہ محض سوالات کو اٹھاتا ہے اور جواب کسی کا نہیں دیتا۔

آں قوم کہ راہ میں فتادند شدند — کس را بیقیں خبر نہ دادند شدند

آں عقدہ کہ ہیچ کس ندانست کشاد — ہر یک بندے براں نہادند شدند (طوسی)

ذرا توقف کیجئے اور ایک وقت میں ایک سوال کیجئے۔ کیا آپ کسی ایسی سائنس کا نام بتا سکتے ہیں جس نے کسی بھی اہم سوال کا یقینی قطعی جواب دیا ہو؟ سائنس کی تاریخ پر نظر ڈالئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ کس طرح سائنس میں نظریات و اعتقادات، سینما کی متحرک تصاویر کی طرح بدلتے رہتے ہیں۔ سائنس کی تاریخ ہزار ہا مسترد نظریات کی تاریخ ہے۔ مثال کے طور پر ہم چند عالمگیر اہمیت رکھنے والے نظریات کا ذکر کریں گے۔

آج سے پچاس پچپن سال پہلے کائنات کی ابتدا کی توجیہ لاپلاس کے سدیمی مفروضے Rebular hypothesis سے کی جاتی تھی۔ کانٹ نے اس نظریہ کو اب سے پہلے پیش کیا تھا۔ لاپلاس نے اس کی توضیح کی تھی۔ آج کل شکاگو یونیورسٹی کے پروفیسر چمبرلین اور پروفیسر مولٹن نے اسکی توجیہ میں Plaretesinab hypothesis پیش کی ہے جو اول الذکر نظریہ کی تردید کرتی ہے۔

پچاس پچپن سال پہلے ڈارون کی Origin of Species (اصل الانواع) ارتقا کی انجیل سمجھی جاتی تھی۔ آج کل یہ دنیا بھر کے اعتراضات کا نشانہ ہے اور اس کی وقعت کا حال سب کو معلوم ہے! گل ارتقا کی توجیہ تغیرات Variations کی بجائے تحولات Mutations سے ہونے لگی۔ اب مسٹر کیا سریر کے ساتھ ہم لامارک کے نظریہ کو پھر قبول کرنے لگے ہیں۔ ہمیں تفاوت راہ! نیوٹن نے حرکت کے لیے بعض قوانین بنائے، دنیائے سائنس نے ان کو قبول کیا۔ اب آئنسٹائن اس کی تردید کر رہا ہے۔ مے تیر، رم فورڈ، ڈے وی اور صدہا علمائے سائنس نے مادہ کی غیر فنا پذیری اور بقائے توانائی کو ثابت کیا اور ساڈی اور سدوو رتھرفورڈ، پنکارے جدید سائنس کے ان انتہائی عقائد میں شک پیدا کر رہے ہیں۔

پیرسن، ماخ وغیرہ ہم سے کہہ رہے ہیں کہ سائنس کا علم تخمینی احتمالات کا موجز بیان ہے، اور فطرت کے عدیم التغیر اور ابدی قوانین مادّے کے مشاہدہ کردہ عادات کے اوسط کے سوا کچھ نہیں! بھلا ہم ایسی سائنس کی شان میں کیا کہیں جو فلسفہ کی طرح غیر یقینی ہو گئی ہے اور فطرت کے علم کا کیا دعویٰ کریں جس کے قوانین اعداد و شمار کی سی وقعت رکھتے ہوں۔ کسی زمانے میں ریاضیات کو یقینی اور غیر خطا پذیر صداقتوں کا مجموعہ سمجھا جاتا تھا کہ ناگہاں ابعاد ثلاثہ صاحب اولاد ہو گئے، جز کل کے اتنا بڑا ہو گیا، اور اینسٹائن نے ثابت کر دیا کہ دو نقاط کے درمیان ایک خط مستقیم بڑے سے بڑا فاصلہ ہے۔ فرانسس گالٹن اور کارل پیرسن کی تحقیقات کی رو سے ماحول کا اثر توارث سے زیادہ تھا، مسٹر وگم نے اس کے برخلاف بڑی شان سے دنیا کو یہ ثابت کر دکھایا کہ توارث کا اثر ماحول کے اثر سے زیادہ ہے۔ اب ڈاکٹر واٹسن دو سو بچوں کا معائنہ کرنے کے بعد اطلاع دیتے ہیں کہ جنین اور بچہ کا ماحول اس کی سیرت و تاریخ کے تعین کا اہم جز ہے، اور توارث کا اثر نہایت خفی ہے اور آسانی سے نظر انداز کیا جا سکتا ہے! آئے دن ہر ایماندار تاریخ داں ثابت کر رہا ہے کہ تاریخ جھوٹ کا دریا ہے، ہر ایماندار Egyptologist (عالم مصریات) سنین و ملوک کی ایک نئی فہرست پیش کرتا ہے جو دوسری فہرستوں سے چند ہزار سال کا فرق رکھتی ہے!!

اسی خوش کن سرکس کو نظروں کی سامنے رکھ کر تورفشٹے نے کہا ہے کہ "دنیا میں کوئی شے اتنی سریع الزوال یا گریز پا نہیں جتنی کہ سائنٹفک تھیوری، اور نہ ہی کوئی شے اتنی فرسودہ، پھپھوند بھری، متعفن اور سڑی جتنی کہ پرانی سائنٹفک تھیوری۔ علمائے سائنس فلسفیوں پر یہ کہہ کر طعن کرتے ہیں کہ اس پیشہ کے لوگ ایک دوسرے کی تردید کرتے بیٹھتے ہیں لیکن درحقیقت یہ طعن علمائے سائنس پر بھی اتنی ہی صحیح ہے۔" اسی لیے ان دونوں پختہ کار و بالغ نظر علمائے سائنس اپنے بیان میں نہایت محتاط اور متواضع واقع ہوئے ہیں۔ ان کو علم ہے کہ سائنس بھی زیادہ سوالات اٹھاتے ہیں اور بہت کم کا جواب دیتے ہیں۔ سائنس واقعات کو جمع کرتے ہیں اور ان پر قوانین و نظریات کو مرتب کرتے ہیں، اور ان ہی اعلیٰ تعمیمات کے متعلق علمائے سائنس ایک دوسرے سے اختلاف کرتے ہیں۔ صورت حال وہی ہے جس کی توقع کی جانی چاہیئے، چونکہ انسان کو تمام واقعات کا علم نہیں، لہٰذا مسائل کے حل میں مختلف علما مختلف مفروضات و مقاصد کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ اختلاف آرا لازمی نتیجہ ہے۔ اسی معنی میں فخر رازی کے ان اشعار کو لیجیے

جن میں سے ایک شعر کا اوپر بیان ہوا۔

ہرگز دلِ من زعلم محروم نشد کم ماند اسرار کہ مفہوم نشد!

ہفتاد و دو سال فکر کردم شب و روز معلوم شد کہ ہیچ معلوم نشد!

سائنس و فلسفہ دونوں کی تاریخ انسان کے علم کے ناقص و ناکامل ہونے کو بتلا رہی ہے ہمیں کہنا پڑتا ہے کہ

من می نگرم ز مبتدی تا استاد عجز ست بدست ہر کہ از مادر زاد (خیام)

لیکن سائنس اور فلسفہ کے متخالف و متضاد مسالک ایک دوسری کی تکمیل کرتے ہیں اور تحقیق و تدقیق کو ایک قدم آگے بڑھاتے ہیں فلسفہ بھی سائنس کی طرح انسان کے علم کی کمیت و کیفیت میں اضافہ کر رہا ہے وہ انسان کی فہم کو جلا بخش رہا ہے، روشن کر رہا ہے اور دنیا کو بہتر طور پر سمجھنے میں مدد دے رہا ہے۔

فلسفہ کی ناکامیوں کو ماننے کے باوجود (جو سائنس کی ناکامیوں کی طرح قابل شرم ہیں) ہم کہتے ہیں کہ فلسفہ اپنے وجود کو حق بجانب ثابت کرتا ہے اور اپنے طالب علم کو دیدۂ بینا عطا کرتا ہے اگر وہ صرف یہ سکھلاتا ہے کہ عقلی طور پر کونسے سوالات کئے جا سکتے ہیں اور کونسے سوالات نہیں کئے جا سکتے بقول پروفیسر الگزنڈر کے "اگر فلسفہ استنطاق کے سوا کچھ نہیں تو کم از کم ہمارے سوالات کو متشکل کرتا ہے، ان کو ایک دوسرے سے متوافق بناتا ہے، بلفظِ واحد ہم کو عقلی سوالات پیدا کرنے کے قابل بناتا ہے۔ جاننا اچھی چیز ہے، لیکن یہ بھی جاننا کہ ہم جانتے کیوں نہیں ایک قسم کا فائدہ ہے۔" برٹرنڈرسل کے اس قول میں صداقت بھری ہے کہ "دراصل فلسفہ کا فائدہ زیادہ تر اس حیرت و عدم یقین ہی پر مشتمل ہے۔ جس شخص کی خمیر میں فلسفہ کی آمیزش نہیں اس کی زندگی ایسے زندان میں بسر ہوتی ہے جس کی کچھ تیلیاں تو فہم عام کے تعصبات نے گھڑی ہیں، کچھ اس کے زمانہ اور قوم کے اعتقادی تیقنات نے، اور کچھ ان اذعانات نے جو اس کے ذہن میں بغیر عقل و فہم کے اشتراک و رضامندی کے پیدا ہوئے ہیں۔ ایسے آدمی کے لیے دنیا محدود، متعین واضح ہو جاتی ہے، عام اشیا اس کے ذہن میں کوئی سوال پیدا نہیں کرتیں، اور غیر مانوس امکانات کو وہ حقارت کے ساتھ رد کر دیتا ہے۔" بقول براوننگ کے اس قسم کے لوگ ان حیوانات کے مانند ہوتے ہیں جن کی محدود مٹی میں مشک کی ستیز شعاعیں اپنی تابناکیاں نہیں دکھلاتیں! "فلسفہ مانوس اشیا کو غیر مانوسیت کے جامہ میں پیش کر کے ہمارے احساس تحیر کو

ہمیشہ زندہ رکھتا ہے۔" فلسفہ کی سب سے اہم خدمت یہ ہے کہ وہ ہمارے مفروضات وظنیات سابقہ سے ہمیں واقف کرتا ہے اور ان پر شک کرنا سکھلاتا ہے اسی معنی میں کانٹ نے کہا تھا There is no philosophy there is only Philosophisnig فلسفہ نہیں تفلسف اصل شے ہے۔" ہمیں علم کی خواہش ہے کامل ومکمل صداقت کے ہم جویا ہیں، لیکن سوچ و توسعی میں بھی اتنی ہی لذت ہے جتنی حصول میں! غالب کے دل سے اس لذت کو پوچھو جو اس کی "سعی لاحاصل" میں تھی! بوعلی سینا کی طرح ہم بھی کہیں گے:۔

دل گرچہ دریں بادیہ بسیار بشتافت — یک موئے نہ دانست ولے موئے شگافت

اندر دل من ہزار خورشید بتافت — وآخر بکمال ذرۂ راہ نیافت

فلسفہ گو کمال ذرہ تک پہنچ نہ سکا (اور سائنس کب ذرہ کی ماہیت سے واقف ہے) لیکن دل تو تفلسف و تفکر کی وجہ سے ہزار خورشید تاباں کی طرح چمک اٹھا۔

(۵) فلسفہ فرد کو کائنات میں اپنی جگہ پہچاننے میں مدد دیتا ہے۔

فرد کا فطرت میں کیا مقام ہے؟ میں کون ہوں ع

سرگشتہ بہ عالم ز پئے چیستے؟

انسان حیوانات سے وابستہ بھی ہے اور اپنی عقل وفکر کی وجہ سے ان سے ممیز بھی۔ کیا ہی تعجب کی بات ہے کہ وہ دوسرے حیوانات کی طرح قوانین جبر کے ماتحت بھی ہے اور صداقت، حسن وخیر کا جویا و طالب بھی، سوائے فلسفہ کے ان عمیق مسائل پر کوئی روشنی نہیں ڈالتا۔

طبیعی علوم دوربین اور خوردبین کی مدد سے مکان کے حدود کو پیچھے ہٹائے جارہے ہیں اور نئے عوالم کا انکشاف کر رہے ہیں۔ جب ہم اس امر پر غور کرتے ہیں کہ ہمارا یہ سیارۂ زمین جس پر ہماری بود و باش ہے اپنے آفتاب سمیت جو ایک قریب الموت ستارہ ہے کروڑوں ستاروں، آفتابوں اور سیاروں میں ایک ناچیز ذرۂ خاک ہے، تو انسان کے قد و قامت کے یہ چھ فیٹ کتنے حقیر معلوم ہوتے ہیں لیکن اس کے برخلاف جب ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ یہی مخلوق قوۃ فکر رکھتی ہے، احساس وتخیل کی قابلیت رکھتی ہے، اور ان کی مدد سے اجرام سماوی کی عظیم الشان ترتیب پر غور کرتی ہے اور زمین کے نباتی وحیوانی عجائب پر

سر وصنتی ہے تو پھر انسان کی عظمت و وقعت مبرہن ہو جاتی ہے۔ چنانچہ پیاسکل نے کہا تھا "انسان محض ایک تنے کی مانند ہے۔ فطرت کی کمزور ترین نے، لیکن وہ فکر کرنے والی، سوچ بچار کرنے والی نے ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ساری کائنات اس کو کچلنے کے لیے ہتھیار بند ہو جائے۔ ہوا کا ایک جھونکا، پانی کا ایک قطرہ اس کے مارنے کے لیے کافی ہے، لیکن اگر کائنات انسان کو کچل بھی ڈالے تب بھی انسان اپنے مارنے والے سے زیادہ شریف ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ وہ مر رہا ہے اور کائنات کو اس فائدہ کا کوئی علم نہیں جو اس کو انسان پر حاصل ہے۔" اس طرح کائنات میں اپنی حیثیت و منزلت سے واقف ہونا نفس کو قوی بناتا ہے! انسان کی زندگی کو گراں قدر و باوقعت قرار دیتا ہے۔ مشاہدہ و قوتِ فکری کی وجہ سے انسان (گو جزی طریقہ ہی سے سہی) یہ سمجھتا ہے کہ یہ عظیم الشان کائنات ایک نظام رکھتی ہے۔ قانون و ہم آہنگی کی اس پر حکومت ہے اور انسان اس کا ذی علم ناظر ہے۔

علاوہ ازیں فلسفۂ انسان کو اس پیچیدہ و مرکب نظام معاشرت میں اپنی جگہ کے پہچاننے میں مدد دیتا ہے، خود معاشرت کی ترکیب کئی متداخل اداروں سے ہوئی ہے جن میں ہم خاندان، حکومت، مذہبی محکموں اور صناعی اداروں کا ذکر سکتے ہیں۔ فرد کو موجودہ زمانے کی اس پیچیدہ معاشرت میں حصہ لینے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ نظام معاشرت کا من حیث الکل ایک صاف واضح اور اجاگر تصور ذہن میں رکھے اور متقابلہ معاشری اقدار سے واقف ہو۔ فلسفۂ معاشرت اس مسئلہ پر روشنی ڈالتا ہے، فرد کو ایک اچھے شہری بننے کے قابل بناتا ہے۔ علاوہ ازیں اگر ہم تحقیق ذات کو بلند ترین اخلاقی غایت قرار دیں جو دوسرے نفوس کے باہمی اشتراک کی وجہ سے ممکن ہوتی ہے تو صاف ظاہر ہے کہ اس غایت کے حصول کے لیے دنیا اور زندگی کا ایک جامع اور مستوعب علم ضروری قرار پاتا ہے۔ انسان کی بہترین مسرت اور اس کی ترقی و تکمیل ان اشیاء، واقعات و اعمال کے جاننے اور ان کی قدر کرنے پر منحصر ہوتی ہے، جن کے درمیان اس کی زندگی بسر ہو رہی ہے۔ اس کی ذات، فکر، احساس و عمل، اس کے وجود کی سارا قدر و اہمیت، اپنا سارا مواد یہیں سے حاصل کرتے ہیں۔ اس کی اخلاقی، مذہبی اور جمالیاتی فطرت کا مکمل تحقق خارجی دنیا ہی کی مخالطت و مصاحبت سے ممکن ہے۔ انسان جس قدر اپنی ذات سے واقف ہوتا جا رہا ہے،

اسی قدر زیادہ اس کو صاف طور پر معلوم ہو رہا ہے کہ اس کی ذات کا تحقق فطرت و معاشرت کے مساس و اتصال ہی سے ممکن ہے۔ انسان کی زندگی خلا میں نشو و نما نہیں پا سکتی فلسفہ نہ صرف تحقق ذات کے معنی کی توضیح و تعریف کرتا ہے بلکہ اس کے حصول کے طریقے بتلاتا ہے۔

فلسفہ اپنے طالب علم کا تعارف بنی نوع انسان کے عظیم الشان مفکرین و ذہنی قائدین سے کراتا ہے۔ ان تخلیقی ذہنوں کی صحبت سے زیادہ شخصیت انسانی کو غنی و کامل بنانے میں کوئی شئے موثر نہیں فلاطون نے کہا تھا کہ "دنیا میں چند ایسے ملہم وجود ہیں جن کی صحبت لاقیمت ہے"۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں ؎

خواہی کہ دریں زمانہ فردے گردی یا در رہ دیں صاحب دردے گردی

ایں را بجز از صحبتِ مرداں مطلب مردے گردی چو گرد مردے گردی

فلسفہ انسان کو اس مجلس میں پہنچاتا ہے جہاں سقراط و افلاطون، ارسطو و اپیکورس، فلاطینوس و سینٹ آگسٹائن، ٹامس اکوئیناس، ابن سینا و الغزالی، ابن رشد، ڈیکارٹ و اسپنوزا، بارکلے، ہیوم، کانٹ و ہیگل، اسپنسر و ولیم جیمس، شلّی و کیٹس اور گوئٹے، باخ اور واگنر خنداں پیشانی کے ساتھ ہمیں خوش آمدید کہنے کو تیار ہیں، اور ہم جب تک سننے راضی ہوں ہم سے گفتگو کرنے آمادہ ہیں۔ خدائے لایزال کے اس شہر میں جہاں یہ مجلس آراستہ ہے لامتناہی خزائن ہمارے سامنے بکھرے ہوئے ہیں۔ ہمیں صرف آگے بڑھ کر ان سے مالا مال ہوتا ہے۔

(۶) فلسفہ ہمیں جمالیاتی لذت بخشتا ہے:-

فلسفہ ایک نہایت اہم معنی میں اپنی غایت آپ ہے۔ لذتِ جمال کی طرح فلسفیانہ غور و فکر اپنی آپ منزل ہے۔ فلسفہ کی نظری قیمت کے لیے حجت و استدلال پیش کرنا ایسا ہی ہے جیسے یہ ثابت کرنا کہ انسان کو حصول صحت کی کوشش کرنی چاہیئے۔ دوستی و محبت قائم کرنی چاہیئے۔ سیرت اخلاقی کی تکمیل کرنی چاہیئے۔ شعر پڑھنا اور موسیقی سے لطف اندوز ہونا چاہیئے۔ جو لوگ ان تجربات و اقدار سے واقف نہ ہوں وہ حجت سے قائل نہیں ہو سکتے۔ ان کی اصلی قیمت شخصی و باطنی ہوتی ہے۔ ان کی قدر و قیمت کا احساس دوسروں میں پیدا کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ افلاطون کسی جگہ

خیر و صواب کے افادی پہلو پر روشنی ڈالتا ہے اور پھر کہتا ہے کہ جن لوگوں میں یہ صفات موجود ہیں اُن کی ہستی زیادہ حقیقی ہوتی ہے" ارسطو شہریت اور دنیوی معاملات میں حصے کر ذات کی تکمیل و تحقیق کو سراہتا ہے لیکن وہ ایک صحیح معنی میں تعلیم یافتہ شخص کی فکری زندگی کو حیات کی اعلیٰ ترین غایت قرار دیتا ہے۔ اسپنوزا کو "خدا کی عقلی محبت میں" اور صوفی کو صداقت، خیر و جمال کی وحدت کی بصیرت میں جو مسرت حاصل ہوتی ہے وہ کس طرح ظاہر کی جا سکتی ہے؟ برٹرنڈ رسل جب دنیائے معاشرت کے اختلال و اضطراب، شر و فساد سے ہٹ کر ریاضیات و منطق کے دایمی حقایق کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو اس کو جو سکون، راحت و طمانیت حاصل ہوتی ہے وہ صوفی کے غایت وسرور و فراخط سے زیادہ مختلف نہیں۔

غرض فلسفہ کے شیدا کو فلسفیانہ غور و فکر کی زندگی میں وہی لذت ملتی ہے جو عاشق کو حسن و محبت میں، اور حسن و عشق کی طرح فلسفہ کے متعلق بھی حلی حزیں کی زبان میں ہم کہیں گے ؎

هر چند که حسن و عشق مستور به است | آیاتِ نیاز و ناز مشهور به است
هر سینه که داغِ نیست خشتِ لحد است | زاں لب که نه نالید لبِ گور به است

ڈاکٹر میر ولی الدین منشی فاضل ام۔ اے عثمانیہ پی ایچ ڈی لندن بیرسٹر ایٹ لا

اب ایک شعر کے سانچے میں ڈھل رہا ہوں میں

سُلجھ رہے ہیں خیالاتِ زندگی میرے
اُبھر رہے ہیں کمالاتِ زندگی میرے
ترقیوں پہ ہیں حالاتِ زندگی میرے
اب ایک درد کی دنیا میں پل رہا ہوں میں
اب ایک شعر کے سانچے میں ڈھل رہا ہوں میں

پھر آج عیش و مسرت سمجھ میں آتی ہے
پھر آج دہر کی قسمت سمجھ میں آتی ہے
پھر آج قلب کی عظمت سمجھ میں آتی ہے
حریمِ قدس سے گر کر سنبھل رہا ہوں میں
اب ایک شعر کے سانچے میں ڈھل رہا ہوں میں

مری نگاہ سے اب اُٹھ رہے ہیں پردۂ راز
مرے خیال میں آتی ہے طاقتِ پرواز
مری حیات میں پیدا ہوا ہے سوز و گداز
پھر آج شمع کی صورت پگھل رہا ہوں میں
اب ایک شعر کے سانچے میں ڈھل رہا ہوں میں

مری نگاہ میں جلوے سمائے جاتے ہیں
وہ میری روح میں کچھ گنگنائے جاتے ہیں
حریمِ ناز کے پردے اُٹھائے جاتے ہیں
فلک کی روشنیوں میں نکل رہا ہوں میں
اب ایک شعر کے سانچے میں ڈھل رہا ہوں میں

میں طورِ وادیٔ ایمن پہ رقص کرتا ہوں
میں کائنات کے گلشن پہ رقص کرتا ہوں
میں حسن و عشق کے دامن پہ رقص کرتا ہوں
پھر آج صورتِ پروانہ جل رہا ہوں میں
اب ایک شعر کے سانچے میں ڈھل رہا ہوں میں

محمد عبد القیوم خاں باقی ام اے (عثمانیہ)

عہد ابراہیم عادل شاہ ثانی کی متوین ریاست

باب اول

ابراہیم ثانی کی تخت نشینی کے وقت ملک کی عام سیاسی حالت

تمہید بانیٔ سلطنت یوسف عادل شاہ کے بعد سے ابراہیم ثانی تک چار بادشاہ تخت نشین ہوئے اسمٰعیل عادل شاہ نے تقریباً پچیس سال بہایت کامیاب حکومت کی اس کی وفات پر اس کا بڑا بیٹا ملّو عادل شاہ تخت نشین ہوا مگر سخت نا اہل ہونے کی وجہ سے چھ مہینے کے اندر ہی معزول کر دیا گیا اور اس کی جگہ اس کا چھوٹا بھائی ابراہیم اول سریر آرائے سلطنت ہوا۔ اس کے زمانۂ حکومت میں ایک طرف شولاپور اور کلیانی کے بہایت اہم قلعے ہاتھ سے نکل گئے جن پر نظام شاہیوں کا تصرف ہو گیا اور دوسری طرف رائچور اور مدگل کے مابہ النزاع علاقوں پر وجیانگر کا قبضہ ہو گیا اس طریقے سے جب علی عادل شاہ تخت نشین ہوا ہے بیجاپور کے بہایت اہم اور سرحدی قلعے جن کے واسطے پچھلے بادشاہوں کے زمانہ میں کافی خوں ریزیاں ہو چکی تھیں دشمنوں کے قبضے میں چلے گئے تھے۔ علی عادل شاہ کے بعد ابراہیم ثانی تخت نشین ہوا مگر اس کی تخت نشینی کے وقت ملک کی عام سیاسی حالت کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ عادل شاہ کے زمانۂ حکومت پر ذرا تفصیل سے ایک نظر ڈال لی جائے۔

علی عادل شاہ اول ۹۶۵ھ مطابق ۱۵۵۸ء میں جب ابراہیم کا انتقال ہوا تو اس کا بیٹا علی عادل شاہ اول کے لقب سے اس کا جانشین ہوا۔ اس کا زمانۂ حکومت بیجاپور کی تاریخ میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس کے دور میں بیجاپوری سلطنت کو غیر معمولی ترقی حاصل ہوئی۔ نہ صرف یہ کہ اس کے مقبوضات میں اضافہ ہوا اور حدود سلطنت میں توسیع عمل میں آئی بلکہ دولت کی فراوانی کی وجہ سے اگر ایک طرف معاشی خوش حالی ملک میں پیدا ہو چلی تھی تو دوسری طرف تمدن اور معاشرت کی ترقی، علوم و فنون کی ہر دل عزیزی اور ان کا پھیلاؤ اس چیز کو ظاہر کر رہا ہے کہ ملک بحیثیت مجموعی شاہراہ ترقی پر گامزن ہے۔ علی عادل شاہ اپنے تدبر و فراست و

معاملہ فہمی اور سیاسی دور اندیشی کی بدولت ہمیشہ اپنے دشمنوں پر غالب رہتا ہے اور یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے انتقال سے پہلے اپنے رقیبوں اور دشمنوں کو زیر کرنے میں کامیاب ہوا جو ہمیشہ بیجاپور کی بربادی کے درپے رہتے تھے اور اس کے جیتے جی کسی کی ہمت نہ بڑھتی تھی کہ اس کے مقبوضات پر دست تصرف دراز کریں۔

علی تخت نشیں ہوتے ہی ریاست کے کھوئے ہوئے مقبوضات حاصل کرنے کی طرف متوجہ ہوا۔ مدگل و رائچور وجیانگر کے راجہ کے قبضے میں تھے اور وجیانگر کی طاقت اس وقت انتہائی عروج پر تھی ایسی صورت میں اس مقتدر اور باحیثیت ریاست سے مقابلہ کرنا خود اپنی بربادی کا بیڑا اٹھانا تھا اور برخلاف اس کے اگر وجیانگر کو دوست بنا لیا جائے اور وہاں کے راجہ سے خوشگوار تعلقات پیدا کر لیئے جائیں تو کم از کم بیجاپوری ریاست کے دوسرے دشمنوں کو نیچا دکھانے کا اچھا موقع مل سکتا تھا۔ اسی غرض سے علی عادل شاہ نے شروع ہی سے اس امر کی کوشش کی کہ رام راج والئ وجیانگر کو اپنا دوست بنائے چنانچہ بوتراب شیرازی اور کشور خاں کو ریاست بیجاپور کے سفیر ہونے کی حیثیت سے دربار وجیانگر میں روانہ کیا گیا یہاں ان سفیروں کی بڑی آو بھگت ہوئی اور انکو خوش کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا خود رام راج نے ان سفیروں کی روانگی کے وقت اپنے مقربین سے ایک شخص کو اس غرض سے بیجاپور روانہ کیا کہ دربار وجیانگر کی طرف سے علی عادل شاہ کی تخت نشینی پر مبارکباد دے۔ اس اثناء میں رام راج کے ایک لڑکے کا انتقال ہوگیا جس کو وہ بہت عزیز رکھتا تھا۔ علی عادل شاہ اس نئے اتحاد کی بنیادوں کو زیادہ مضبوط اور مستحکم کرنے کے لیئے بنفس نفیس عازم وجیانگر ہوا کہ رسم تعزیت ادا کرے اور رام راج سے اپنی دلی ہمدردی کا اظہار کرے۔ صرف ایک سو ہمراہیوں کے ساتھ، اتنا فاصلہ طے کر کے محض رسم تعزیت ادا کرنے کے لئے علی عادل شاہ کا اس طرح بید ھڑک ایک غیر ریاست میں چلا آنا جو ہمیشہ مسلمانوں کی دشمن اور خون کی پیاسی رہی ھندو راج کو متاثر کئے بغیر نہ رہا۔ شاہ بیجاپور کا اعلیٰ پیمانہ پر استقبال کیا گیا اور اس کی آمد کی خوشی میں نہایت شاندار ضیافتیں کی گئیں۔ رام راج کی بیوی نے بھی علی عادل شاہ سے پردہ نہیں کیا بلکہ اس کو اپنا متبنیٰ کر لیا۔ غرض وجیانگر کی طرف سے تاجدار بیجاپور کی خوب خاطر و مدارات کی گئی اور ان دونوں والیان ریاست کے درمیان نہایت ہی گہرا اتحاد قائم ہوگیا لیکن علی عادل شاہ کی روانگی کے

وقت رام راج سے ایک ایسی حرکت ہوئی جس کو وہ کبھی فراموش نہیں کر سکا اور دل میں تہیہ کر لیا کہ وجیانگر کے راجہ سے اس کی بد دماغی کا کسی نہ کسی وقت ضرور بدلہ لیا جائے گا۔ فی الحال علی عادل شاہ خون کے گھونٹ پیکر خاموش رہ گیا مگر موقع کی تلاش میں تھا کہ رام راج کی اس حرکت کا خوب اچھی طرح بدلہ لے۔

رام راج کی جو حرکت علی عادل شاہ کو ناگوار گذری وہ یہ تھی کہ جب علی عادل شاہ نے بیجاپور کے ارادے سے وجیانگر کو خیرباد کہا تو رام راج نے علی عادل شاہ کو پہنچانے کے لئے خود تو کوئی زحمت گوارا نہیں کی البتہ اپنے عہدہ داران ریاست کو اس کام پر مامور کر دیا کہ وہ علی عادل شاہ کو سرحد تک چھوڑ آئیں۔ رام راج کی اس حرکت سے اس کی لاپروائی بے اعتنائی غرور و نخوت اور اسلامی بادشاہوں کی کم وقعتی ظاہر ہوتی ہے۔ علی عادل شاہ نے اس کو محسوس کیا مگر وقت کے وقت خاموشی کو مناسب جانکر اپنی ناخوشی کو ظاہر ہونے نہ دیا۔

بیجاپور واپس آتے ہی علی عادل شاہ نے اپنے پرانے منصوبے کی تکمیل کی طرف توجہ کی کلیانی اور شولاپور کا ہاتھ سے نکل جانا اُسے ہمیشہ خار کی طرح کھٹکتا تھا اور اُس نے دراصل رام راج سے اتنی ساری دوستی اور اتحاد محض اس وجہ سے پیدا کیا تھا کہ اگر ضرورت ہو تو وجیانگر کی فوجوں کی مدد سے ان کھوئے ہوئے علاقوں کو حاصل کیا جائے۔ چنانچہ شاہ حسین انجو کو حسین نظام شاہ کے پاس روانہ کیا گیا کہ وہ کلیانی اور شولاپور کی واپسی کے متعلق گفت و شنید کرے مگر حسین نظام شاہ کب ان باتوں کو سننے والا تھا۔ اُس نے ان دونوں علاقوں[1] کی واپسی سے قطعاً انکار کر دیا۔ ایک اور سفیر[2] دربار بیجاپور سے بغرض مصالحت روانہ کیا گیا مگر نظام شاہ نے ان میں سے کسی کی نہ سُنی اور اپنی ہٹ پر قائم رہا۔ آخرکار جنگ تک نوبت پہنچی۔ وجیانگر کی فوجیں بھی مدد کے لئے بیجاپوری افواج سے آملیں۔ ان متحدہ فوجوں کا جب احمدنگری علاقوں پر حملہ ہوا تو حسین نظام شاہ نے مقاومت کی تاب نہ دیکھی اور مجبوراً اس شرط پر راضی ہو گیا کہ کلیانی کا قلعہ بیجاپور کے حوالے کر دیا جائے۔

---

[1] علی عادل شاہ نے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ اگر دونوں قلعے واپس نہیں کئے جاسکتے ہیں تو کم از کم کلیانی کا قلعہ ہی واپس کر دیا جائے۔ (فرشتہ)۔

[2] اس سفیر کا نام سید علی تھا۔

چنانچہ اس پر عمل ہوا اور مصالحت ہوگئی مگر جیسے ہی غنیم کی فوج واپس ہوئی حسین نظام شاہ ابراہیم قطب شاہ سے مدد کا خواستگار ہوا اور اُس اتحاد کو مستحکم کرنے کے لئے اپنی لڑکی بی بی جانی کو والی گولکنڈہ سے بیاہ دیا۔ اب گولکنڈہ اور احمد نگر کی فوجوں نے پھر کلیانی کا محاصرہ کر لیا جب علی عادل شاہ کو اس کی خبر لگی تو اُس نے رام راج کو اپنی مدد پر دوبارہ طلب کیا۔ رام راج تو ایسے موقعوں کو غنیمت ہی سمجھتا تھا۔ فوراً آ موجود ہوا۔ ابراہیم قطب شاہ بجائے اس کے کہ ایسے وقت اپنے حلیف اور خسر کی مدد کرتا۔ اُلٹے رام راج اور علی عادل شاہ سے جا ملا جیسے ہی یہ خبر نظام شاہ کو ملی تو وہ فوراً احمد نگر کی طرف چل دیا اور جنیر کے قلعے میں محصور ہو گیا۔ علی عادل شاہ نے مع اپنے حلیفوں کے، خود بھی احمد نگر کا رُخ کیا اس کا محاصرہ کر لیا گیا۔ مگر چونکہ ابراہیم قطب شاہ خفیہ طور پر محصورین کی مدد کر رہا تھا قلعہ فتح نہ ہو سکا۔ اور علی عادل شاہ نے یہ خیال کر کے کہ محصورین کو پوشیدہ طور پر مدد پہنچ رہی ہے محاصرہ کا اُٹھا لینا ہی مناسب سمجھا اور شولاپور کے محاصرہ پر رام راج کو آمادہ کیا مگر کشور خاں کی رائے سے بجائے شولاپور، نلدرگ کے محاصرہ کی رائے ٹھیری۔ کیونکہ کشور خاں نے خفیہ طور پر علی عادل شاہ کو سمجھایا کہ شولاپور کا قلعہ نہایت ہی اہم اور سرحدی قلعہ ہے اگر اس وقت رام راج کی مدد سے اُسے فتح کیا جائے گا تو لامحالہ رام راج جو پہلے ہی سے بہت بد دماغ اور مغرور ہو چلا ہے اُسے اپنے قبضے میں لانا چاہیگا۔ اس لئے مصلحت یہ ہے کہ اس وقت شولاپور کی طرف توجہ ہی نہ کی جائے اور اس کی بجائے نلدرگ کا محاصرہ کر لیا جائے۔ علی عادل شاہ کو کشور خاں کی یہ صائب رائے بہت پسند آئی چنانچہ اسی بناء پر اُس نے رام راج کو قلعۂ مذکور کی طرف متوجہ ہونے پر راضی کر لیا۔ اس قلعہ کو جو ایک ہندو راجہ کا بنوایا ہوا تھا مسمار کر دیا گیا اور از سر نو اُسی مقام پر ایک نیا قلعہ تیار کیا گیا جس کا نام شاہ درگ[^۱] رکھا گیا اور یہ قلعہ بعد میں چلکر ایک نہایت ہی مضبوط اور اہم سرحدی قلعہ ہو گیا۔ ان انتظامات سے فارغ ہو کر ہر سہ بادشاہ اپنے اپنے

[^۱]: لہ۔ "باستظہار رام راج در محلیکہ قلعۂ قدیم موسوم بہ نلدرگ بنائے نمودہ یکی از راجہ ہائے پیشیں بود منہدم گردید و از سر نو بہ سنگ و گچ بنائے تازہ و باستحکام تمام باتمام رسانیدہ موسوم بہ شاہ درگ ساخت" بساتین صفحہ ۸۸ فرشتہ سے بھی اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے مقالہ سوم روضہ دوم صفحہ ۳۷۔

ملک کی طرف واپس گئے۔

وجیانگر کی بربادی

علی عادل شاہ کو، اگرچہ رام راج کی اعانت سے نظام شاہی علاقوں کو خوب تباہ کرنے اور ایک خاندانی دشمن کو نیچا دکھانے کا موقع ملا مگر بحیثیت مجموعی وہ اپنی ان کامیابیوں سے خوش نہیں ہوا، اس کی ایک خاص وجہ تھی۔ علی عادل شاہ یہ محسوس کر رہا تھا کہ رام راج کی قوت ضرورت سے زیادہ بڑھ گئی ہے اور وہ سلاطین دکن کو خاطر میں تک نہیں لاتا ہے اور پھر حسین نظام شاہ کے خلاف اس نے علی عادل شاہ کو مدد کیا دی ہے گویا اپنے نزدیک اسے بن داموں خرید لیا ہے۔ گذشتہ جنگ میں اس نے حلیفوں کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا کہ نہ صرف علی عادل شاہ بلکہ ابراہیم قطب شاہ بھی اس سے سخت ناراض ہو گیا تھا۔ احمد نگر کے حملے کے سلسلہ میں وجیانگر کی ہندو فوج نے مسلمانوں کے ساتھ نہایت برا سلوک کیا۔ ان کے مذہبی احساسات کو ٹھیس لگائی اور اسلامی تبرکات کی ایسی بے حرمتی کی کہ تمام اسلامی بادشاہوں نے اس کو بری طرح محسوس کیا اور یہ خوب سمجھنے لگے تھے کہ اگر آج احمد نگر کی باری ہے تو کل ہماری۔ غرض وجیانگر کی فوج کا یہ طرز عمل رام راج کا یہ غرور اور سلاطین کے ساتھ اس کا یہ ذلیل برتاؤ گویا خود اس کی بربادی کا پیش خیمہ تھا۔ اس کی بد دماغی یہاں تک بڑھ گئی تھی کہ ان بادشاہوں کے سفیر جب کبھی اس کے دربار میں حاضر ہوتے تو ان کو بیٹھنے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ ان کی ہر طرح تحقیر کی جاتی۔ یہ تمام چیزیں ایسی نہ تھیں جن سے کہ چشم پوشی کی جا سکتی۔ ان وجوہات کی بناء پر سلاطین دکن پہلے ہی سے جلے بیٹھے تھے اس پر طرہ یہ ہوا کہ رام راج نے نلدرگ سے واپسی کے وقت اپنے بھائی وینکٹادری کو تھوڑی سی فوج دیکر قطب شاہ اور عادل شاہ کے سرحدی علاقوں پر بھیجدیا کہ ان کی تسخیر عمل میں لائی جائے۔ ان دونوں بادشاہوں نے اس نئی بلا کو ٹالنے کے لئے مجبوراً چند علاقے رام راج کے حوالے[1] کر دیئے۔ اس طرح علی عادل شاہ کو اس جنگ سے

---

[1] علی عادل شاہ نے اتگیر اور باگر کوٹ کے علاقے رام راج کو دیئے اور قطب شاہ کیو ملی کنڈہ کنور اور پانگل سے دست بردار ہو گیا

جس میں کہ رام راج کی مدد حاصل کی گئی تھی فائدے کی بجائے اُلٹا نقصان ہو گیا۔ شولاپور جس کے لئے یہ جنگ ہوئی تھی وہ تو ہاتھ نہ آسکا یا اس کی طرف فی الحال توجہ کرنا مناسب نہ سمجھا گیا۔ نظام شاہ کو شکستیں تو بیشک ہوئیں مگر بیجاپور کو اُن سے کچھ بھی فائدہ نہوا اور اگر کچھ ہوا تو یہی کہ اُلٹے دو علاقے ہاتھ سے نکل گئے غرض ان تمام واقعات نے علی عادل شاہ کو بھڑکایا اور وہ اس قدر غضب آلود ہوا کہ اُس نے دل میں ٹھان لی کہ اب رام راج سے اس کا بدلہ لینا چاہیئے مگر جب اُس نے اپنی حالت پر نظر کی تو دیکھا کہ تن تنہا اس کا مقابلہ کرنا تو ممکن ہی نہیں اور پھر مشیرانِ سلطنت[۱] نے یہ رائے دی کہ یکہ وتنہا رام راج سے مقابلے کا خیال کرنا دانشمندی سے بعید ہے کیونکہ اُس کی طاقت میں غیر معمولی اضافہ ہو چکا ہے اس کی ریاست نہایت وسیع اور خوش حال ہے اس کی آمدنی کے ذرائع اَن گنت ہیں اس کے ہاں ایک نہایت زبردست جرّار اور آزمودہ کار فوج ہر وقت تیار رہتی ہے غرض ہر حیثیت سے وہ ایک مقتدر راجہ ہے اگر اس کو شکست دینی منظور ہے تو سوائے اس کے چارہ نہیں کہ دوسرے سلاطین دکن سے رابطۂ اتحاد پیدا کیا جائے اور اُن کو اپنا ہم خیال کر کے رام راج کی سرکوبی کیطرف توجہ کی جائے۔

اس بناء پر ایک ایلچی کو قطب شاہ والئ گولکنڈہ کے پاس روانہ کیا گیا کہ وہ اس اتحاد کی بابت گفت وشنید کرے اور اس کا عندیہ لے جب قطب شاہ، عادل شاہ کے اس ارادے سے واقف ہوا تو بصد خوشی اُس کا ساتھ دینے کے لئے تیار ہو گیا اور یہ بھی وعدہ کیا کہ حسین نظام شاہ اور عادل شاہ کے درمیان اس انداز سے صلح کرا دی جائے گی کہ پچھلی ساری رنجشیں دور ہو جائیں چنانچہ اُس نے اپنے دربار سے ایک نہایت ہی ہوشیار اور تجربہ کار شخص کو سفیر بنا کر پہلے بیجاپور روانہ کیا کہ علی عادل شاہ کو اس کے ارادوں سے واقف کر دے اور پھر نظام شاہی دربار کو روانہ ہونے کا حکم دیا۔ یہ سفیر مصطفےٰ خاں اردستانی تھا جو ہر حیثیت سے اُس زمانے کے بہت ہی قابل، دانشمند اور باتدبیر اشخاص میں شمار

---

[۱] بالخصوص کشور خاں لاری اور ابو تراب شیرازی اس معاملہ میں پیش پیش تھے۔ بیجاپوری دربار میں تدبر کے اعتبار سے یہ لوگ بہت نامور تھے اکثر اہم معاملات میں ان سے رائے لیجاتی تھی اور بہت سارے اہم کام انھیں کے سپرد کئے جاتے تھے۔

ہونے کے قابل ہے (اس کا تفصیلی ذکر کسی اور جگہ آئیگا) مصطفےٰ خاں اپنے بادشاہ کے حکم کے مطابق پہلے بیجاپور آیا اور علی عادل شاہ سے استصواب رائے کرکے حسین نظام شاہ والئ احمد نگر کے پاس پہنچا اور مجوزہ اتحاد کے متعلق گفت و شنید کرنے لگا۔ حسین نظام شاہ تو رام راج کے خون کا پیاسا تھا کیونکہ اُس کی بدولت اس کو اتنے نقصانات اٹھانے پڑے تھے شکستیں کھائی تھیں اور ذلیل و خوار ہونا پڑا تھا جب اس کو یہ معلوم ہوا کہ عادل شاہ اور قطب شاہ، رام راج کی بربادی کے درپے ہیں تو بخوشی ان کا ساتھ دینے کے لئے تیار ہوگیا بالآخر قطب شاہی سفیر کی کوششوں سے یہ طے پایا کہ حسین نظام شاہ اپنی بیٹی چاند بی بی کو علی عادل شاہ سے بیاہ دے اور شولاپور کا قلعہ جس کے متعلق اتنی لڑائیاں ہو چکی تھیں لڑکی کے جہیز میں دیدیا جائے اور اس طرح دونوں بادشاہوں کے درمیان جو فتنہ و فساد کی جڑ ہے اس کا خاتمہ کر دیا جائے اور ساتھ ہی یہ طے پایا کہ حسین نظام شاہ کے بیٹے مرتضیٰ کی شادی علی عادل شاہ کی بہن ہدیہ سلطانہ سے ہو جائے ان نئے رشتوں کے جڑنے کا مقصد یہ تھا کہ پُرانی رنجشیں اور عداوتیں دور ہوں اور از سر نو ایک نہایت ہی مضبوط اور مستحکم اتحاد قائم ہو جائے۔ غرض ان مقاصد کی تکمیل کے لئے حسب قرار داد یہ شادیاں ہو گئیں اور علی عادل شاہ کو نہ صرف قلعۂ شولاپور مل گیا جس کے لئے وہ اس قدر بے قرار تھا بلکہ چاند بی بی کی ذات میں وہ دُرِ نایاب بھی ہاتھ آیا کہ بیجاپور کی قسمت جاگ اُٹھی جب ان دونوں سلاطین کو شادیوں کی مہمانیوں اور میزبانیوں سے فرصت ملی تو وہ معاملاتِ رزم کی طرف متوجہ ہوئے اس عرصے میں علی برید والئ بیدر سے نامہ و پیام[1] ہو چکا تھا اس نے بھی رام راج کی سرکوبی کے لئے ان سلاطین کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا چنانچہ ان چار بادشاہوں کی فوجیں عازم وجیانگر ہوئیں۔ جنگ کے اعلان سے قبل علی عادل شاہ نے حجت کے طور پر رام راج کو کہلا بھیجا کہ مدگل، اور رائچور، ناگری کوب کے علاقے جو بیجاپور کی سلطنت ابد مدت سے تعلق رکھتے ہیں اور جن پر والئ وجیانگر نے ناجائز دست تصرف دراز کر رکھا ہے فوراً واپس کر دیئے جائیں مگر یہ تو ظاہر ہی تھا کہ رام راج اُن کی واپسی سے قطعاً انکار کر دیگا چنانچہ اس نے نہ صرف انکار کیا بلکہ پیغام رساں ایلچیوں کو نہایت حقارت اور ذلت کے ساتھ اپنے دربار سے نکلوا دیا۔ یہاں سلاطین دکن تیار ہی بیٹھے تھے فوجوں کو فوراً کوچ کا حکم ہوا جب رام راج کو اسلامی فوجوں کی آمد کی خبر

[1] فرشتہ۔

لگی تو وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ اسے یقین کامل تھا کہ اس کی زبردست فوج ان بادشاہوں کو شکست فاش دیگی الیکن بہرحال لڑنا تو ضروری تھا اُس نے اپنی سپاہ کو آراستہ کرکے غنیم کی طرف توجہ کی سب سے پہلے اُس نے اپنے چھوٹے بھائی تیم راج کو بیس ہزار سوار، ایک لاکھ پیدل اور پانچسو ہاتھی سمیت دریائے کرشنا کی طرف روانہ کیا کہ دریا پر قبضہ کرکے دشمنوں کے عبور کا راستہ مسدود کردیا جائے اور اس کے بعد اُسکا منجھلا بھائی ایک کثیر فوج کے ساتھ آموجود ہوا اور سب کے آخر میں خود رام راج اپنی بقیہ ساری فوج لیکر (جس کے جھنڈے کے نیچے کئی راجہ اور راجکمار تھے) نہایت تزک و احتشام کے ساتھ غنیم کی طرف متوجہ ہوا۔

یہ مشہور اور فیصلہ کن جنگ تالی کوٹ کی جنگ کے نام سے مشہور ہے تالیکوٹ دراصل ایک چھوٹا سا موضع ہے جو اُس وقت حدود عادل شاہیہ میں واقع تھا چونکہ سلاطین دکن نے اُسے اپنا مستقر بنایا تھا اور کچھ عرصے تک انھوں نے یہاں قیام بھی کیا تھا اس لئے یہ جنگ اسی مقام کے نام سے مشہور ہوئی۔ دراصل جنگ، تالیکوٹ سے بیس میل کے فاصلے پر دریائے کرشنا کے جنوبی کنارے پر ہوئی۔ غرض کہ جب دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں تو کرشنا اُن کے درمیان حائل تھی تیم راج نے نہایت سرعت اور تیزی کے ساتھ پہنچکر، رام راج کے حکم کے مطابق دریا کے تمام راستوں پر قبضہ کر رکھا تھا کہ دشمن عبور نہ کرنے پائیں۔ جب سلاطین دکن نے دیکھا کہ اس طرح اُن کا راستہ روکدیا گیا ہے تو انھوں نے ایک چال چلی۔ بظاہر انھوں نے اس مقام سے کوچ دیا جہاں پر کہ اُن کا پڑاؤ تھا اور دریا کے کنارے کنارے آگے بڑھنے لگے۔ ! ور برابر تین روز تک بڑھتے رہے اس سے تیم راج اس دھوکے میں آگیا کہ وہ کسی دوسرے مقام سے دریا عبور کیا چاہتے۔ لہذا اس نے بھی اس کا ساتھ دیا اور اس مقام کو چھوڑ چلا جس پر کہ وہ قابض تھا۔ تین دن کے بعد جب یکایک اسلامی فوجیں رات کے اندھیرے میں پھر اسی مقام کی طرف پلٹ پڑیں جہاں سے کہ انھوں نے کوچ کیا تھا تو وجیانگر یونکو اسکی ذرا خبر نہوئی اور جب خبر ہوئی تو اسلامی فوج بہت آگے نکل گئی تھی اور اُن سے پہلے پہنچکر دریا کے اس راستے پر قبضہ کرلیا جہاں پر تین دن پہلے رام راج کی فوجوں نے اُن کا راستہ روک رکھا تھا اس طریقے سے اسلامی فوجوں کو بآسانی دریا کے عبور کرنے کا

موقع مل گیا۔ ہندو مسلمانوں کی اس چالاکی سے حیران ہو گئے مگر موقع کھو چکے تھے اور مسلمان نہایت عمدہ مقام پر قبضہ کر چکے تھے۔ رام راج کو جب اس کی خبر ہوئی تو وہ بھی اپنی فوج پر بہت بگڑا لیکن کیا کر سکتا تھا جب اس کی بقیہ فوج جو پیچھے رہ گئی تھی اس سے آملی تو جنگ کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔

متحدین کی فوج کی ترتیب اس طرح ہوئی کہ قلب میں حسین نظام شاہ میمنہ پر عادل شاہ اور میسرہ پر قطب شاہ اور علی برید اسی طرح رام راج خود قلب میں رہا اور میمنہ و میسرہ پر اپنے دونوں بھائیوں وینکٹادری اور تیتم راج کو مقرر کیا۔ رام راج کی لاپروائی اور رعونت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جب جنگ شروع ہوئی تو اس نے سنگھاسن میں بیٹھکر میدان میں جانیکا ارادہ کیا اور گھوڑے پر سوار ہونے سے قطعاً انکار کیا۔ حالانکہ مقربین اور دیگر سرداران فوج نے ہر چند عرض کی کہ جنگ میں یہ سواری خطرناک ثابت ہوئی ہے مناسب یہ ہے کہ حضور گھوڑے پر سوار ہوں مگر رام راج نے اسکی مطلق پرواہ نہ کی جب انھوں نے زیادہ اصرار کیا تو اس نے نہایت حقارت کے ساتھ کہا کہ یہ جنگ نہیں بازی طفلاں ہے اس لئے زیادہ احتیاط کی چنداں ضرورت نہیں ابھی وجیانگر کے سورما اپنا رنگ جمائیں گے اور متحدین کی فوجوں کو بھاگتے ہی بنیگی۔ بھلا وجیانگری سیلاب کے آگے یہ مور و ملخ کس شمار و قطار میں ہیں۔ غرض وہ اپنے نزدیک سمجھے ہوئے تھا کہ چند لمحوں میں جنگ کا فیصلہ ہو جائے گا اور وجیانگر کو فتح و نصرت کے جھنڈے بلند کرنیکا موقع ملیگا لیکن اس روز کی جنگ کا حشر کچھ اور ہی ہونے والا تھا۔

جب دونوں فوجیں اچھی طرح گتھ گئیں اور لڑائی گھمسان کی ہونے لگی تو متحدین نے اپنی شہزوری اور دلاوری کے ایسے ایسے ثبوت دیئے کہ رام راج کے دانت کھٹے ہو گئے۔ رام راج نے خلاف توقع جنگ کا جو یہ حال دیکھا تو سنگھاسن سے اتر کر ایک مرصع اور زرنگار تخت پر جلوہ افروز ہوا اور اپنی فوج کے سورماؤں اور سپاہیوں کے دل بڑھانے کے لئے بے دریغ روپیہ نچھاور کرنے لگا نقد و جواہرات قیمتی زیورات اور دیگر بیش بہا اشیا اپنی فوج میں تقسیم کیں۔ راجہ کی اس فیاضی سے وجیانگر کی فوج میں جانثاری کی ایک لہر دوڑ گئی اور وہ جان توڑ کوششیں کرنے لگے کہ متحدین کو مغلوب و پسپا کر دیں اور

حقیقت یہ ہے کہ رام راج کی طرف سے اس وقت پُرزور حملے ہو رہے تھے اور قریب تھا کہ متحدین کے
پیر اکھڑ جائیں۔ قطب شاہ اور عادل شاہ کو فتح کی طرف سے مایوسی ہوگئی تھی مگر حسین نظام شاہ نہ صرف
ثابت قدمی سے خود لڑتا رہا بلکہ اپنے حلیفوں کی بھی بڑی ہمت افزائی کی اس کی یہ دلیری اور ثابت قدمی
اپنا کام کر گئی۔ قطب شاہ اور عادل شاہ جو فتح سے مایوس ہو رہے تھے از سر نو اپنی قوت کو مجتمع کر کے
اس پر تُل گئے کہ جان جائے یا رہے مگر میدان کو ہاتھ سے جانے نہ دینگے۔ اسطرح میدان کارزار پھر ایکبار گرم ہوگیا

اسی اثنا میں ایک ایسا واقعہ ظہور پذیر ہوا کہ جس نے جنگ کا پانسہ ہی پلٹ دیا حسین نظام شاہ
کی فوج کا ایک مست ہاتھی جنگ کی ہماہمی سے پریشان ہوکر رام راج کی فوج میں گھُس پڑا۔ رام راج جنگ کی
حالت دیگرگوں دیکھ کر اپنے زر نگار تخت سے اتر کر پھر سنگھاسن میں سوار ہوا ہی چاہتا تھا کہ یہ مست ہاتھی
معہ فیلبان اُس طرف جا نکلا۔ وجیانگری فوج پہلے ہی سے پریشان ہو چکی تھی اور سراسیمگی کا یہ عالم تھا کہ کسی کو
اپنے پرائے کی خبر نہ تھی، کہ اس ہاتھی کی بدمستیوں نے انھیں اور بھی زیادہ پریشان کر دیا حتیٰ کہ وہ کہار جو
راجہ کے سنگھاسن کو سنبھالے ہوئے تھے رام راج کو اپنے حال پر چھوڑ کر خود اپنی جان بچانے کے لئے میدان
سے رفوچکر ہو گئے۔ جب یہ ہاتھی قریب پہنچا تو اس مرصع اور زرنگار انباری کو دیکھ کر فیلبان کے مُنہ میں
پانی بھر آیا اور چاہتا تھا کہ اُس پر قبضہ کر لے۔ راجہ کے جانثاروں میں سے ایک شخص نے چلایا کہ زنہار مہاراج کو
کسی قسم کا گزند نہ پہنچے اگر تم اس کی سواری کے لئے گھوڑا لا دو تمہیں سرفراز کرے گا فیلبان نے جو یہ سُنا کہ
رام راج یہی ہے تو فوراً طمع کر کے اُسے اپنی حراست میں لے لیا اور نہایت تیزی اور سرعت کے ساتھ
اپنے آقا حسین نظام شاہ کے پاس اُسے پہنچا دیا حسین نظام شاہ اس غیر متوقع کامیابی سے بہت خوش
ہوا اور فوراً اپنے مشیروں کی رائے سے رام راج کو قتل کروا دیا کہ کہیں عادل شاہ کو خبر ہو جائے جو اس کی
فرزندی کا دم بھرتا تھا۔ اس طرح یہ ہاتھ آیا ہوا شکار پھر کہیں چھوٹ نہ جائے۔ رام راج کا سر کاٹ کر نیزے پر
لٹکایا گیا۔ وجیانگری فوج نے جو یہ حال دیکھا تو اس کے رہے سہے حواس بھی غائب ہو گئے۔ سردار کے مارے
جانے کے بعد وہ کونسی فوج ہے جو جم کر لڑ سکتی ہے متحدین کے مقابلے کی اب اُن میں ہمت نہ رہی۔ ایسی
وحشت اور سراسیمگی کے عالم میں وجیانگر کی یہ زبردست فوج پریشان اور منتشر ہوئی کہ قیامت کی

تصویر آنکھوں میں پھر گئی۔ ہر ایک کو اپنی جان کی پڑی تھی کوئی کسی کے حال سے آگاہ نہ تھا جس کا
جس طرف منہ اٹھا وہ اسی طرف بھاگ کر جان بچاتا تھا غرض وجیانگریوں کو اس میدان میں زبردست
شکست ہوئی اُن کا تھوڑی دور تک تعاقب کیا گیا اور جب خوب اچھی طرح ان کی خبر لے لی گئی تو
متحدین نے اطمینان کا سانس لیا۔

اس جنگ نے وجیانگریوں کو ایسا برباد کیا اور ان کی قوت کو ایسی کاری ضرب لگائی کہ پھر وہ
سنبھل نہ سکے۔ یوں تو لڑائیاں ہوتی ہیں اور فریقین میں سے کسی نہ کسی کو شکست ہونا ضروری ہے مگر
یہ شکست ایسی شکست تھی کہ وجیانگر کی عظیم الشان اور باحیثیت سلطنت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا۔
وہ جاہ وحشم، وہ مال و دولت جو صدہا سال کی کوششوں کے بعد وجیانگر کو نصیب ہوئی تھی، چند دنوں
میں نیست و نابود ہو گئی۔ جنگ تالیکوٹ نے دراصل دکن کے اسلامی بادشاہوں کے حق میں فیصلہ کر دیا۔
اس کے بعد بہت عرصے تک کوئی ہندو سلطنت اُن کے مقابلے میں کھڑی نہ ہو سکی چونکہ تالیکوٹ کی جنگ
دکن کی تاریخ میں غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے اور ہندوستان کی فیصلہ کن جنگوں میں شمار ہوتی ہے اس لئے
اس کا تذکرہ بہ تفصیل کیا گیا۔ نیز اس وجہ سے بھی کہ اس جنگ نے دکن کی تاریخ پر اپنے گہرے نقوش چھوڑے
ہیں اور وجیانگر کی بربادی نے دکن کی سیاسیات کو یکلخت بدل دیا ہے۔ وجیانگر کے برباد ہونے سے
پہلے اسلامی ریاستوں کو اپنے ایک زبردست حریف کا خوف ہر وقت لگا رہتا تھا اور اس لئے وہ
اپنے کو سنبھالے رہتے تھے اور وقتاً فوقتاً آپس میں متحد بھی ہو جاتے تھے مگر جب اس بڑے دشمن کا
خاتمہ ہو گیا تو اُن کی آپس کی کشمکش اور بڑھ گئی اور وہ کھلے بندوں ایک دوسرے سے دست و گریباں
ہونے لگے۔ اُن کے آپس کی کشمکشوں کی یہ غیر معمولی زیادتیاں بالآخر ان سلطنتوں کے زوال کا ایک اہم
سبب ثابت ہوئیں۔ اس طریقے سے وجیانگر کی بربادی بالواسطہ خود ان اسلامی ریاستوں کے تدریجی تنزل
اور کمزوری کا باعث ہوئیں۔

جب ایکبارگی اس طاقتور دشمن اور مارآستیں کو کچل دیا گیا تو سلاطین دکن کی نظریں وجیانگر کے زرخیز
اور وسیع حصہ ہائے ملک پر پڑنے لگیں۔ ہر ایک کو اس کی فکر تھی کہ اس برباد شدہ ریاست کے کچھ غیر محفوظ

علاقوں کو اپنے قبضے میں کرلے۔ سب سے پہلے علی عادل شاہ نے اس معاملے میں پیشقدمی کی کیونکہ اس کو اس کا موقع مل گیا تھا حسین نظام شاہ کا انتقال تالیکوٹ کی جنگ کے تھوڑے ہی زمانہ بعد ہوگیا اور احمد نگر میں اس وقت ایک کم عمر لڑکا بادشاہی کر رہا تھا یہ لڑکا مرتضیٰ نظام شاہ ہے اس کی ماں خونزہ ہمایوں سلطان سلطنت کے کاروبار چلا رہی تھی جب احمد نگر میں یہ تبدیلی پیدا ہوگئی تو علی عادل شاہ کو اس جانب سے کوئی خطرہ نہیں رہا اور اس نے نہایت اطمینان کے ساتھ اپنی فوجوں کو وجیانگر کے علاقوں میں بغرض فتوحات مشغول کر دیا۔ وینکٹادری نے احمد نگر سے مدد طلب کی خونزہ ہمایوں سلطان نے اس غرض سے کہ بیجاپور کی طاقت ان فتوحات سے بہت بڑھ نہ جائے فوراً توازن قوت کے مسئلہ کو پیش نظر رکھ کر وینکٹادری کی مدد کے طور پر بیجاپور پر حملہ کر دیا۔ علی عادل شاہ کو دارالخلافہ کی محافظت کی غرض سے فوراً اس طرف متوجہ ہونا پڑا۔ احمد نگری فوج سے کچھ لڑائیاں ہوئیں لیکن چونکہ جنگ کی اصلی غایت پوری ہوچکی تھی اس لئے نظام شاہی فوجوں نے بیجاپور سے کوچ کر دیا۔

علی عادل شاہ کی فتوحات علی عادل شاہ کا آخری زمانہ ان فتوحات سے بھرپور نظر آتا ہے جو اس نے وجیانگر کے علاقے میں حاصل کیں۔ یوں تو اس زمانے میں احمد نگر پر بھی حملہ کیا گیا اور گوا کو بھی حاصل کرنے کی کوششیں کی گئیں، مگر یہ دونوں حملے ناکام رہے۔ اس لئے علی عادل شاہ نے قلعۂ ادھونی کی تسخیر کے لئے فوجیں بھیجیں۔ یہ ایک نہایت ہی مضبوط قلعہ تھا جس پر رام راج کے کسی سردار نے قبضہ کر لیا تھا اور خودمختارانہ حکومت کر رہا تھا۔ انکس خاں اس قلعہ کو فتح کرنے کے لئے بیجاپور سے روانہ کیا گیا۔ اس کے ساتھ آٹھ ہزار سوار کا ایک منتخب دستہ کئی توپ خانے اور بہت سی پیدل فوج بھی روانہ کی گئی ایک طویل اور پُرخطر محاصرے کے بعد یہ مضبوط قلعہ ہاتھ آیا۔ آدھونی کے زبردست قلعہ کی فتح کی وجہ سے علی عادل شاہ کا وقار بڑھ گیا اور وہ مزید فتوحات کا خواہشمند تھا لیکن اطمینان کے ساتھ اپنی فتوحات کے سلسلے کو جاری رکھنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ احمد نگر سے ایک معاہدہ کر لیا جائے تاکہ اُس کی طرف سے کسی قسم کا خطرہ نہ رہے۔ علی عادل شاہ کو اپنی پہلی کوشش یاد تھی کہ اس نے اُدھر وجیانگر کی ریاست میں قدم بڑھائے اور اِدھر احمد نگری فوج بیجاپور پر آ دھمکی۔ اب وہ اس صورت حال کے اعادہ کو پسند

نہ کرتا تھا اس لئے اس نے مرتضیٰ نظام شاہ سے سرحد پر ملاقات کی (مرتضیٰ نظام شاہ اسوقت معاملات سلطنت اپنے ہاتھ میں لے چکا تھا) اس ملاقات میں یہ طے پایا کہ علی عادل شاہ بلا خوف وخطر وجیانگر کے علاقوں پر قابض ہو اس میں ریاست احمدنگر کو کوئی تعرض نہوگا اور مرتضیٰ نظام شاہ اگر ممکن ہو تو برار کی ریاست پر قبضہ کرے ۔ بیجاپور کی ریاست اس معاملہ میں کوئی اعتراض نہ کرے گی مگر یہ شرط علی عادل شاہ کیساتھ بڑھادی گئی کہ وہ وجیانگر میں اپنی فتوحات کو اسی حد تک پھیلائے کہ مفتوحہ علاقہ کا رقبہ برار کی سلطنت سے زیادہ نہو۔ اس کا یہ مقصد تھا کہ برار اگر فتح ہو بھی جائے تو ایک مختصر اور محدود رقبہ کی ریاست ہے اور اس سے احمدنگر کچھ زیادہ فائدہ نہیں اٹھا سکتا لیکن وجیانگر کی عظیم الشان ریاست برباد ہونے کے بعد کس مپرسی کی حالت میں پڑی ہوئی ہے ممکن ہے کہ علی عادل شاہ اس عہدنامے سے فائدہ اٹھاکر اتنے علاقے حاصل کرلے کہ اس کی ریاست کی وسعت میں اضافہ ہو جائے۔ اگر یہ صورت ہوتو پھر بیجاپور دوسری دکنی سلطنتوں پر بآسانی غلبہ پاسکے گا اور یہ چیز توازن قوت کے اس اصول کے بالکل منافی ثابت ہوتی جس کی اب تک حفاظت کیجارہی تھی یہ شرط دراصل اسی توازن کے قائم رکھنے کے لئے لگائی گئی تھی۔

جب اس معاہدے کے بعد احمدنگر کی جانب سے اطمینان ہو گیا تو علی عادل شاہ کی فوجیں وجیانگر کے وسیع اور زرخیز میدانوں کی فتوحات میں مشغول ہوگئیں اور اس کوشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے مضبوط قلعے جو کسی وقت ریاست وجیانگر کا ایک جزو تھے بیجاپوری مقبوضات میں داخل ہوگئے۔ ان فتوحات میں، طورگل، دھارواڑ، نیکاپور، جرہ، چندرگوٹی، اکرورا اور باسلور کی فتح قابل ذکر ہے ان علاقوں پر جو راجہ وراجکماں حاکم تھے انھیں یا تو بالکل مفتوح کرلیا گیا یا ان کو بیجاپور کا باج گذار اور مطیع و منقاد بناکر چھوڑ دیا گیا اس طریقے سے علی عادل شاہ کے آخری زمانے میں ان فتوحات کی بنا پر بیجاپور کی ریاست کے حدود میں بڑی توسیع عمل میں آئی اور اسی اعتبار سے اس سلطنت کی عظمت و وقار میں بڑا اضافہ ہوا۔ ان فتوحات کے سلسلے میں مصطفیٰ خاں اردستانی نے اپنی بڑی قابلیتوں کا ثبوت دیا اور اُن میں اکثر مقامات اسی کی کوششوں سے فتح ہوئے تھے اس لئے علی عادل شاہ نے اسے یہیں

جاگیریں دیدی تھیں اور نئے مفتوحہ مقامات کا گورنر بنایا تھا۔ ایک عرصے تک وسعت سلطنت اور توسیع حدود کا سلسلہ جاری رہا۔ اکثر مضبوط اور مستحکم قلعے فتح ہوتے جارہے تھے اور بیجاپور کی ریاست ہر حیثیت سے مائل بہ ترقی نظر آتی تھی۔ علی عادل شاہ کا یہ آخری زمانہ جنگ تالیکوٹ کے بعد سے کم وبیش کرناٹک اور مالابار کے علاقوں کی فتح میں گذرجاتا ہے حتیٰ کہ ۹۸۷ھ مطابق ۱۵۷۹ء میں علی عادل شاہ کا انتقال ہوگیا۔

علی عادل شاہ کے انتقال کے وقت سلطنت بیجاپور کی غیر معمولی وسعت عمل میں آچکی تھی نئے نئے ملاباری علاقے اور مضبوط قلعے فتح ہوچکے تھے۔ وجیانگر کی سی زبردست اور عظیم الشان ریاست (جو اسلامی ریاستوں کی سب سے بڑی دشمن اور حریف ریاست تھی) کا خاتمہ ہوچکا تھا دکن کی تاریخ سے اس طاقت کا نام ونشان مٹ چکا تھا ادھر ہندؤں کی یہ زبردست سلطنت برباد ہوئی اور اس طرف شمال میں برار کی چھوٹی سی ریاست بھی دکن کے سیاسی نقشہ سے غائب ہوچکی تھی۔ احمدنگر کی ریاست نے اس معاہدے کے تحت (جس کا ذکر کیا گیا) برار کو اپنے قبضے میں کرلیا تھا چونکہ برار کی ریاست کا خاتمہ علی عادل شاہ کے آخری زمانے میں ہوتا ہے اور یہ بھی دکن کی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے اس لئے اس کے متعلق بھی دوچار جملے لکھ دینے چاہئیں۔

برار کا خاتمہ برار کی ریاست ابتداہی سے بہت چھوٹے رقبے پر پھیلی ہوئی تھی اس وجہ سے وہ زیادہ قوت حاصل نہ کرسکی۔ برہان عماد شاہ کے زمانے میں جبکہ بادشاہ (برہان) بالکل کم عمر تھا تفال خاں نے (جو یہاں کا ایک مقتدر وزیر اعظم تھا) شاہی خاندان کو الگ کرکے سلطنت کو اپنے قبضے میں کرلیا تھا۔ یہی دارو گیر اور کس مپرسی کا عالم تھا کہ برار پر احمدنگر کی للچائی ہوئی نظریں پڑنے لگیں۔ اور مرتضیٰ نظام شاہ کا پہلے ہی سے ارادہ تھا کہ تفال خاں کو الگ کرکے برار کو اپنے قبضے میں کرلے۔ اسی خواہش کی تکمیل کی غرض سے اس نے علی عادل شاہ سے وہ معاہدہ کیا جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ اس معاہدے کی وجہ سے اسے برار پر ایک اخلاقی حق حاصل ہوگیا ادھر خود سلطنت برار تفال خاں کی غاصبانہ کارروائیوں کی وجہ سے کمزور ہوگئی تھی۔ مرتضیٰ نے سنہ ۹۸۰ھ مطابق ۱۵۷۲ء میں برار پر

حملہ کر دیا۔ تفال خاں کو شکست دی اور سلطنت برار کو احمد نگر کا ایک جزو بنا لیا۔ برہان عماد شاہ اور تفال خاں قید کر دئے گئے اور یہیں ان دونوں کا انتقال ہو گیا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ انکو زہر دیا گیا تھا اس طرح ۱۵۷۴ء میں برار کے عماد شاہیہ خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔

ان واقعات کی تفصیل کے بعد دکن کی سیاسی قوتوں کا ایک سرسری معائنہ کر لینا کچھ غیر مفید نہ ہوگا۔ اس وقت دکن میں تین زبردست ریاستیں تھیں:۔

(۱) بیجاپور

(۲) احمد نگر

(۳) گولکنڈہ

ان کے علاوہ تین اور طاقتیں تھیں جن کی سیاسی اہمیت فی الحال کچھ ایسی زیادہ نہ تھی۔

(۱) بیدر

(۲) پرتگیزی

(۳) خاندیس

بیدر اس وقت رو بہ زوال تھا اور وہ دن دور نہ تھے جبکہ وہ عادل شاہی سلطنت کا جزو بن جائے[1]۔ اب رہ گیا خاندیس سو اس کی اہمیت اس وقت سے بڑھنے لگتی ہے جب سے کہ دکنی ریاستوں کا مغلوں سے تعلق شروع ہوتا ہے۔ خاندیس کبھی کبھی دکنی ریاستوں کے معاملات میں دلچسپی لیتا تھا مگر نہایت احتیاط اور ہوشیاری کے ساتھ، کہ کہیں ان کے آئے دن کے فسادات اور جھگڑوں کی وجہ سے اسے نقصان نہ پہنچ جائے۔ پرتگیزی اپنے ساحلی مقبوضات کو برابر ترقی دے رہے تھے جس کا بدیہی ثبوت یہ ہے کہ علی عادل شاہ نے اپنے آخری زمانے میں گوا کو حاصل کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ اس طرح اس وقت دکن میں چھ سیاسی قوتیں تھیں مگر فی الحال چند ریاستوں سے ہم کو

---

[1] فرشتہ ۱۰۲۹ھ میں بیدر عادل شاہی مقبوضات میں داخل ہو گیا۔

براہ راست تعلق ہے وہ اول الذکر تین ریاستیں ہیں اور در اصل اس زمانے کی دکنی سیاسیات کا محور بھی یہی تھیں۔

یہ تو خالص دکنی سیاسی قوتوں کا ایک سرسری معائنہ تھا اس زمانے کی سیاسیات پر بحث کرتے ہوئے مغلوں کی بڑھتی ہوئی طاقت سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔ اس زمانے میں تخت دہلی پر اکبر اعظم جلوہ گر تھا اور اس کی قوت میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہو رہی تھی مگر فی الحال اُسے اتنا موقع نہ تھا کہ شمال سے بے توجہی کر کے جنوب کی طرف رُخ کرتا مگر پھر بھی یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ علی عادل شاہ کے آخری زمانے میں اکبر کی نگاہیں دکن پر پڑ رہی تھیں جس کا ثبوت یہ ہے کہ اس نے تغال خاں کے معاملے میں مرتضیٰ نظام شاہ کو ایک انتناعی حکم بھیجا تھا کہ وہ اپنی کارروائیوں کو روک دے گو اس کی ایک نہ سنی گئی مگر اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دکن کے معاملات مغلیہ حکومت کی توجہ کا مرکز بننا شروع ہو گئے تھے۔ اس کی مزید دلیل یہ ہے کہ دربار بیجاپور میں مغلیہ حکومت کی جانب سے علی عادل شاہ کے اسی آخری زمانے میں دو سفیر آئے ہوئے تھے۔ پہلے حکیم علی گیلانی اکبر کے نمائندے کی حیثیت سے بیجاپور آیا اور یہاں سے بہت کچھ تحفہ و تحائف کے ساتھ رخصت ہوا۔ دوسرا شخص جو بحیثیت سفیر کے یہاں آیا وہ حکیم عین الملک شیرازی ہے اور یہ شخص ابھی بیجاپور ہی میں تھا کہ علی عادل شاہ[1] قتل کر دیا گیا۔ یہ واقعات صاف طور پر بتلا رہے ہیں کہ مغل اس وقت دکن سے بے خبر نہ تھے۔

اس طریقے سے ابراہیم عادل شاہ ثانی کی تخت نشینی کے وقت دکن کی خارجی فضا کچھ صاف نہ تھی اور اس وقت دکنی ریاستوں کے سامنے بہت کچھ اہم مسائل موجود تھے جن کی طرف فوری توجہ کی سخت ضرورت تھی مگر ان ریاستوں کی اندرونی حالتیں خود اس قدر ناگفتہ بہ ہو چکی تھیں کہ خارجی معاملات کو پس پشت ڈالنا لازمی ہو گیا تھا۔

---

[1] علی عادل شاہ کے قتل کے متعلق مختلف روایتیں ہیں جس میں خواجہ سراؤں والی روایت زیادہ مشہور و معلوم ہے لیکن یہاں تفصیل کی ضرورت نہیں۔ ان تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو فرشتہ، تذکرۃ الملوک و بساتین السلاطین۔

ابراہیم ثانی کی تخت نشینی کے وقت ملک اندرونی حالت

پچھلی سطروں میں اس فضاء کو پیش کیا گیا جو ابراہیم کی تخت نشینی کے وقت بیجاپور کی سلطنت کو خارجی طور پر گھیری ہوئی تھی اب کچھ اندرونی ماحول کا بھی اندازہ کر لینا چاہیئے۔ بادشاہ کی کمسنی کی وجہ سے ملک میں علی عادل شاہ کے انتقال کے ساتھ ہی اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں۔ اُمرا اور اعلیٰ عہدہ داروں کی کشمکش کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نئے بادشاہ کی تخت نشینی ملک کو سخت پریشانیوں میں مبتلا کر دیتی ہے اس وجہ سے کہ اُمرا کی خود غرضیاں، ان کی نااتفاقیاں اور اُن کی باہمی رقابتیں بہت بڑھ گئی تھیں اور کسی کو اس کا احساس نہ تھا کہ ملک اور بادشاہ کے ساتھ ان پر کیا کیا ذمہ داریاں عائد ہیں۔ اگرچہ علی عادل شاہ نے مرتے وقت ایک نہایت وسیع، مضبوط اور مستحکم ریاست اپنے جانشین کے لئے چھوڑی تھی لیکن ان اُمرا کی خود غرضیوں کی وجہ سے یہ زبردست سلطنت ورطۂ تباہی میں گھر جاتی ہے۔ اُمرا نے ذاتی اغراض اور ذاتی مفاد کے لئے جو لڑائی جھگڑوں کی ابتداء کی تھی وہ اس قدر خطرناک صورت اختیار کر لی کہ قریب تھا کہ بیجاپور کی ریاست خود غرضیوں کا شکار ہو جائے مگر بعض حالات نے جن کا آئندہ تفصیلاً ذکر کیا جائیگا بیجاپور کی سلطنت کو تباہی سے محفوظ رکھا۔ اس اندرونی خرابی کی وجہ سے بیرونی پریشانیوں میں بھی مبتلا ہونا پڑا یہ عجیب بات ہے کہ جس طرح بیرونی فضاء دکنی سلطنتوں کی مشترک تھی اسی طرح اندرونی ماحول بھی اس زمانے کی ریاستوں میں قریب قریب یکساں تھا جو حال بیجاپور کا ابراہیم کی کمسنی میں رہا تقریباً وہی حال احمد نگر کا مرتضیٰ نظام شاہ کے انتقال کے بعد سے ہو گیا۔ یہاں بھی اُمراء کا ضرورت سے زیادہ طاقتور ہو جانا اور پھر اُن کی خانہ جنگیوں کی وجہ سے ملک کو سخت نقصان پہنچا۔ ان ریاستوں کی اندرونی خرابیوں کا خود اُن کے حق میں ایک مضر نتیجہ یہ ہوا کہ مغل اُن پر بآسانی چھا گئے ورنہ اگر یہ خرابی اس زمانے میں نہ پیدا ہوتی اور یہ ریاستیں آپس میں متحد رہتیں تو ممکن نہ تھا کہ مغل ایک انچ بھی اپنی فتوحات کے سلسلے میں دکن میں آگے بڑھ سکتے۔"

یہ ایسی خرابی تھی جس کی وجہ سے دکنی ریاستوں نے بہت نقصان اٹھایا۔ آئندہ صفحات میں

یہ چیز خود بخود واضح ہو جائے گی کہ اُمرا اور سرداروں کی ناموافقت اور عدم اتحاد نے ملک کو کس قدر شدید نقصان پہنچایا۔ ابراہیم کی کمسنی کا طویل زمانہ (تقریباً دس سال کا ہوتا ہے) بیجاپور کیلئے نہایت پُرآشوب ثابت ہوا۔ عادل شاہیہ خاندان کی اقبال مندی اور بعض بہی خواہان ریاست کی وفاداری، نمک حلالی اور حق شناسی سمجھنا چاہیئے کہ بیجاپور برباد ہوتے ہوتے رہ گیا جب آخرکار "یہ طویل تولیت" کا دور ختم ہوا اور ابراہیم نے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی تو پھر اُسی آب و تاب اور اُسی عزت و وقار کے ساتھ اُس نے بیجاپور پر حکومت کی جیسے کہ علی عادل شاہ یا اُس کے پہلے لائق اور بہتر بادشاہوں نے کی تھی اور دراصل اس وقت سے بیجاپور کی تاریخ کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے۔

ابراہیم کی تخت نشینی، ابتدائی زندگی، تعلیم و تربیت اور کیرکٹر

باب دوم

ابراہیم کی تخت نشینی

علی عادل شاہ کا جب انتقال ہوا تو اس کا بھتیجا ابراہیم تخت نشین کیا گیا۔ علی عادل شاہ کے کوئی اولاد نہ تھی۔ اسی وجہ سے اس نے اپنے بھائی طہماسپ کے بچوں کو اپنے بچوں کی طرح پالا تھا۔ اپنی زندگی ہی میں اس نے یہ ظاہر کر دیا تھا کہ اس کے بعد اس کا جانشین ابراہیم ہوگا چنانچہ ۹۸۷ھ میں ایک جشن[1] کیا گیا اور ابراہیم ولیعہد مقرر کیا گیا اس کے دوسرے ہی سال ۹۸۸ھ میں علی عادل شاہ کا انتقال ہو گیا۔

علی عادل شاہ کے انتقال کے وقت ابراہیم کی عمر ۹ سال تھی۔ وارث تخت و تاج کی کمسنی ہمیشہ بغاوتوں کی محرک اور فسادات کا باعث ہوتی ہے اور ہر شخص ہمیشہ یہ چاہتا ہے کہ جہاں تک ہو سکے اس موقع سے فائدہ اٹھایا جائے۔ نئے نئے دعویدار سلطنت پیدا ہو جاتے ہیں اور اندیشہ رہتا ہے کہ کہیں ملک میں ایک فتنۂ عظیم نہ برپا ہو جائے۔ علی عادل شاہ کے بعد تقریباً یہی صورت حال تھی اگرچہ ابراہیم کو

---

[1] اس جشن کے متعلق فرشتہ یوں رقمطراز ہے "در ماہ شوال سنہ سبع وثمانین وتسعمائۃ (۹۸۷) چونکہ آنحضرت را فرزند نہ بود برادر زادۂ خود شہزادہ ابراہیم بن طہماسپ را ولیعہد ساختہ با امراء و ارکان دولت گفت کہ بعد از من پادشاہ شما اینست۔" اسی سال سنت خلیل اللہ کے مطابق شہزادے کی ختنہ کی گئی اس خوشی میں ایک بڑا جشن ترتیب دیا گیا اس سلسلے میں فرشتہ شہزادے کی اقبال مندی کے مطابق ایک قصہ بیان کرتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ شہزادے کا بڑی دھوم دھام سے جلوس نکالا گیا۔ آتشبازی کا بھی خوب انتظام تھا۔ سوئے اتفاق سے مجمع میں آگ لگ گئی۔ قریب ۷۰۰ سات سو نفوس نذر آتش ہو گئے مگر شہزادے کو جو اسی مجمع میں تھا کسی قسم کا نقصان نہ پہنچا اور وہ صحیح و سلامت بچ کر نکل گیا۔ (فرشتہ مقالہ سوم، روضہ دوم)۔

ولیعہدی کے لئے نامزد کر دیا گیا تھا مگر پھر بھی شہزادے کا حقیقی بھائی اسمٰعیل موجود تھا جو ہر طریقے سے تخت و تاج کا اسی طرح حقدار تھا جیسے کہ خود ابراہیم۔ الا اس کے کہ ابراہیم کو پہلے ہی سے ولیعہد بنا دئیے جانیکا تفوق بھی حاصل تھا مگر "خیلہ جو را بہا نہ بسیار" کے مصداق خود اس شہزادے کی موجودگی ہی بہت کافی تھی کہ فتنہ پرداز اور متمرد اشخاص اس کے حقوق کی حمایت کے حیلے سے ملک کے امن و امان میں خلل انداز ہوں۔ اس بدامنی و فتنہ و فساد کو روکنے کے لئے افضل خاں نے جو علی عادل شاہ کے آخری زمانے میں وکیل السلطنت کے عہدہ پر فائز تھا۔ بادشاہ کے انتقال کے ساتھ ہی اندر سے قلعے کے دروازے بند کرا دئیے اور کسی کو داخل ہونیکی اجازت نہ دی۔ افضل خاں چاہتا تھا کہ انتظامات ٹھیک کرنے سے پہلے علی عادل شاہ کی وفات کی خبر ملک میں نہ پھیلے مگر باوجود اس احتیاط کے تھوڑے ہی عرصے میں یہ خبر عام ہو گئی کہ بادشاہ کا انتقال ہو گیا ہے۔ اس خبر کے سنتے ہی تمام ملک میں ایک پریشانی پیدا ہو گئی اور صبح ہوتے ہوتے اکثر امراء و اعیان قلعے کے دروازے پر جمع ہو گئے اور اسی تشویش میں تھے کہ دیکھئے کس کو بادشاہ بنایا جاتا ہے بالآخر ایک شخص کو اس جماعت کا سفیر بنا کر افضل خاں کے پاس روانہ کیا گیا کہ جانشینی کی نسبت جو تصفیہ کیا گیا ہے اس سے آگہی حاصل کر کے واپس آئے جب افضل خاں سے استصواب رائے کیا گیا تو اس نے جواب دیا کہ جو تمام امراء اور ارکان دولت کی رائے ہو اسی پر عمل کیا جائیگا۔ اس پر امراء نے وہیں ایک مجلس مشاورت منعقد کی۔ شاہ کمال الدین فتح اللہ اور دیگر مدبران سلطنت کی یہ رائے ہوئی کہ علی عادل شاہ نے اپنی زندگی میں جو تصفیہ کیا ہے وہی بحال رکھا جائے۔ ابراہیم جو حقیقی وارث تخت و تاج ہے علی عادل شاہ کا جانشین قرار دیا جائے۔ میر مرتضیٰ خاں انجو کو افضل خاں کے پاس اس گذارش کے ساتھ روانہ کیا گیا کہ تمام اعیان و ارکان دولت نے یہ تصفیہ کیا ہے کہ جلد از جلد اس پر عمل کیا جائے۔ ساتھ ہی یہ بھی خواہش ظاہر کی گئی تھی کہ چونکہ ابراہیم کم عمر ہے اور معاملات سلطنت کے سنبھالنے کے لئے ایک متولی کی ضرورت ہے۔ افضل خاں جو پہلے سے ہی "وکیل السلطنت" کے ممتاز عہدے پر فائز ہے بادشاہ کی کمسنی تک متولی یا نائب السلطنت کی نئی خدمت بھی انجام دے۔ افضل خاں نہایت دانا اور تجربہ کار آدمی تھا، وہ جانتا تھا کہ یہ بار گراں اپنے کندھوں پر اٹھانا آسان نہیں۔ بادشاہ کمسن ہے، فتنہ و فساد برپا ہونیکا اندیشہ ہے اور

ان کا سدِّباب کوئی آسان کام نہیں اس لئے اُس نے "متوفی حکومت" کا عہدہ قبول کرنے سے انکار کر دیا لیکن فی الحال یہ رائے دی کہ "چار معتبر اشخاص کو قلعے کے اندر بلا لیا جائے پھر اُن کے مشورے سے ابراہیم کو تخت نشین کر دیا جائے گا" چنانچہ شاہ کمال الدین، فتح اللہ، مرتضیٰ خاں آنجو، انجن خاں اور پسر کوچک کشور خاں (جو کامل خاں کا داماد تھا) قلعے میں داخل کر لئے گئے۔ آپس میں تھوڑی سی گفت و شنید کے بعد یہ طے پایا کہ نئے بادشاہ کی تخت نشینی جلد از جلد عمل میں آنی چاہیئے۔ اس کے بعد تخت نشینی کی کارروائی کو ابراہیم زبیری ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ یہ لوگ "بر دروازہ حرم محترم رسیدند، ابراہیم عادل شاہ را از اندرون بیرون آوردہ، بر بالائے برج، بر مسند عزت و شوکت نشاندہ، چتر سبز زرنگاری کہ لازمہ عادل شاہیہ بود، بر سر افراشتند۔ اعیان و ارکان درگاہ اول زمین بوس شدہ سلام و تہنیت پرداختند و نذور از نظر گزرانیدند و بعد ازاں تمام خلائق از بروں سجدات شکر بجا آوردہ باز گشتند"[1]

ابراہیم کی تعلیم و تربیت و کیرکٹر

ابراہیم کی تخت نشینی سے پہلے کے حالات کا بہت کم پتہ چلتا ہے اسکے سن پیدائش اور ابتدائی تعلیم و تربیت کے متعلق تواریخ بالکل ساکت ہیں لیکن چونکہ جس وقت وہ تخت نشین ہوا ہے اس کی عمر تقریباً دس سال تھی[2] اور اس کا سن جلوس ۹۸۸ھ ہے۔ لہٰذا نہایت آسانی سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ تقریباً ۹۷۸ھ میں وہ پیدا ہوا۔ علی عادل شاہ ۹۶۵ھ مطابق ۱۵۵۷ء میں تخت نشین ہوا تھا۔ اپنی تخت نشینی کے بعد اس نے اپنے بھائی طہماسپ کی آنکھیں نکلوا دیں اور نظر بند کر دیا تھا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ابراہیم اپنے باپ کی قید کے زمانے میں جبکہ اس کی آنکھیں بے نور ہو چکی تھیں، پیدا ہوا ہے لیکن جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے علی عادل شاہ نے اولاد نہ ہونے کی وجہ سے اپنے مظلوم بھائی کے بچوں کو لیکر پال لیا تھا۔ ابراہیم چونکہ سب میں بڑا تھا اُسے اپنا ولیعہد اور جانشین بھی مقرر کر دیا۔ اس غرض سے کہ وہ آئندہ بادشاہ ہونے والا ہے، اس کی تعلیم و تربیت کی طرف بھی خاص توجہ

---

[1] بساطین السلاطین۔

[2] فرشتہ: جس وقت ابراہیم تخت نشین ہوا ہے وہ اپنی عمر کے نو سال ختم کر چکا تھا اور قریب قریب دس سال اس کی عمر تھی۔

گیگئی۔یوں تو اپنے دونوں بیٹوں کو علی عادل شاہ عزیز رکھتا تھا اور اُن کی تربیت اعلیٰ پیمانے پر ہو رہی تھی مگر بادشاہ کی توجہ خاص طور پر ابراہیم کی طرف مبذول رہتی تھی۔

ابراہیم بچپن سے ہی نہایت سنجیدہ، متین اور بُردبار واقع ہوا تھا۔اس کی کم عمری میں اُسکی پیشانی سے آثار بزرگی و برتری ہویدا تھے۔بساتین کے مصنف نے ابراہیم کی ان خصوصیات کا ان الفاظ میں تذکرہ کیا ہے"دراں ہنگام (بر وقت تخت نشینی) مدارج عمرش از نہ سالگی تجاوز نہ کردہ بود۔ہم دراں صغر سن بکمال تمکین و سنجیدگی و صدق فہم انصاف داشت از ناصیۂ خورگی آثار بزرگی ہویدا بود۔"[1] اور فرشتہ[2] اس امر کی تصدیق کرتا ہے کہ اس نوعمری میں جبکہ عموماً بچوں کا دل کھیل کود میں لگا رہتا ہے، ابراہیم قطعاً ان وقت خراب کرنیوالی دلچسپیوں سے احتراز کرتا تھا۔اس زمانے میں اس نے قرآن مجید کی تعلیم حاصل کی۔وہ خوشنویسی کی مشق کیا کرتا تھا۔اور اپنے زمانے کے مطابق اُس نے نہ صرف تحصیل علوم کی طرف ہی کوشش کی بلکہ فنون سپہ گری کا بہت اچھا ماہر ہو گیا۔بالخصوص گھوڑے کی سواری، نیزہ بازی اور دیگر آلات حرب کے استعمال سے اُس نے خاصی اچھی واقفیت پیدا کر لی تھی۔یہ دراصل اُس زمانے کے اصول تعلیم و تربیت کی خوبی تھی کہ سپاہیانہ فنون کو دائرۂ تعلیم سے خارج نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اُس کی طرف زیادہ توجہ کی جاتی تھی اور ماہر فنون سپہ گری کو بڑی وقعت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔اس چیز کو ایسی ہر دلعزیزی اور ایسی عام مقبولیت حاصل تھی کہ صرف بادشاہوں اور والیان ریاست کے لئے ہی ان فنون کا حاصل کرنا ضروری اور لازمی نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ ہر کس و ناکس کے لئے اس قسم کی تعلیم ضروری خیال کی جاتی تھی اسی وجہ سے اُس زمانے کا بچہ بچہ سپاہی ہوتا تھا۔چونکہ اُس زمانے میں ہمسایہ قوتوں یا ریاستوں سے آئے دن لڑائی جھگڑے ہوا کرتے تھے اور میدان کارزار ہمیشہ گرم رہتا تھا لہٰذا یہ ایک قومی ضرورت ہو گئی تھی کہ ہر شخص آلات حرب کے استعمال سے

---

[1] بساتین السلاطین۔صفحہ ۱۹۴۔

[2] فرشتہ مقالہ سوم صفحہ ۴۔

واقف رہے تاکہ وقت پڑے تو اپنی اور اپنی قوم و ملک کی محافظت و بقاء کے لئے وہ اپنے دشمنوں کا اچھی طرح مقابلہ کر سکے۔ اسی وجہ سے بلالحاظ پیشہ و طبقہ ہر شخص ان مردانہ فنون سے کچھ نہ کچھ واقفیت ضرور رکھتا تھا جب فنون سپہ گری کی مقبولیت کا یہ عالم ہوا ور ملک میں جب اس کو اتنی اہمیت دیجاتی ہو تو ظاہر ہے کہ بادشاہ جو پورے ملک کا نگہبان اور محافظ سمجھا جاتا تھا بھلا اُن سے کیسے اغماض برت سکتا اُس پر تو اپنے اعلیٰ منصب کی عظمت و شوکت کے اعتبار سے ان فنون میں کامل مہارت رکھنا ضروری تھا یہی وجہ ہے کہ اُس زمانے میں شہزادوں اور وارثان تخت و تاج کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں اس کا خاص طور پر لحاظ رکھا جاتا تھا کہ اُن میں بہادری اور مردانگی کے جوہر پیدا ہوں اور وہ سپاہیانہ فنون سے کامل طور پر واقف رہیں۔ بلکہ یہاں تک کہا جا سکتا ہے کہ اس زمانے کا معیار یہ تھا کہ بادشاہ کی پہلی ضرورت فنونِ سپہ گری سے واقفیت سمجھی جاتی تھی۔ اور بعد میں کتابی علوم کی تحصیل کا خیال کیا جاتا تھا۔ غرض ابراہیم کو بھی اس زمانے کے معیار کے مطابق تعلیم دیگئی اور جہاں وہ ایک طرف علمی قابلیتیں حاصل کر رہا تھا اس کے ساتھ ہی دوسری طرف وہ ایک بہادر سپاہی اور واقف رموز حرب بھی ہو رہا تھا مگر ابھی یہ تعلیم ختم ہونے پائی تھی اور وہ اس کے ابتدائی منازل ہی طے کر رہا تھا کہ اسکے سرپرست اور چچا علی عادل شاہ کا انتقال ہو گیا۔ گو تخت نشینی کے بعد بھی کم عمری کا لحاظ کرتے ہوئے یہ تعلیم و تربیت کا سلسلہ چاند بی بی اور مختلف متولیانِ ریاست کے زیر نگرانی جاری رہا مگر وقتاً فوقتاً ان مختارانِ سلطنت کی باہمی کشمکش اور فسادات کی بناء پر بادشاہ کے سلسلۂ تعلیم و تربیت میں بہت حرج ہوا مگر خود یہ بغاوتیں اور فسادات جو اس کی نوعمری میں اُسے گھیرے ہوئے تھے قدرتی تعلیم سے کچھ کم نہ تھے۔ ابراہیم ان سے بہت کچھ سبق لے سکتا تھا اگر یہ سچ ہے کہ نامساعد حالات انسان کو بہتر اور بہترین تربیت دیتے ہیں۔

علی عادل شاہ کے قبل از وقت مرجانے سے ابراہیم کی تربیت کا بار چاند بی بی پر پڑا یہ فہیم اور دانشمند عورت ہر طریقے سے اس کام کے لئے موزوں تھی اور حقیقت یہ ہے کہ اگر چاند بی بی اس وقت بیجاپور میں معاملات سلطنت کے سنبھالنے کے لئے موجود نہ ہوتی تو شاید ابراہیم کو حقیقی معنی میں

بادشاہ ہونا نصیب بھی نہ ہوتا کیونکہ ہر وہ شخص جو مختارؒ یا متولی مقرر کیا جاتا، بادشاہ کی کمسنی سے فائدہ اٹھاکر اور اپنی قوت واقتدار کے نشہ میں بیخود ہوکر یہ چاہتا تھا کہ اگر ممکن ہو تو اصل خاندان کو ایک طرف کرکے خود ہی سلطنت کا مالک بن جائے۔ بیجاپور کی تاریخ میں خصوصاً ایسی مثالیں بہت ملتی ہیں کہ سلطنت کی ڈوبتی ناؤ کو عین وقت پر عورتوں نے بچالیا چنانچہ جب یوسف عادل شاہ کا انتقال ہوا اور اس کا جانشین اسمٰعیل کم عمری میں تخت نشیں ہوا تو کمال خاںؒ نے نمک حرامی پر کمر باندھی تھی مگر بوبوجی خانمؒ کے حسن تدبیر، شجاعت اور دلیری اور دل شاد آغاؒ کی ہمت مردانہ نے اس کے ان تمام منصوبوں پر پانی پھیر دیا۔ اسی طریقے سے اب جبکہ ابراہیم چھوٹا تھا، متولیان ریاست یکے بعد دیگرے سلطنت پر غاصبانہ نگاہیں ڈالنے لگے تھے مگر یہ ابراہیم کی خوش قسمتی اور عادل شاہی خاندان کی اقبال مندی تھی کہ اس وقت چاند بی بی جیسی عورت موجود تھی جو ابراہیم کے حقوق کی مردانہ وار حفاظت کرتی رہی۔ اور ان سرکش اور متمرد وزیران سلطنت کی باغیانہ اور غاصبانہ کوششوں کو پھلنے پھولنے نہ دیا۔ غرض ابراہیم ایک وانائے روزگار عورت کے سایۂ عاطفت میں پرورش پاتا رہا اور تربیت حاصل کرتا رہا۔

تخت نشیں ہونے کے بعد یہ معمول تھا کہ سوائے چہارشنبہ اور جمعہ کے باقی ایام میں یہ کمسن بادشاہ دربار کرتا اور تخت شاہی پر جلوہ افروز ہوتا تھا۔ تمام اُمرائے دولت اور اعیان سلطنت سلام کے لئے حاضر ہوتے، اور بادشاہ کی موجودگی میں تمام کاروبار سلطنت انجام پاتے تھے اس طریقے سے

لہ۔ ابراہیم کے عہد کے متولیان ریاست کی مفسدانہ اور غاصبانہ کارروائیوں کی تفصیل آئندہ صفحات میں آئیگی۔

لہ۔ کمال خاں اسمٰعیل عادل شاہ کے ابتدائی عہد میں متوئی ریاست رہا مگر نمک حرامی کرکے چاہتا تھا کہ تخت خود غصب کرلے۔

لہ۔ بوبوجی خانم یوسف عادل شاہ کی بیوی اور اسمٰعیل کی ماں تھی یہ عورت مرہٹہ نسل سے تعلق رکھتی تھی اور شتہ۔

لہ۔ دل شاد آغا غضنفر بیگ کی بہن تھی۔ یوسف عادل شاہ غضنفر بیگ کو بہت چاہتا تھا اور اپنا بھائی کہتا تھا، اس اعتبار سے اُس کی بہن بھی محل میں رسوخ رکھتی تھی غضنفر بیگ ایک جاں نثار اور بہادر جنرل تھا۔

گویا اس کو امور سلطنت سے واقف کرایا جاتا اور معاملات ملکی کی انجام دہی کے اصول سے آگہی بخشی جاتی تھی تاکہ جب وہ سن بلوغ کو پہنچکر عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لے تو منصب شاہی کے تمام فرائض سے کماحقہٗ واقف اور آگاہ رہے اسی زمانے سے ابراہیم میں اسقدر فرض شناسی کا مادہ پیدا ہو گیا تھا کہ جب کسی نے ایک روز معمول سے زیادہ دیر ہو جانے پر بادشاہ سے کہا "امروز از نشست چنیں دیر (شدہ است) البتہ بہ ذات عالی کوفت و ماندگی رسیدہ باشد۔ اکنوں باستراحت میل فرمائید۔ بہ زبان گوہر فشاں فرمودند کہ مہمی اسحال بما حوالہ شد آسانی و استراحت را گنجائش ندارد"[۱]

اس جواب سے اس کی مستعدی اور فرض شناسی کا اچھا اندازہ ہوتا ہے۔ اس نوعمری کے دو ایک نہایت دلچسپ واقعات ہیں جن سے اسکی طبیعت کی متانت سنجیدگی اور بردباری کا اظہار ہوتا ہے کیشور خاں کے اقتدار کا زمانہ تھا اور وہ ایسی حکومت کر رہا تھا جیسا کہ وہ خود بادشاہ ہے اتفاقاً ابراہیم کی والدہ کو کچھ جواہر کی ضرورت ہوئی کشور خاں نے ہیرے اور جواہر بھیجے تو سہی لیکن وہ ادنیٰ درجے کے تھے۔ اس پر بڑی بی صاحبہ (والدۂ ابراہیم) بہت بگڑیں اور ان کی شاہانہ طبیعت کو یہ بہت ناگوار گذرا کہ ایک متولی ریاست بادشاہِ وقت کی والدہ کے لئے جو تحفہ بھیجے وہ اس قدر معمولی اور ادنیٰ درجے کا ہو۔ اس نے ذرا بھی شاہی ادب ملحوظ نہ رکھا۔ ان کے نزدیک اس کی اس حرکت سے شاہی خاندان کی تحقیر و تذلیل ہوتی تھی۔ شدہ شدہ ابراہیم کو اپنی والدہ کی رنجش کا حال معلوم ہوا اس نے جس نازک پیرایہ میں اپنی ماں کی تسلی و دلجوئی کی ہے اس کا حسب ذیل الفاظ سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے "سلطان بہ خدمت والدۂ خویش عرض پرداخت کہ قبلہ گاہا اگر سلطنت از ماست، ہر چہ است از ماست و اگر غیر از خواہد بود ایں راہم بما نخواہد گذاشت چہ الفاظ شریف آمدہ میدارید"

واقعی یہ گفتگو ایک دس سالہ لڑکے کی زبانی حیرت انگیز ہے جس سے اس کی انتہائی دانشمندی کا

[۱] بساتین السلاطین۔

اظہار ہوتا ہے۔ متانت کا یہ عالم تھا کہ بہت کم گفتگو کرتا تھا اور جب اس کی کم سخنی کے متعلق ایک بار استفسار کیا گیا تو جواب دیا کہ بادشاہوں کا وقار اور اُن کی عظمت وشوکت کو قائم رکھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ متانت وسنجیدگی اختیار کریں[1]۔ غرض ان واقعات سے اس کی طبیعت کی خصوصیات پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔ یہ واقعات خود اپنی جگہ کچھ ایسے زیادہ اہم نہیں لیکن اُن کی اہمیت اس وجہ سے بڑھ جاتی ہے کہ ایک دس سالہ لڑکا ان متین وسنجیدہ خیالات کا حامل ہے جو شاید اس سے کہیں زیادہ بڑی عمر والے لوگوں میں نہیں پائے جاتے۔

ابراہیم کی تعلیم وتربیت اور اس کے کیرکٹر پر بحث کرتے ہوئے دو ایک چیزوں کو خاص طور پر ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ سب سے پہلے تو یہ کہ وہ بہت کمسنی میں تخت نشیں ہوا۔ برابر دس سال تک سلطنت کے کاروبار مختلف متولیان ریاست کے زیر نگرانی چلتے رہے۔ اس دس سالہ دور میں بادشاہ کمسن ہونے کے اعتبار سے بالکل پس پشت ہو جاتا ہے۔ معاملات سلطنت میں اس کا ذرا دخل نہیں، اس کے اختیارات اور اس کے اثرات بالکل صفر۔ پوری دہ سالہ تاریخ محض بیرونی حملوں اور اندرونی کشمکشوں سے پُر نظر آتی ہے۔ متولیان ریاست کی آپس کی رقابتیں، دشمنیاں اور اُن کی خود غرضیاں ریاست بیجاپور کو ایک زبردست الجھن میں ڈالدیتی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ تاریخوں میں اس کمسن بادشاہ سے متعلق واقعات کا پتہ بڑی مشکل سے کہیں کہیں ملتا ہے اور جو کچھ واقعات ملتے ہیں وہ متولیان ریاست کی کارگذاریاں، اُن کا عروج وزوال، اُن کی آپس کی کشمکش، اُن کی خانہ جنگیاں اور کچھ بیرونی حملے ہیں۔ بادشاہ اس کی تعلیم وتربیت، اس کا کردار، اس کے مشاغل، اس کی دلچسپیاں، اس کی سیاسی حیثیت اور مختلف متولیوں سے اس کے تعلقات پر بہت کم روشنی پڑتی ہے۔ اگر کہیں بادشاہ تھوڑا بہت منظر عام پر آتا ہے تو وہ دلاور خاں کی تولیت کا آخری زمانہ ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم ٹھیک طور پر اندازہ نہیں

---

[1] بساتین السلاطین۔

کرسکے کہ اس طویل دور میں ابراہیم کیا کرتا رہا اور اس کی تعلیم و تربیت کیسے ہوئی اور وہ اپنے گردوپیش کے حالات سے کیسے متاثر ہو رہا تھا۔ یوں تو تھوڑے بہت حالات ملتے ہیں مگر وہ بھی جستہ جستہ۔ تفصیلاً اس موضوع پر کہیں مواد نہیں ملتا کیونکہ مورخ کی نگاہ تمام تر متولیان ریاست کی کارگذاریوں اور اُن کے حالات پر رہتی ہے اور وہ اس دور میں بادشاہ کو بالکل پس پشت کر دیتا ہے۔[۱] جب صورت حال یہ ہو تو مجبوراً اس کی تعلیم و تربیت اور اس کے کردار کا اندازہ لگانے کے لئے سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ بادشاہ نے زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لینے کے بعد خود کو جس قسم کا انسان ثابت کیا اور اپنا جو بنا بنایا کیرکٹر لیکر وہ تخت شاہی پر جلوہ افگن ہوا اسی کی مدد سے اس کی اس دس سالہ زندگی اور کردار پر روشنی ڈالی جائے کیونکہ یہ تو مسلمہ ہے کہ خواہ یہ دس سالہ دور ملک اور بادشاہ کے لئے بحیثیت مجموعی مفید ثابت ہوا ہو یا مضر، بہر حال ابراہیم کے کیرکٹر کی تشکیل کا دور ہے۔ جو کچھ بھی ابراہیم حقیقی معنی میں بادشاہ ہونے کے بعد رہا اور جیسا کچھ بھی اس نے خود کو ثابت کیا ہے وہ اسی دس سالہ دور کے اثرات اور واقعات کا نتیجہ ہے کیونکہ اس کے صحیح مذاق کا نشوونما اس کے کیرکٹر کا ارتقا، اس کی طبیعت کے رجحانات و میلانات کی تشکیل وہ سب کچھ اُسی دور کے ممنونِ احسان ہیں اور ہونے چاہئیں۔ ان تمہیدی سطور کے بعد پھر ہم ابراہیم کے کیرکٹر کے تدریجی ارتقا کی طرف توجہ کرتے ہیں اور اس سلسلے میں اُن واقعات سے بھی مدد لیجائے گی جو اس دس سالہ دور سے باہر ہیں اور جو ابراہیم کی حقیقی بادشاہت کے کارنامے ہیں۔

کامل خاں، کشورخاں اور اخلاص خاں کے زمانہ ہائے حکومت کچھ ایسے زیادہ نہیں دو سال

---

[۱] ملاحظہ ہو معاصر تاریخیں مثلاً تاریخ فرشتہ، تحفتہ الملوک، بادشاہ کے حالات اور اسکے اوصاف، اسکے کیرکٹر اور اسکے مشاغل کے متعلق اس وقت سے تفصیل دیجانے لگتی ہے جبکہ متولیوں کا دور دورہ ختم ہو جاتا ہے اور بادشاہ بہ نفس نفیس مہمات ملکی انجام دینے لگتا ہے۔ بچپن کے حالات بہت کم کھلتے ہیں۔

گذر جاتے ہیں۔ اس مختصر سے عرصے میں یہ تین متولیان ریاست یکے بعد دیگرے حاوی ہوتے گئے اور اپنی اپنی ڈھائی دن کی بادشاہت مناکر عملی سیاسیات کے منظر عام سے غائب ہو گئے۔ اس کے بعد دلاور خاں کی حکومت کا زمانہ آتا ہے اس نے کامل آٹھ سال بیجاپور پر حکمرانی کی۔ اس کے دور میں بادشاہ کی تعلیم و تربیت کی طرف خاص طور پر توجہ کی گئی۔ چونکہ دلاور خاں خود ایک عالم و فاضل آدمی تھا اس لئے اس کی توجہ اس طرف خاص طور پر مبذول رہی۔ اس نے نہ صرف بادشاہ کے تحصیل علم کا سامان کیا بلکہ مردانہ فنون اور کھیل کود کی طرف بھی ابراہیم کو راغب رکھا جو جسمانی حالت کو درست رکھنے کے لئے ضروری ہیں۔ اس نے اپنے دو بیٹوں کو بادشاہ کے اُستاد اور اتالیق مقرر کیا۔ ایک قرآن مجید اور دیگر عربی و فارسی کتابوں کی تعلیم دیتا تھا۔ دوسرا بادشاہ کے کھیل کود کے سامان کی فراہمی کا انتظام کرتا تھا اور چوگان بازی میں خود بادشاہ کا شریک رہتا۔ ان واقعات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دلاور خاں کے عہد میں بادشاہ کی دماغی اور جسمانی نشوونما کا خاص لحاظ رکھا گیا اگرچہ مزید معلومات اس سلسلے میں ہم نہیں پہنچتے لیکن یہ اندازہ لگانا غلط ہوگا کہ اس دور میں بادشاہ کی تربیت کی طرف اچھی توجہ کی گئی۔ اگرچہ یہ آٹھ سالہ دور اندرونی و بیرونی پریشانیوں سے پاک صاف نہ رہا لیکن پھر بھی دلاور خاں نے اپنی اُس ذمہ داری سے چشم پوشی نہ کی جو بادشاہ کی تعلیم و تربیت سے متعلق اس پر عائد تھی۔ ان توجہات کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابراہیم میں ایک لطیف، سنجیدہ اور اعلیٰ مذاق پیدا ہو گیا تھا جبکہ بہ نفس نفیس اس نے مہمات ملکی کی انجام دہی کی طرف توجہ کی۔

ابراہیم کو فنون لطیفہ سے خاص دلچسپی تھی اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان لطیف فنون کے واسطے وہ ایک نہایت ہی موزوں اور نازک طبیعت، قدرت کی طرف سے لیکر آیا تھا فنون لطیفہ میں بالخصوص اس کو موسیقی سے بہت لگاؤ تھا۔ مختلف تواریخ سے واضح ہے کہ

لہ۔ دلاور خاں کے کارناموں کا جہاں ذکر آئیگا اس پر کچھ مزید روشنی ڈالی جائیگی۔

وہ اس فن میں اپنے زمانے کا اُستاد تھا اور اکثر باکمال لوگ اس کے آگے زانوئے ادب تہہ کرنے کو باعث فخر و مباہات سمجھتے تھے اس کو موسیقی پر اتنا زبردست عبور حاصل تھا کہ اس نے ایک کتاب جو "نورس" کے نام سے موسوم ہے خاص اس فن پر تصنیف کی ہے اور اس کتاب پر مشہور شاعر ظہوری نے اپنا وہ مشہور دیباچہ لکھا ہے جو آج فارسی نثر کا ایک بہترین شاہکار تصور کیا جاتا ہے۔ بادشاہ چونکہ اس فن کا والہ و شیدا تھا اس کے دور میں موسیقی کو بڑی ترقی حاصل ہوئی اور ملک میں تین باقاعدہ موسیقی داں طبقے پیدا ہو گئے (۱) حضوری (۲) درباری (۳) شہری۔ حضوری وہ لوگ تھے جن کو خاص بادشاہ سے شرف تلمذ حاصل رہا ہو۔ درباری حضوریوں سے اکتساب کرتے تھے۔ اس دوسرے طبقے کا فرض تھا۔ (طبقۂ درباری کا) کہ عامۂ خلائق میں اس فن کو ہر دلعزیز بنائے۔ اور جو بھی اس فن کے مشتاق و قدرداں ہوں اُن کو اس لطیف فن کی تعلیم دیں (لیکن یہ واضح رہے کہ اس میں جبر کا پہلو قطعاً نہیں تھا اور نہ ہو سکتا تھا) بادشاہ نے بڑی فیاضی کے ساتھ علم موسیقی کی سرپرستی کی۔ ہر اہل کمال اور اہل فن کو سرکاری طور پر مالی امداد ملا کرتی تھی اور باقاعدہ تنخواہیں بھی مقرر تھیں[۲]۔

یہ تو پہلے ہی بتلا دیا گیا ہے کہ بادشاہ اس فن کا زبردست ماہر تھا بیان کیا جاتا ہے کہ وہ فطرتاً نہایت خوش گلو اور خوش آواز تھا اس خداداد آواز کے ساتھ اس کی محنت اور اس کے شوق نے اس کی موسیقی کی خوبیوں کو چار چاند لگا دیئے تھے۔ غرض وہ فن موسیقی کا والہ و شیدا، اس کا ماہر اور اس کا زبردست سرپرست تھا اور خوب دل کھول کر اس نے اس فن لطیف کی سرپرستی کی۔

تو لیت کے دور میں کہیں یہ ذکر نہیں آتا کہ بادشاہ کو اس فن کے سکھانے کا کوئی

۱۔ "نورس" ایک نایاب کتاب ہے جو ابراہیم سے منسوب کیجاتی ہے۔ "بساتین
۲۔ "بساتین السلاطین"

خاص انتظام کیا گیا تھا لیکن چونکہ ابراہیم کے زمام حکومت ہاتھ میں لینے کے بعد اس کی راگ کی دلچسپیوں اور اس کے موسیقی کے مشاغل کا ذکر آتا ہے اس لئے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس زمانے سے ہی وہ اس فن کا اکتساب کر رہا تھا اور کوئی تعجب نہیں کہ متولیان ریاست نے بادشاہ کو لہو ولعب میں مبتلا کر کے خود ہمیشہ حکومت پر قابض رہنے کی غرض سے ابراہیم کو ناچ، گانے کی طرف متوجہ کر دیا ہو مگر، بہرحال اس کا کوئی تاریخی ثبوت موجود نہیں کہ یہ دلچسپی متولیوں کی پیدا کردہ ہے لیکن یہ بھی صاف وصریح ہے کہ اسی زمانے سے ابراہیم اس فن کا اکتساب کر رہا تھا خواہ متولیان ریاست نے اس فن کو حاصل . . . . کرنے کی ترغیب دی ہو یا اس کو اس سے باز رکھنے کی کوشش کی ہو۔ اس لئے کہ یہ چیزیں ابتدا ہی سے حاصل کیجاتی ہیں۔ جب آواز پختہ ہو جائے تو اس میں کمال پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ علاوہ موسیقی کے خطاطی، مصوری اور نقاشی میں بھی بادشاہ کو کامل مہارت حاصل تھی۔ اس کی خوشنویسی کے متعلق "بساتین" کے یہ الفاظ ہیں "اگرچہ درآں زمان خوشنویسان اقالیم جمع آمدہ بودند۔ وے بادشاہ، بادشاہِ قلمہا بود۔ ثلث ونسخ ونستعلیق را بہ آں درجۂ حسن ومتانت رسانیدہ بود کہ برخطوط خوش قلمانِ عصر قلمِ نسخ کشیدہ۔"[1]

اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کیسا خوشنویس واقع ہوا تھا۔ اس کے ان فنون لطیفہ کی قابلیتوں سے جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اس کی نقاشی ومصوری کے کمال کا بھی کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔ ان فنونِ لطیفہ کی (جس کا خود وہ ایک زبردست ماہر تھا) اس نے خوب ہی فیاضی کے ساتھ سرپرستی کی مگر یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ اس کی فیاضیاں اور سرپرستیاں محض رنگیلے پن کی حد تک ہی تھیں بلکہ وہ دیگر علوم وفنون کا بھی بڑا سرپرست تھا چنانچہ اس کا دربار علماء وفضلاء و دیگر باکمال لوگوں کے وجود سے خالی نہ تھا۔ یہاں پر ان تمام کی تفصیلات دینا نہ تو ممکن ہے

[1] بساتین السلاطین۔

اور نہ ضروری کیونکہ اس باب میں ابراہیم کی قابلیتوں اور اس کے کیرکٹر سے بحث کیگئی ہے۔ سرسری طور پر اس کی علمی سرپرستی کا ذکر کیا گیا ہے، صرف چند قابل قدر ہستیوں کے نام گنوانے پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔ مولانا ملک قمی، ملا ظہوری، رفیع الدین شیرازی، محمد قاسم فرشتہ اور شاہنواز خاں جیسے باکمال لوگ اس کے دربار میں موجود تھے۔ انھوں نے اس بادشاہ کی سرپرستی میں اپنی علمی، ادبی، تاریخی اور فنی خدمات سے ملک کو سیراب کیا۔ ظہوری[1] جیسا کچھ بھی شاعر تھا اور شعراء میں جو کچھ بھی حیثیت اس کو حاصل ہے محتاج بیان نہیں۔ ملک قمی کا بھی شاعری میں کوئی معمولی درجہ نہیں۔ محمد قاسم فرشتہ اور رفیع الدین شیرازی اس زمانے کے زبردست مورخ ہیں اور انھوں نے جو کچھ بھی تاریخی خدمات انجام دی ہیں، وہ ہر حیثیت سے قابل قدر ہیں۔ شاہنواز خاں اس عہد کا ایک وزیر باتدبیر تھا۔ علاوہ اپنی مدبرانہ قابلیتوں کے وہ علوم وفنون کا بڑا مربی تھا چنانچہ محمد قاسم فرشتہ نے اپنی تاریخ کی تصنیف وتدوین میں اپنی اُس ممنونیت کا اظہار کیا تھا جو اس کو اس شخص سے تھی۔ مزید یہ کہ اس کو تعمیر کاری سے خاص لگاؤ تھا چنانچہ ابراہیم کے عہد میں نورسپور جو بسایا گیا اور جو حویلیاں اور بڑے بڑے مکانات بنائے گئے وہ اسی شخص کی دماغی کاوشوں کا نتیجہ تھے[2]۔ ان نامور قابل اور فاضل لوگوں کی اسکے دربار میں موجودگی اس بات کو ثابت کرتی ہے کہ وہ علم کا بڑا قدرداں تھا اور اس کی فیاضی نے دور دور کے علماء و فضلاء کو اس کے دربار میں جمع کر رکھا تھا۔ یہ لوگ اپنی خاموش اور بیش بہا خدمتوں سے بیجاپور کو علمی دولت سے مالا مال کر رہے تھے۔

---

[1] ظہوری نے اپنی کلیات میں ابراہیم عادل شاہ کی تعریف کے پُل باندھے ہیں۔ جگہ جگہ پر اسکے دیوان میں اس بادشاہ کی مدح سرائی کی گئی ہے۔ ملاحظہ ہو (کلیات ظہوری)۔

[2] شاہنواز خاں ابراہیم ثانی کا باتدبیر وزیر تھا۔ نورسپور کی تعمیر اُسی کے ہاتھوں پر ہوئی تھی۔ اس نے اپنا مکان اس انداز اور اس طرز کا بنایا تھا کہ لوگ دیکھ کر عش عش کرتے تھے جس سے اسکی تعمیر کاری کی قابلیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو بساتین السلاطین۔

یہاں ان لایق اور فاضل ہستیوں کا ذکر اس لئے کیا گیا کہ خود اُن کی موجودگی اس کے کیرکٹر پر ایک نہایت ہی اچھی روشنی ڈالتی ہے۔ وہ یہ کہ ان لوگوں کی سرپرستی سے اس نے بیجاپور کی بالواسطہ بڑی زبردست خدمت انجام دی۔ اُن کی سرپرستی کرنے کے معنیٰ یہ تھے کہ ملک میں علوم وفنون کی روشنی کو عام کیا جائے اور یہ فخر کچھ کم نہیں کہ ملک میں کوئی بادشاہ علم وفن کو یوں پھلنے پھولنے کا موقع دے اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ علمی معاملات میں نہایت سنجیدہ اور اعلیٰ مذاق رکھتا تھا جو لوگ اس کے دربار میں تھے وہ یقیناً منتخب اور دنیائے علم وادب کا ان کو عطر سمجھنا چاہیئے۔

متولیان ریاست

باب سوم

کامل خاں دکنی

کامل خاں دکنی | اس سے پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ جب اُمرائے دولت نے افضل خاں کو بادشاہ کی کمسنی تک متولی بنانا چاہا تو اُس نے صاف انکار کر دیا کیونکہ اس کو یقین تھا کہ بادشاہ کی کم عمری کی وجہ سے ملک میں بیسیوں فتنہ و فساد اُٹھ کھڑے ہوں گے اور اُن سب کا تدارک اور سد باب کوئی آسان کام نہیں۔ ان وجوہات کی بناء پر اُس نے مناسب سمجھا کہ معاملات ہی سے کنارہ کش ہو جائے۔ جب افضل خاں نے اس طرح انکار کر دیا تو اس امر کی ضرورت ہوئی کہ کسی دوسرے معتبر او سربرآوردہ شخص کو متولی سلطنت مقرر کیا جائے لہٰذا سب کی نظریں کامل خاں کی طرف اُٹھنے لگیں۔ اسوقت کامل خاں ملک میں ایک نہایت ممتاز حیثیت رکھتا تھا۔ یہ وہی شخص ہے جس نے علی عادل شاہ کو تخت نشین ہونے میں بڑی مدد دی تھی۔ جب شہزادہ علی اپنے باپ کے حکم سے قلعہ مرچ میں بعض شبہات کی بناء پر قید کر دیا گیا تو سکندر خاں قلعدار اور اس کے داماد کامل خاں دکنی کے (جو خفیہ طور پر شیعہ مذہب سے تعلق رکھتے تھے) حسن سلوک نے شہزادے کا دل موہ لیا اور وہ ان دونوں کے اچھے برتاؤ سے بہت خوش رہا تھی[1] کہ جب ابراہیم قریب مرگ ہو گیا تو انھیں کی کوششوں سے

---

[1] ۔ ابراہیم (اول) سنی تھا مگر علی عادل شاہ بچپن ہی سے شیعیت کی طرف مائل تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک روز بادشاہ ایک مجلس میں یہ کہہ رہا تھا کہ "خدا نے مجھے نیک توفیق عطا کی اور میں نے اپنے باپ دادا کا مذہب ترک کیا اور حنفی مذہب اختیار کر لیا"۔ اتفاق سے شہزادہ علی بھی حاضرین میں تھا نہایت شوخی اور بیباکی سے جواب دیا کہ "اگر از طریقہ پدر و جد گذشتن روش محمود و طریق پسندیدہ است فرور شد کہ فرزندان آنحضرت چنیں کنند"۔ بادشاہ برہم ہوا اور پوچھا "تو چہ مذہب داری" جواب "لا اکنوں مذہب بادشاہ دارم بعد ازیں خدائے سبحانہ و تعالیٰ عالم است"۔ فرشتہ ص ۳۴ مقالہ سوم روضۂ دوم ص ۷۔ بساتین السلاطین

اُمراء و اعیانِ دولت رفتہ رفتہ علی کے جھنڈے کے نیچے جمع ہونے لگے۔ ان تمام کارروائیوں اور کوششوں میں کامل خاں پیش پیش تھا جو اس وقت محض ایک تھانہ دار کی حیثیت رکھتا تھا مگر چونکہ سکندر خاں قلعدار مرج کا داماد تھا اسکے اثرات اور اسکی حیثیت کم نہ تھی۔ جب ان وفاداروں کی کوششوں سے علی عادل شاہ اپنے باپ ابراہیم کے انتقال پر خود بادشاہ ہو گیا تو وہ اپنے ان آڑے وقت کے ساتھیوں کو بھولا نہیں بلکہ انکے ساتھ نہایت اچھا سلوک کیا۔ اس سلسلے میں کامل خاں دکنی کو زمرۂ اُمراء میں داخل کر لیا گیا اور مناصب و جاگیر[1] عطا ہوئے۔

[1] قلعہ کلمبر اس کو جاگیر میں دیا گیا تھا (بساتین ص ۱۴۳) اسی سلسلے میں مصنف بساتین السلاطین نے بحوالۂ رفیع الدین شیرازی ایک واقعہ لکھا ہے جس سے ایک طرف کامل خاں کے کیرکٹر پر روشنی پڑتی ہے تو دوسری طرف علی عادل شاہ کے قتل کے متعلق جو روایتوں میں اختلاف ہے اسکا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ وہ واقعہ حسبہٖ پیش کیا جاتا ہے۔
"رفیع الدین شیرازی می گوید مشہور چنیں شد کہ قتل علی عادل شاہ بہ اشارۂ کامل خاں بود و سبب آں چنیں بود کہ چوں کامل خاں بر منصب کار ملکی قرار گرفت تجبر و تکبر بسیار بہم رسانید۔ خود رائی را بیشتر کار فرمود۔ سیدی بود از ساکنان قلعہ کلمبر کہ بہ جاگیر کامل خاں مقرر گشتہ، متعلقانش بنا بر غرض خود آں سید را مصادرہ کردہ در پا زنجیر کشیدہ در حبس داشتند شکایت ایں ظلم مکرر بہ سمع عادل شاہ رسیدہ بود۔ عادل شاہ چہار نوبت بہ کامل خاں فرمود کہ ایذائے سادات جائز نیست او را بگذارید۔ بہ سمع قبول نیاورد و بر امر سلطانی عمل نکرد و بہ تعلل گزرانید۔ تا عادل شاہ روزے بجائے ہمی رفت و کامل خاں نیز ہمراہ بود۔ ناگاہ پدر پیر آں سید محبوس آنجا خود را رسانیدہ فریاد برآورد کہ عالم پناہا کامل خاں ستم عظیم برپا کردہ فرزندم را از مدت مدید در حبس داشتہ۔ عادل شاہ بہ مجرد شنیدن نالہ پیر ضعیف از جا رفت و غضب عظیم جوش آورد یک لکد بزوری بہ وے حوالہ کرد چناں کہ کامل خاں بر رفیع الدین شیرازی کہ پس پشت او بود بیفتاد۔ باز بادشاہ اگرچہ تدارکات آں بہ نوازشات متنوعہ نمود و منصب او بحال گذاشت اما وی کہ آں کینہ در دل پر کین ذخیرہ داشت تا بہ وقت فرصت بہ اشارہ قتل بادشاہ نمود۔" اگر یہ واقعہ صحیح ہے تو علی عادل شاہ کا حقیقی قاتل کامل خاں ٹھہرتا ہے۔ ابراہیم زبیری تو فرشتہ کے بیان کردہ قصہ (خواجہ سرا والا قصہ) کو غلط سمجھتا ہے اور رفیع الدین کے بیان کو تسلیم کرکے قتل کی اصل وجہ یہی بتلاتا ہے۔ یہاں پر قتل کی مختلف روایتوں پر تفصیلی بحث ممکن نہیں اور نہ ضروری۔ محض کامل خاں کے کیرکٹر پر روشنی ڈالنے کے لئے یہ چیز بیان کی گئی۔

اس طرح وہ علی عادل شاہ کے زمانے میں برابر ترقی کرتا رہا اور اپنا رسوخ بہت بڑھالیا حتیٰ کہ بادشاہ کے انتقال کے وقت وہ سلطنت بیجاپور کے اُمرائے کبار میں شمار ہونے لگا۔ اس اعتبار سے یہ طے پایا کہ کامل خاں دکنی ہی کو اب متولیٔ سلطنت مقرر کیا جائے چنانچہ فرشتہ اس کی اس غیر معمولی ترقی کے متعلق یوں رقمطراز ہے "کامل خاں دکنی کہ از اُمرائے کبار آں دولت خانہ بود چناں کہ گذشت در قلعہ مرج نسبت بہ شاہ غفراں پناہ علی عادل شاہ نہایت اخلاص ساختہ از محرمان امور سلطنت گردیدہ بود۔ دریں وقت بر مہمات امور ملکی و مالی متولی گشتہ متعلقان معتمد خود را در حوالی وحواشی بادشاہ بہ جہت خدمت محافظت باز داشت"[1]۔ غرض جوں ہی کامل خاں اس اہم خدمت پر فائز ہوا اپنے آپ کو زیادہ مستحکم و مقتدر بنانے کی فکر میں رہنے لگا اور اس کے لئے یہ ترکیب نکالی کہ حکومت کے تمام بڑے بڑے عہدوں اور مناصب پر اپنے متعلقین اور معتمدین کو مقرر کیا جائے چنانچہ خاص قلعہ بیجاپور کی قلعداری پر اپنے ایک خاص معتمد کو فائز کر دیا تاکہ وہ براہ راست اس کے ماتحت رہے اور بلاچون وچرا اس کے احکام کی تعمیل کرے اور اس کے ساتھ ساتھ اس نے اپنے اقتدار کی توسیع کی غرض سے جا و بیجا حرکتیں بھی شروع کر دیں۔ اس پر ہی اکتفا نہ کیا بلکہ خزانہ عامرہ پر بھی قابض ہو گیا متولی ہونے کی حیثیت سے خزانہ اس کے ماتحت تو تھا ہی مگر اس نے یہاں ایسے انتظامات کرنے شروع کر دیئے جس سے کہ لوگوں کے دلوں میں اس کے ارادوں کی نسبت شُبہ پیدا ہونے لگا۔ بیش قیمت زر وجواہرات کو جو خزانے میں بھرے پڑے تھے بعض صندوقوں میں سے نکال کر دوسرے صندوقوں میں رکھوالیا۔ جب رفیع الدین شیرازی نے (جو اس زمانے میں حوالداری خزانہ کے عہدے پر مامور تھا اور جس کی تاریخ تحفۃ الملوک اس زمانے کی بہترین ہمعصر تاریخ ہے جس سے اس مقالے کے سلسلے میں بہت کچھ استفادہ کیا گیا ہے) ان جواہرات کی فہرست تیار کرنی چاہی تو اسے اس کام سے روک دیا۔ اس سے غالباً اس کا یہی ارادہ تھا کہ اُن بیش بہا اشیاء پر خود قابض و متصرف ہو جائے پھر اس کی

[1] فرشتہ۔ مقالۂ سوم روضۂ دوم

مزید طرہ یہ ہوا کہ اس نے حرم شاہی کی عورتوں کی تنخواہیں بند کر دیں اور خزانہ دار کو حکم دیا کہ جتنی تنخواہ یاب عورتیں ہیں ان کی ایک فہرست تیار کیجائے اور اس کے حضور میں پیش ہو کہ اجرائی تنخواہ کی منظوری دے۔ اپنی اس کارروائی کو یہاں تک پھیلایا کہ خود حرم میں جا کر تنخواہیں تقسیم کرتا محل کی بیس عورتوں کو محل سے نکال دیا اور ان کے رہنے کے لئے دوسری جگہ تجویز کر دی۔ گو یہ حرکتیں بظاہر معمولی تھیں مگر ان کے اثرات اور ان کے نتائج اس کے حق میں بہت مضر ثابت ہوئے۔ شاہی محل میں کامل خاں کے خلاف بہت کچھ احتجاج کیا گیا اور ہر ایک کو اس کی جانب سے نفرت پیدا ہو گئی۔ اور حقیقت بھی یہ ہے کہ کامل خاں کی یہ حرکتیں ایسی نہ تھیں کہ جن سے درگذر کیا جاتا یا جن سے اس کی بدنیتی اور فاسد خیالی ظاہر نہ ہوتی ہو! ان انتظامات سے غالباً اس کا مقصد یہ تھا کہ سب کو براہ راست اپنے ماتحت کر کے اپنے اقتدار میں اضافہ کرے۔ اور ملک میں کوئی شخص ایسا نہ ہو جو اسکی مخالفت کر سکے اور خود تمام سیاہ و سفید کا مالک ہو جائے! ابراہیم کی طفولیت کی حد تک تو اسکو بحیثیت متولی کے اختیارات کلی حاصل رہیں گے مگر اس وقت کے لئے پیش بندی ضروری تھی جبکہ ابراہیم معاملات سلطنت اپنے ہاتھ میں لینے کے قابل ہو جائے۔ مطلب یہ تھا کہ اسے پہلے ہی سے بیدست و پا کر دیا جائے کہ وہ اس کے ہاتھ میں محض ایک کٹھ پتلی کی حیثیت سے رہے اور خود اس کا اقتدار حسب حال رہے۔ اور معاملات ملکی پر اس وقت بھی اسی طرح اس کا قبضہ رہے جیسا کہ بادشاہ کی کمسنی میں اس کو حاصل تھا۔ اس کے لئے ضرورت اس امر کی تھی کہ ملک ان تمام بہی خواہان ریاست سے صاف کر دیا جائے جو اس کے مقابلے میں بادشاہ کی حمایت پر کسی وقت بھی تیار ہو سکتے ہیں۔ غرض کامل خاں کی ان کارروائیوں پر جب نظر ڈالی جاتی ہے تو سوائے اس کے اور کوئی نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا کہ حکومت کا اس کو ایسا چسکا لگا تھا کہ اس سے جدا ہونا اسے سخت ناگوار معلوم ہو رہا تھا اور محض اپنی اس حکومت کو برقرار رکھنے کے لئے اور اس کو مزید استحکام بخشنے کی غرض سے اس نے یہ طرز عمل اختیار کیا تھا اگرچہ ہم کو کہیں صاف طور پر اس کا ذکر نہیں ملتا کہ اس نے [illegible] تخت ہی [illegible] کرنے کا ارادہ کیا ہو مگر پھر بھی اس کی ان کارروائیوں سے شبہ

ہوتا ہے کہ اس کے ارادے نیک نہ تھے۔ وہ صرف اپنا راستہ صاف کررہا تھا اور ایسے انتظامات میں
مشغول تھا جن سے کہ اس کی طاقت روز افزوں ہونے کی توقع تھی اگر وہ اپنے آپ کو پورے طور پر
مقتدر کر لینے میں کامیاب ہو جاتا تو عادل شاہی خاندان کو اس کی جانب سے سخت خطرہ تھا۔
اس زمانے میں مقتدر وزراء و امراء کا تخت و تاج حاصل کر لینا کوئی نئی بات نہ تھی
چنانچہ اسمٰعیل عادل شاہ کی کم عمری میں کمال خاں نے اسی قسم کی کوشش کی تھی گو وہ ناکام رہا
مگر اس کی مثال تو کامل خاں دکنی کے سامنے موجود تھی پھر کوئی وجہ نہیں کہ کامل خاں رفتہ
رفتہ اپنے آپ کو مقتدر کر کے سلطنت کا مالک نہ بن جائے! اگر ہم یہ بھی مان لیں کہ کامل خاں کے ارادے
سلطنت دبا لینے کے نہ تھے تو کم از کم یہ تو صاف ظاہر ہے کہ وہ اپنے تئیں اتنا با اقتدار بنا لینا
چاہتا تھا کہ ابراہیم کے سن شعور کو پہنچنے کے بعد اسے بآسانی اس کی حاصل کردہ قوت سے علحدہ نہ کرسکے
کامل خاں کے غالباً بلکہ یقیناً یہی اغراض تھے ورنہ ان انوکھے انتظامات اور کارروائیوں کا کوئی
نصب العین تھا اور کچھ تو غرض و غایت تھی جس کے لئے یہ کارستانیاں ہو رہی تھیں۔ بہرحال کامل خاں
کے خواہ کچھ ہی ارادے کیوں نہ ہوں مگر زیادہ عرصے تک وہ اپنے منصوبوں کو پورا کرنے میں مصروف
نہ رہ سکا کیونکہ اس کے غرور اس کی سختیوں اور امرا کے ساتھ اس کے برُے سلوک نے بہت جلد ملک
میں اسے بدنام کر دیا۔ اکثر امراء و اعیان اس کے خلاف ہو گئے اور اس کی بڑھتی ہوئی طاقت کو
مشتبہ نگاہوں سے دیکھنے لگے اور محض موقع کے متلاشی تھے کہ اس کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیں۔
یہ موقع بھی بہت جلد انھیں ہاتھ آیا۔ کامل خاں نے اپنی انتہائی ناعاقبت اندیشی سے چاندبی بی کو
اپنا دشمن بنا لیا جو اس وقت ملک میں ممتاز ترین حیثیت رکھتی تھی اور غیر معمولی طور پر ہردلعزیز
تھی۔ اس کے ساتھ سختی کا برتاؤ کرنے لگا اور اس کی شان میں کچھ گستاخیاں بھی کیں چنانچہ فرشتہ
لکھتا ہے کہ کامل خاں "از امتنام شراب استقلال دو روزہ بنجو دو مغرور گشتہ بنسبت چاندبی بی
در مقام بے ادبی شدہ و آں ضعیفۂ دوراں و معصومۂ زماں آتش غضب و انتقام برافروختہ
در صدد تقییع وے گردید[1]"۔ جب صورت حال یہ پیدا ہو گئی تو کامل خاں کا اور سلطنت پر زیادہ

[1] ۔ فرشتہ۔ مقالہ سوم، روضۂ دوم

عرصے تک حاوی رہنا مشکل ہو گیا جوں ہی چاند بی بی نے اُمراء کو اشارہ کیا سب کے سب کامل خاں کے مخالف اور اس کی بربادی کے درپے ہو گئے۔ سب سے پہلے چاند بی بی نے حاجی کشور خاں کو اپنی مدد پر طلب کیا[1]۔ یہ شخص کمال خاں کا بیٹا تھا اور ممتاز ترین اُمراء میں شمار ہوتا تھا۔ چاند بی بی نے اُسے خفیہ طور پر کہلا بھیجا کہ "کامل خاں وکیل السلطنت نمکحرامی پر آمادہ ہے اس کی سخت گیریوں اور گستاخیوں سے میں تنگ آگئی ہوں۔ میری خواہش یہ ہے کہ اس کو اس عہدے سے الگ کر کے تجھے فائز کروں۔ لہذا اگر کچھ ہمت مردانہ رکھتا ہے تو کامل خاں کی نمکحرامیوں اور بدعنوانیوں سے ملک کو نجات دے ورنہ بہتر یہ ہے کہ زنانہ لباس پہنکر[2] چرخہ اور پونی لیکر خانہ نشیں ہو جا۔"

کشور خاں کو جب یہ پیام پہنچا تو اس کو خوشی بھی ہوئی اور کچھ شرم بھی آئی اور اس نے فوراً تہیہ کر لیا کہ کامل خاں کو نائب السلطنتی کے عہدے سے برطرف کر دے، چنانچہ اس نے اپنے ارد گرد چند ہمخیال لوگوں کو جمع کر لیا جو ہر معاملے میں اس کا ساتھ دینے کو تیار تھے اس خفیہ سازش کی خبر کامل خاں کو بھی پہنچ گئی مگر اس کی آنکھوں پر غفلت کے پردے پڑے ہوئے تھے اور اسکی بربادی کے دن قریب آچکے تھے کہ باوجود اطلاع ہونے کے نہ اس نے اس سازش کے تدارک کے لئے ہی کچھ انتظام کیا اور نہ ہی اپنے طرز عمل میں کسی قسم کی تبدیلی کی۔ اس کا غرور اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ وہ دعویٰ کرنے لگا کہ "سازشی میرا کیا بگاڑ سینگے۔ سلطنت میری ہے اور میں سلطنت کا وارث ہوں وغیرہ[3]۔"

---

[1] بساتین السلاطین۔

[2] بساتین کے اسکے متعلق یہ الفاظ ہیں "چاند بی بی لباس زناں و پنبہ و چرخہ پیش حاجی کشور خاں پسر کمال کشور خاں بزرگ فرستاد"

[3] چنانچہ اسکی تفصیل تاریخ میں یوں درج ہے "باوجودیکہ اخبار بگوش کامل نمی رسد بہلا دیئے اصلاح نیامد بلکہ بازیچہ خیال کرد و با محرمان خویش گفت ببینید کہ مردم چہ سان دنبال گزفتہ مرامی ترسانند و خیال کنند کہ من ازیں افسانہا ترسان شوم و دست از کار بردارم ایں چہ معنی دارد کتا سان کہ از ارزال اقوام برائے میراث سروجان فدامی سازند من چہ گونہ ازیں کار رو گردم و مضائقہ نکنم کہ وارث سلطنت منم و ایں سلطنت میراث من است ازیں قسم مالیخولیات بسیاری گفت" بساتین السلاطین

کامل خاں ان خرافات میں مبتلا تھا کہ کشور خاں نے اس عرصے میں اپنی تدابیر کو عملی جامہ پہنا کر چار سو مسلح سواروں کے ساتھ قلعہ پر آ دھمکا۔ اس وقت کامل خاں کاروبار سلطنت میں مشغول تھا اور سبز محل میں اجلاس کر رہا تھا۔ کشور خاں نے آتے ہی پہلے قلعدار کو گرفتار کیا۔ قلعہ کے دروازے بند کر دیئے اور پھر متوئی سلطنت کی تلاش میں سبز محل کا رُخ کیا۔ اسی اثناء میں کامل خاں کو معلوم ہو گیا کہ کشور خاں اس کی گرفتاری کے لئے چار سو سواروں کے ساتھ قلعہ میں داخل ہو گیا ہے۔ اس نے فوراً حرم سرا کا رُخ کیا کہ وہاں جاکر پناہ لے اور چاند بی بی سے مدد کی درخواست کرے مگر راستے میں کسی خواجہ سرا نے اُسے آگاہ کیا کہ یہ ساری آگ چاند بی بی کی لگائی ہوئی ہے اور وہ تیرے خون کی پیاسی ہے۔ اسکے پاس جانا موت کے منہ میں جانا ہے۔ یہ خبر سُنتے ہی وہ ہراساں و پریشاں قلعہ کی دیوار پھاندکر خندق میں کُود پڑا جو پانی سے لبریز تھی۔ بدقت تمام وہاں سے پیر کر کنارے پر پہنچا۔ ابھی اسکی زندگی کے چند گھنٹے باقی تھے راستے میں کسی نے اُسے پہچانا نہیں وہ چھپتا، چھپاتا شہر کے دروازہ امام تک پہنچ گیا۔ مگر بدقسمتی سے دروازہ بند تھا اب باہر جانے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ مگر دیوار کا پھاندنا آسان کام نہیں تھا بڑی مشکلوں سے دیوار پر چڑھ گیا اور وہاں سے اپنی دستار کمر بند اور شال سے رسّی کا کام لیکر اس کو دیوار کے ایک کنگرہ سے مضبوط باندھ دیا اور اس کے ذریعے نیچے اتر پڑا۔ غرض وہ ان مشکلوں سے اپنی جان بچا کر فی الحال کشور خاں کے سپاہیوں کے نرغے سے نکل تو گیا مگر اس کی زندگی کے دن ختم ہو چکے تھے گھر پہنچ کر سات آٹھ سپاہیوں کیساتھ احمد نگر کو فرار ہو رہا تھا اور ابھی چار میل طے کرنے نہ پایا تھا کہ گرفتار ہو گیا اور وہیں اس کو قتل کر دیا گیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے لڑتے ہوئے بہادری سے جان دی اس طرح کامل خاں کا زمانۂ حکومت اس کی سخت گیریوں اور بدعنوانیوں کی وجہ سے بہت جلد ختم ہو گیا۔ مشکل سے دو مہینے دس روز اس نے حکومت کی ہوگی کہ موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔

کامل خاں کا کیرکٹر کامل خاں کے جو حالات اوپر دیئے گئے ہیں اُن کے مطالعے سے اسکے کیرکٹر کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ اس نے محض ایک تھانہ دار کی حیثیت سے ترقی کی اس کی ذاتی کوششوں اور

اور منتوں کی مرہون منت ہے۔ علی عادل شاہ کو اس نے اور اس کے خسر نے بادشاہ ہونے
میں کیا مدد دی کہ اُن کی قسمت جاگ اُٹھی۔ یوں بھی کامل خاں کا خسر مرج کا قلعدار ہونے کے
اعتبار سے خاصا رسوخ رکھتا تھا اس زمانے میں قلعداری کا عہدہ نہایت اہم تصور کیا جاتا
تھا قلعدار کے ماتحت، قلعہ کی حفاظت کے لئے ہمیشہ تھوڑی بہت فوج رہتی تھی اور وہ قلعہ کی
حفاظت کا ذمہ دار تصور کیا جاتا تھا۔ کامل خاں کی خوش قسمتی تھی کہ قدرت نے اسے ایک ایسا موقع
عطا کر دیا کہ جس سے فائدہ اُٹھا کر اس نے ترقی کی یعنی علی عادل شاہ کا زمانہ شہزادگی میں قید
کیا جانا اور وہاں (قلعہ مرج) میں کامل خاں کی موجودگی اس کی اور اس کے خسر کی کوششوں سے
علی عادل شاہ کا بادشاہ ہونا، یہ ایسی چیزیں تھیں کہ بادشاہ کو اپنے محسن کا بڑا خیال ہو گیا چنانچہ
اسی بناء پر اسے اس قدر جلد ترقی عطا کی گئی اور زمرۂ اُمراء میں شامل کر لیا گیا۔ جاگیریں دی گئیں،
مناصب عطا ہوئے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ جوں جوں وہ ترقی کرتا گیا اسی اعتبار سے اس میں
خشونت و رعونت پیدا ہوتی گئی وہ اپنے ماتحتین کے ساتھ نہایت سخت اور برا برتاؤ کرتا
تھا اور اس کی خصوصیت یہ تھی کہ کم لوگوں کو خوش کرتا اور زیادہ سے بیر رکھتا اور ان کو اپنا
دشمن بنا لیتا تھا۔ یہی خصوصیات دراصل اس کے زوال کا باعث ہوئیں (اپنی جاگیر میں بے وجہ
ایک سید زادہ کو محبوس کر دینا اور اس کے خاندان پر ظلم وستم کرنا جس کا ذکر اس سے پہلے
کیا گیا ہے) اس کی بدمزاجی وستم آرائی کی دلیل ہے اگر رفیع الدین شیرازی کے بیان کردہ
واقعہ کو صحیح تسلیم کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ سخت کینہ پروری تھا اور اپنے بادشاہ،
اپنے آقا اور اپنے محسن کا قاتل ٹھہرتا ہے متولی سلطنت ہو جانے کے بعد سے اسکی بدمزاجیوں
اور سخت گیریوں میں اور اضافہ ہوتا گیا۔ تمام اعیان وارکان دولت میں وہ ہر دلعزیز
نہ تھا اگرچہ اس کے حوصلے بڑے اور ارادے اونچے تھے جن کو عملی جامہ پہنانے میں وہ سخت ناکام
رہا۔ اس کی بعض کارروائیوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں سیاست دانی اور تدبر کا مادہ کم تھا
معاملہ فہمی اور موقع شناسی کی خصوصیات ایسے شخص میں قطعاً ضروری ہیں جس کے ہاتھ میں

نظم ونسق سلطنت ہو۔ اور یہ خصوصیات کامل خاں میں مفقود تھیں اس کا بدیہی ثبوت یہ ہے کہ جس وقت اس کو یہ خبر لگی کہ کشور خاں اُس کے مقابلے کے لئے تیار ہو رہا ہے تو بجائے اسکے کہ اُس کی سازش اور اُس کی کوشش کا ابتدائی منازل میں خاتمہ کر دیا جاتا اس نے اپنے دشمنوں کو اتنا موقع دیدیا کہ وہ اپنے آپ کو مستحکم کرلیں۔ علاوہ ازیں کوئی ہشیار اور باتدبیر وزیر اس ابتدائی زمانے میں جبکہ اس کے پیر اچھی طرح جم نہ سکے ہوں، ایک ہردلعزیز اور باوقار ملکہ سے بگاڑ اور دشمنی پیدا نہیں کرلیتا مگر کامل خاں کی یہ سراسر حماقت اور انتہائی ناعاقبت اندیشی تھی کہ اس نے چاند بی بی جیسی حیثیت والی ملکہ کو اپنا دشمن بنا لیا قبل اس کے کہ اس کے مقابلے کی تاب اُس میں پیدا ہو جائے۔ غرض بحیثیت مجموعی کامل خاں کے کیرکٹر کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ حکومت کا شوقین، دولت کا لالچی، تدبّر سے عاری، موقعہ شناسی اور معاملہ فہمی کے نازک اصولوں سے ناواقف تھا مگر ان کمزوریوں کے مقابلے میں اُس میں بہادری اور حوصلہ مندی کے جذبات کی کمی نہ تھی۔ گو سخت گیریوں اور ناعاقبت اندیشیوں کی وجہ سے اس کا کام بگڑ گیا مگر بہادری، حوصلہ مندی اور دیگر ایسی خصوصیات میں وہ اپنے زمانے کے کسی آدمی سے شاید ہی کم ہوگا۔ دراصل بلند حوصلوں اور ذاتی بہادری نے ہی اُسے اُس رتبہ تک پہنچایا مگر ناعاقبت اندیشی، خشونت، رعونت اور بددماغی نے اُسکی مٹی برباد کی۔

متولیان ریاست

باب چہارم

کشور خاں

کشور خاں کا عروج

حاجی کشور خاں کمال کشور خاں کا بیٹا تھا[1] کمال کشور خاں نے علی عادل شاہ کے زمانے میں بڑے کارہائے نمایاں کئے تھے۔ اسی کے صلہ میں بادشاہ نے اسے اسد خاں لاری[2] کے منصب اور علم سے سرفراز کیا تھا۔ اور اس کی ہر طرح حوصلہ افزائی کی تھی اس طرح سے وہ عالی مرتبت اور بلند پایہ امرائے سلطنت میں شمار ہونے لگا تھا مگر علی عادل شاہ کے زمانے میں ہی مرتضیٰ نظام شاہ کے مقابلے میں قلعہ دہارور میں مارا گیا۔ اب ابراہیم عادل شاہ ثانی کے زمانے میں اس کے بیٹے حاجی کشور خاں کو عروج نصیب ہوا کیونکہ چاند بی بی نے کامل خاں کو منصب وکیل السلطنت سے علیحدہ کرنے کے لئے اس کو اپنی مدد پر طلب کیا تھا۔ اور وہ کامل خاں کو نکال باہر کرنے میں کامیاب بھی ہوا۔

منصب وکالت کے مختلف دعویدار

جب کامل خاں قتل ہوگیا تو منصب وکالت کے بارے میں جھگڑے پیدا ہوگئے اسلئے کہ اس وقت اس منصب کے چار پانچ دعویدار تھے۔ سب سے پہلا دعویدار تو کشور خاں ہی تھا اور بالخصوص اس وجہ سے کہ اسی کی کوششوں سے کامل خاں دکنی کا خاتمہ ہوا تھا۔ اور خود چاند بی بی نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ کامل خاں دکنی کو منصب پیشوائی سے (عموماً بیجاپور میں پیشوائی اور وکیل السلطنت کے عہدے مترادف سمجھے جاتے تھے یا بالفاظ دیگر ایک ہی عہدے کے یہ دو مختلف نام تھے) معزول کرنے میں کامیاب ہو جائے گا تو اسے خود اس اعلیٰ منصب پر فائز کر دیا جائے گا۔ چنانچہ جو الفاظ چاند بی بی نے اسے کہلا بھجوائے تھے وہ یہ تھے "کامل خاں لائق منصب جلیل القدر وکالت نیست و

[1] کشور خاں ابن کمال کشور خاں" بساتین السلاطین۔

[2] یہ وہ اسد خاں لاری ہے جو کبھی دکن میں ایک خاص شخصیت تھی اور ابراہیم اول کے دور کا اک بلند پایہ امیر تھا۔

ایں میراث پدر نیست۔ بتو رجوع نمودم[له] برآں متصرف شو۔"

چاند بی بی کے ان وعدوں سے کشور خاں کی ہمتیں بڑھ گئیں تھیں! وراس نے اسی امید پر سرگرمی دکھائی تھی کہ کامل خاں کے بعد پیشوائے سلطنت مقرر کیا جائیگا مگر جب یکبارگی کامل خاں نکال دیا گیا اور اس کا قتل عمل میں آیا تو اس عہدے کے نئے نئے دعویدار پیدا ہوگئے، اور لطف یہ کہ اُن کے ان دعوں سے اغماض اور لاپروائی اس لئے برتی نہیں جاسکتی تھی کہ وہ طاقتور اور جلیل القدر اُمرائے دولت عادل شاہیہ سے تھے۔ ان کے نام حسب ذیل ہیں (۱) مرتضیٰ خاں انجو۔ (۲) شاہ قاسم جو مرتضیٰ کا بھائی تھا۔ (۳) غالب خاں سرنوبت (۴) اور معتبر خاں ان چار پانچ دعویداروں میں رات بھر خوب بحثا بحثی رہی لیکن کچھ نتیجہ نہ نکلا تمام اُمرا اور اعیان دولت بھی اس مجلس شوریٰ میں شریک تھے۔ ان چار پانچ دعویداروں میں ایسی معاصرانہ چشمکیں رقابتیں اور دشمنیاں تھیں کہ کچھ بنائے نہیں بن پڑتا تھا۔ اور اس کا تصفیہ نہیں ہو سکتا تھا کہ کس شخص کو کس عہدے اور کس منصب پر فائز کیا جائے۔ غرض ان کج بحثوں میں چار پانچ روز گذر گئے مگر ہنوز روز اول کا مضمون تھا کوئی اطمینان بخش تصفیہ کی امید ہی نہ تھی حتیٰ ایں کہ ان میں آپس میں کشت وخون کی نوبت پہنچی۔ افضل خاں جو اک نہایت ہی دانا اور ہشیار آدمی تھا اور ان تمام جھگڑوں سے خود کو علیحدہ رکھا تھا گھر بیٹھے سب کی خبر رکھتا تھا جب کشور خاں نے دیکھا کہ معاملات دن بدن ابتر ہی ہوتے جارہے ہیں اور ان کے سلجھاوے کی کوئی امید نہیں تو خفیہ طور پر اک اندھیری رات افضل خاں کے گھر پہنچا اور التماس کیا کہ "میں تربیت یافتہ و لطف پروردہ عالیجناب ہوں۔ مجھے آپ کی شاگردی کا بھی فخر حاصل رہا ہے۔ اور اس وقت میرا بنا بنایا کام بگڑا جارہا ہے آپ ایسے وقت میں میری مدد فرمائیں۔ اور کچھ استادانہ شفقت سے کام لیں کیونکہ اس وقت میرے دوست بھی دشمن ہو چلے ہیں اور میرے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔ آپکے اعزازات اور اشارات ایسے ہیں کہ آپ کی مدد سے میرا کام بن سکتا ہے۔" جب افضل خاں نے ان تمام گزارشات کے

[له] فرشتہ و بساتین السلاطین۔ الفاظ بساتین السلاطین کے ہیں۔

باوجود بھی کوئی توجہ نہیں کی تو کشور خاں نے کہا کہ آپ اس ریاست ابد مدت کے نمک خوار قدیم ہیں اور ریاست کے لئے یہ وقت نہایت نازک ہے کئی مار ہائے آستین موجود ہیں جو سلطنت کی کشتی ہی اُلٹ دینا چاہتے ہیں اگر اس وقت بھی کنارہ کشی کی جائے تو انتہائی نمک حرامی ہوگی۔ غرض بڑی دیر سمجھانے کے بعد افضل خاں راضی ہوگیا اور کشور خاں کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا۔ جب دوسرے دن پھر مجلس مشورت منعقد ہوئی تو غالب خاں نے (جو کشور خاں سے مل گیا تھا) مرتضیٰ خاں انجو اور اُس کے بھائی شاہ میر قاسم کو مجلس سے اُٹھا کر ایک طرف کو لے گیا جیسے کوئی راز کی بات کہنی ہو۔ دراصل یہ سازش تھی جو کشور خانیوں نے آپس میں کرلی تھی اور جس کا مقصد یہ تھا کہ مخالفوں کو دھوکہ میں لاکر کسی طرح قید کرلیں اس وقت مخالف فریق کے رہبر مرتضیٰ خاں انجو اور شاہ قاسم تھے اسی غرض سے غالب خاں نے اپنی سکھائی پڑھائی تدبیر پر عمل کر کے عین مجلس میں یہ طرز عمل اختیار کیا۔ یہ دونوں خالی الذہن تھے اُس کے دھوکہ میں آگئے اُٹھ کر ساتھ ہولئے، وہاں تو پہلے ہی سے انتظام تھا جیسے ہی ان دونوں نے اُس مقام سے قدم باہر رکھا جہاں پر کہ مجلس مشورت منعقد ہو رہی تھی وہ قید کر لئے گئے۔ دو تین دن کے بعد ان کو پا بزنجیر کر کے قلعہ روانہ کر دیا گیا۔ جب ان دو زبردست دشمنوں پر قابو پالیا گیا تو پھر میدان صاف تھا معتبر خاں اور اُس کے بیٹوں کو جلاوطن کر دیا گیا۔ یہ جو یہاں سے فرار ہوا ہے تو پھر اکبر بادشاہ کے ہاں پہنچکر ہی اُس نے پناہ لی اس طریقے سے اس سازش کی بدولت کشور خاں کے مخالفوں کا قلع قمع ہوگیا۔ اور وہ نہایت اطمینان کے ساتھ پیشوائی کے عہدے کو اپنے قبضے میں کر کے معاملات ملکی کی طرف متوجہ ہوا۔ چاند بی بی نے بھی اس کی پیشوائی کو تسلیم کر لیا۔

سازش منصب وکالت کے بارے میں جو بحث طول کھینچی اُس کی اصل وجہ یہ تھی کہ ان اُمراء کے خیالات میں سخت اختلاف پیدا ہوگیا تھا۔ مخالف گروہ یہ چاہتا تھا کہ سرے سے نئے انتظامات عمل میں آئیں۔ یہ ایک قسم کی سازش تھی جو کمسن بادشاہ ابراہیم کے خلاف کی جا رہی تھی۔ اس خفیہ سازش کا علم کشور خاں کو ہوگیا تھا اور اس سازش کے مدد و معاون وہی لوگ تھے جن کا اوپر ذکر کیا گیا یعنی مرتضیٰ خاں انجو شاہ قاسم معتبر خاں وغیرہ۔ ان لوگوں کی خواہش تھی کہ ابراہیم اور اُس کی والدہ کو مکہ معظمہ روانہ کر دیا جائے اور ابراہیم کو معزول کر کے اُس کی جگہ پر "پسر میاں علی جو اسمٰعیل عادل خاں کا برادر زادہ" تھا تخت نشیں کر دیں اور ان ہوا خواہان دولت کو

جو ابراہیم کے ساتھ وابستہ ہیں یا تو اُن کو مقید کیا جائے یا قتل کر وا دیا جائے چنانچہ اُن کا ارادہ تھا کہ شاہ فتح اللہ[1] کو (جن کی اس زمانے میں ایک غیر معمولی شخصیت تھی) قلعہ میں محبوس کر دیا جائے! افضل خاں کو قتل کر ڈالیں۔ رفیع الدین شیرازی سے جو "حوالداری خزانہ" کے عہدے پر مامور تھا خزانہ کے حسابات طلب کریں اور اس کا مواخذہ کریں! اور مرتضیٰ خاں انجو کو پیشوا مقرر کیا جائے۔ شاہ قاسم اور کشور خاں کو وزیر السلطنت مقرر کیا جائے! اور باقی مناصب باعتبار حیثیت دوسرے اُمراء اور ارکان میں تقسیم کر دیئے جائیں۔ مگر کشور خاں کو یہ انتظام منظور نہ تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ جب یہ مستحکم ہو جائیں گے تو پھر اُسے اس طرح نکال باہر کریں گے جس طرح کامل خاں نکال دیا گیا اور پھر اُسے یہ بھی منظور نہ تھا کہ اصلی وارث تخت و تاج کیساتھ یوں نمکحرامی کی جائے جو کفران نعمت کے مماثل ہوگی۔ غرض اُن کی یہ کوششیں کامیاب ثابت نہوئیں کیونکہ افضل خاں اور کشور خاں میں بر وقت اتحاد ہو گیا اور غالب خاں نے ایسے نازک موقعہ پر کشور خاں کا ساتھ دیا کہ مخالفین کی جد و جہد بے سود و بیکار ثابت ہوئی۔ افضل خاں ان اندرونی واقعات سے قطعاً بے خبر تھا لیکن جب کشور خاں افضل خاں کی مدد سے اپنے دشمنوں پر غالب ہو گیا تو اس نے اُسے یہ سارا احوال کہہ سنایا اور بتلایا کہ ہم وفاداران سلطنت کی موجودگی میں یہ کیونکر ممکن تھا کہ یہ بدخواہ اور بدانجام اپنے ناپاک ارادوں میں کامیاب ہو جاتے۔

کشور خاں کا منصب وکالت پر فائز ہو کر معاملات ملکی کی طرف توجہ کرنا

جب اس طرح کشور خاں کے دشمنوں کا خاتمہ ہوا تو وہ بلا خوف و بلا کھٹکے منصب وکالت پر فائز ہو گیا اور اس کے بعد ہی وہ معاملات ملکی کے سنبھالنے کی طرف متوجہ ہوا۔ اس وقت کاروبار کا سنبھالنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ بڑے بڑے اُمراء جن سے ایسے نازک وقتوں میں مدد ملتی ہے اور جن کے محض وجود سے دل کو ڈھارس رہتی ہے ایسی نمکحرامی پر کمر باندھے ہوئے تھے جس کی وجہ سے اُن کو معاملات سلطنت سے بیدخل

[1] تاریخ قطب شاہی کے الفاظ اس شخص کے متعلق یہ ہیں: "شاہ فتح اللہ شیرازی کہ سرآمد دانشوران روزگار بود" مصنفہ قادر خاں بیدری۔ قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ۔

کر دیا گیا تھا۔ اب کشور خاں کو نہ صرف اندرون ملک میں دشمنوں اور بدخواہوں کو قابو میں رکھنا تھا
بلکہ ہمسایہ ریاستوں کی دست درازیوں کی روک تھام بھی کرنی تھی اور تن تنہا ان تمام
امور ہائے سلطنت کی انجام دہی بغیر کسی حامی و مددگار کے سخت مشکل تھی۔ اس وجہ سے پھر کشور خاں
نے افضل خاں کو اپنا ہمخیال بنایا اور اُسے مجبور کیا کہ ایسے وقت میں وہ معاملات ملک سے
کنارہ کش نہ ہو۔ افضل خاں نے ہر چند بہانہ کیا کہ صحت ٹھیک نہیں ضعف و اضمحلال پیدا ہو چکا ہے۔
دل و دماغ اس قابل نہیں رہے کہ سلطنت کے اہم کاروبار انجام دے سکوں۔ مگر کشور خاں نے
اُس کی ایک نہ سُنی۔ اور یہی کہے گیا کہ اس وقت ملک کو آپ جیسے اشخاص کی سخت ضرورت ہے بالآخر
اُسے بھی راضی کر لیا۔ افضل خاں نے کشور خاں کا جو یہ بڑھتا ہوا اصرار دیکھا تو اس نے مناسب
یہی سمجھا کہ فی الحال اُس سے اتحاد برقرار و قائم رکھے۔ اور بے وجہ ضرورت سے زیادہ انکار
کر کے اس کو دشمن نہ بنا لیا جائے۔ اور محض اسی مصلحت کی بنا پر اس نے کشور خاں کی بات مان
لی اور سلطنت کی اہم اور ذمہ دار خدمات کی انجام دہی کا بیڑا اُٹھایا۔

عادل شاہی سرحد پر نظام شاہی قطب شاہی حملے۔

قاعدے کی بات ہے کہ جب اندرون ملک میں کچھ خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں تو بیرونی دشمن ایسے موقعوں کو غنیمت سمجھ کر اُس سے بیش از بیش فائدہ
اٹھانا چاہتے ہیں۔ جب بیجاپور کی ہمسایہ ریاستوں کو اس کی خبر لگی کہ بادشاہ کی کمسنی کی وجہ سے ملک میں
سخت بدانتظامی اور اُمرائے سلطنت میں نا اتفاقی ہے تو فوراً ہر ایک نے تھوڑی تھوڑی فوج بھیجکر بیجاپور کے سرحدی
علاقوں کو اپنے قبضے میں لانے کا عزم کیا۔ سب سے پہلے قطب شاہ[1] نے دست تصرف دراز کیا اس وقت

[1] ان قطب شاہی حملوں کا تاریخ فرشتہ میں ذکر نہیں چونکہ تحفۃ الملوک سے یہ واضح ہوتا ہے کہ حملوں کی ابتدا قطب شاہیوں کی طرف سے ہوئی اس لئے انکی تفصیل تاریخ قطب شاہی مولفہ قادر خاں بیدری قلمی نسخہ سے لیگئی۔ فرشتہ نے کشور خاں کے عہد میں جو بیرونی حملے ہوئے انکے متعلق لکھا ہے کہ پہلے احمد نگر نے بیجاپور کی سرحد پر چڑھائی کی مگر ان قطب شاہی کوششوں کا قطعاً ذکر نہیں کیا۔

گولکنڈہ میں ابراہیم قلی حکمراں تھا۔ یہ چاہتا تھا کہ پرگنہ کاکن، ناکاوہی، کملورہ، کوڑولی کے علاقے جو
شہزادہ سبحان قلی کے زمانے میں ہاتھ سے نکل گئے تھے اور جن پر عادل شاہی حکومت کا قبضہ ہوگیا
تھا از سر نو قطب شاہی عملداری میں داخل کر لئے جائیں اور ان کی تسخیر عمل میں آئے۔ اس غرض سے
اس نے امیر زنبیل کی سپہ سالاری میں اک بڑی بھاری فوج روانہ کی جس میں عالم خاں کشور خاں
اور حیدر خاں جیسے بہادر اور مرد میدان موجود تھے۔ اس وقت ان علاقوں پر بیجاپوری حکومت
کی جانب سے میاں بدو ضیاء دولت خاں کارفرما تھے۔ قطب شاہی افواج کی آمد کی خبر سنکر
انھوں نے لڑائی کی تیاریاں کیں اور کچھ مقابلہ بھی کیا۔ مگر شکست کھا کر بھاگ گئے۔ اور اس علاقے پر
امیر زنبیل متصرف ہوگیا۔ مفتوحہ علاقوں میں کچھ سرسری انتظامات سے فراغت پاکر وہ اور آگے کی طرف
بڑھا اسی اثناء میں اسے معلوم ہوا کہ ساغر سے ڈیڑھ سو ہاتھی بیجاپور کو لیجائے جارہے ہیں اس نے
فوراً تاخت کی اور یلغار کر کے وہاں پہنچا کہ ہاتھیوں کو اڑالائے۔ عادل شاہیوں کو اس کی خبر
لگ گئی کہ امیر زنبیل ہاتھیوں کی غرض سے بڑھتا چلا آرہا ہے تو انھوں نے بھی ہشیاری کی فوراً ہاتھیوں کو
لیکر قلعہ میں محصور ہوگئے۔ سید اشرف نے جو اس قلعہ کا حاکم تھا معہ دو برگی سرداروں اور تین چار ہزار
سواروں کے قلعہ سے باہر نکل کر دشمنوں کا مقابلہ کیا۔ مگر اس کو شکست ہوئی اور عادل شاہی فوج کو
بہت نقصان پہنچا۔ سید اشرف دشمنوں کے ہاتھوں میں گرفتار ہوگیا قطب شاہیوں نے سید اشرف کو شکست
تو دے دی مگر چونکہ ساغر کا قلعہ نہایت مضبوط تھا اس پر قابض نہ ہوسکے اس ناکامی کا امیر زنبیل نے یوں بدلہ لیا کہ
شہر ساغر کو جلا کر خاک کر ڈالا۔ اس کے بعد ملکھیڑ اور اینگیر کی طرف توجہ کی اور ان کو بھی فتح کر لیا اسطرح قطب شاہیوں کا
ان تمام علاقوں پر قبضہ ہوگیا جو شہزادہ سبحان قلی کے زمانے میں ہاتھ سے نکل گئے تھے۔ ان فتوحات کی اطلاع
امیر زنبیل نے اپنے بادشاہ ابراہیم قطب شاہ کو دی۔ بادشاہ اس کی کامیابیوں سے بہت خوش ہوا۔ ادھر
امیر زنبیل تو اپنے بادشاہ کی خوشنودی کی غرض سے یہ کامیابیاں حاصل کر رہا تھا ادھر بیجاپور کی حالت
ان حملوں کی وجہ سے خطرناک ہوتی جارہی تھی جب کشور خاں نے دیکھا کہ سرحد خطرہ میں ہے اور دشمن
ملک کی افراتفری سے فائدہ اٹھا کر مقبوضات عادل شاہی پر قبضہ جمارہے ہیں تو فوراً اس نے افضل خاں کی

سرکردگی میں ایک بڑی بھاری فوج روانہ کی کہ ان حملہ آوروں کی سرکوبی کی جائے۔ افضل خاں سب سے[1] پہلے قطب شاہیوں کی طرف متوجہ ہوا۔ فوجیں مقابل میں آکر پڑی ہوئی تھیں چند روز تک کوئی جنگ نہیں ہوئی! البتہ بعض مقامات پر اتفاقی طور پر جھڑپ ہو جاتی تھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ افضل خاں قصداً جنگ کو ٹال رہا تھا کیونکہ اُسے امدادی فوج کا انتظار تھا غرض جب تک عین الملک آنکس خاں اور اُمرائے حبش میں سے اخلاص خاں' حمید خاں اور دلاور خاں[2] نہیں آگئے باقاعدہ طور پر جنگ کا سلسلہ شروع نہیں ہوا۔ جب یہ لوگ اپنی فوجوں کے ساتھ افضل خاں سے آملے تو عادل شاہی فوج لڑائی کیلئے تیار ہوگئی! دھر سے قطب شاہیوں نے بھی پیشقدمی کرنی شروع کی۔ دونوں فوجوں کا خوب زبردست مقابلہ ہوا افضل خاں کی دانائی وہشیاری سے میدان بیجاپوریوں کے ہاتھ رہا۔ اور قطب شاہی فوج ایسی سراسیمگی کے عالم میں میدان چھوڑ کر بھاگی ہے کہ اُسے اپنے مال و اسباب کی تک فکر نہ[3] رہی۔ یہ سب مال و اسباب بہت سارے ہاتھی' گھوڑے' اونٹ اس لشکر ظفر پیکر کے قبضے میں آگئے' جب افضل خاں کو ان قطب شاہیوں سے فرصت ملی تو وہ فوراً دیگر اُمرا و عمائدین کی رائے سے

---

[1] تحفتہ الملوک۔

[2] بساتین السلاطین۔ تاریخ فرشتہ میں ان حملوں کے سلسلہ میں افضل خاں کا ذکر نہیں آتا۔

[3] اس شکست کا حال تاریخ قطب شاہی میں درج نہیں بلکہ اس زمانے میں قطب شاہیوں کی جانب سے بیجاپور پر جو حملے ہوئے ہیں اُن کی تفصیل کچھ اور طریقے سے ہی دی گئی ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ امیر زنبیل اپنی اُن کامیابیوں کے بعد جن کا ذکر کیا گیا ابراہیم کے حکم سے اُس فوج سے ملحق ہوگیا جو اس وقت خاص بیجاپور پر حملہ آور ہو رہی تھی۔ اس کے مطابق اس وقت بیجاپور کا محاصرہ کیا جا رہا تھا۔ اور نظام شاہی فوج بھی قطب شاہیوں کی مدد کے لئے موجود تھی لیکن یہ واقعات بہت بعد کے ہیں جو دراصل اخلاص خاں کے عہد حکومت سے تعلق رکھتے ہیں۔ صاحب تاریخ قطب شاہی نے ان سب کو یکجا جمع کر دیا ہے۔ ملاحظہ ہو تاریخ قطب شاہی ص (۲۷۵-۲۷۶) قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ۔

نظام شاہی فوج کی طرف متوجہ ہوا۔[1] اس لئے کہ احمد نگر کی جانب سے پندرہ ہزار کی فوج ہزاد الملک کی سرکردگی میں بیجاپور کی طرف آرہی تھی۔ اس وقت احمد نگر میں مرتضیٰ نظام شاہ حکمران تھا۔ اس کو ایک نہایت ہی دانا اور قابل وزیر صلابت خاں مل گیا تھا جس کے تدبر اور حُسنِ انتظام نے ملک کو بہت فائدہ پہنچایا۔ جب صلابت خاں نے دیکھا کہ بیجاپور اپنی اندرونی الجھنوں میں اس قدر حیران و پریشان ہے کہ اگر اس وقت اس پر کوئی بیرونی آفت نازل ہو تو اُس میں مقابلہ کی تاب نہ ہوگی۔ اور نہایت آسانی سے اکثر علاقوں کو اپنے قبضہ میں لایا جا سکتا ہے تو اُس نے اپنے بادشاہ کو سمجھایا کہ اس موقعہ کو خدا کی دین سمجھنا چاہیئے اور اپنے قدیم حریف سلطنت سے اگر بدلہ لینے کا کوئی وقت ہو سکتا ہے تو وہ یہی ہے۔ اور خاص طور پر یہ بھی یاد دلایا کہ علی عادل شاہ نے احمد نگر کے خلاف علی برید کی مدد کی تھی۔[2]

---

[1] - برہان مآثر سے واضح ہوتا ہے کہ نظام شاہی اور قطب شاہی حملوں کی ابتدا قریب قریب ایک وقت میں ہی ہوتی ہے۔ اور حملہ آوروں کا ارادہ یہ تھا کہ پہلے دونوں فوجیں ملحق ہو جائیں اُس کے بعد جنگ کا آغاز ہو مگر عادلشاہیوں نے قبل اسکے کہ یہ دونوں فوجیں ملحق ہوتیں قطب شاہیوں کا راستہ روک لیا اور اُنکو شکست دی جس کا اوپر ذکر کیا گیا۔ اُس کے بعد نظام شاہیوں کی طرف متوجہ ہوئے۔

[2] - مرتضیٰ نے بیدر کو فتح کرنے کی غرض سے اس چھوٹی سی ریاست پر حملہ کر دیا اور قطب شاہیوں سے مدد بھی لی۔ علی برید نے علی عادل شاہ سے مدد طلب کی۔ عادل شاہ نے علی برید کو مدد تو دی مگر اس شرط پر کہ وہ دو حسین خواجہ سرا جو اُس کے پاس موجود ہیں بیجاپور روانہ کر دئے جائیں۔ ان شرائط کی تکمیل کے بعد بیجاپوری فوج بیدر کا محاصرہ اٹھانے کی غرض سے اس طرف روانہ ہوئی مگر اسی اثنا میں علی عادل شاہ کا قتل عمل میں آیا اور یہ فوج واپس ہوگئی۔ مگر جب بیجاپور کے حالات ٹھیک ہو گئے تو بیدر کی مدد کے لئے پھر بیجاپور سے فوج آئی۔ اس طرح مرتضیٰ نظام شاہ کے بیدر سے جو منصوبے تھے وہ پورے نہ ہو سکے۔ صلابت خاں نے اس وقت یہی چیز یاد دلائی۔ تاریخ قطب شاہی۔

اُس کی کمک کی وجہ سے بیدر پر احمد نگری منصوبے کامیاب ہو سکے۔ مرتضیٰ نظام شاہ بھلا کب ایسی باتوں سے چوکنے والا تھا۔ اُس نے اپنے وزیر کو اجازت دے دی کہ ایک فوج بیجاپور روانہ کر دی جائے[1] چنانچہ بہزاد الملک نے صلابت خاں کے حکم سے پندرہ ہزار فوج کے ساتھ بیجاپور پر چڑھائی کی۔ ادھر سے بیجاپور کی ایک زبردست فوج بھی[2] اس حملے کی مدافعت کے لئے آپہنچی۔ بہزاد الملک ایک نوجوان ناتجربہ کار اور مغرور جنرل تھا۔ اُس نے غالباً ایک چرکسی[3] غلام کی حیثیت سے ترقی کی تھی یعنی نظام شاہ ہوا نے شولاپور کا رُخ کیا۔ اور راستہ میں تاخت و تاراج اور لوٹ گھسوٹ کے سلسلہ کو جاری رکھا جس کی وجہ سے عادل شاہی علاقوں میں سخت پریشانی پھیلی ہوئی تھی۔ غرض یہ صورت حال تھی کہ نظام شاہی اور عادل شاہی فوجوں کی مڈبھیڑ ہو گئی۔ مگر قبل اس کے کہ اس جنگ کے حالات بیان بیان کئے جائیں، بہزاد الملک کے کیرکٹر اور اُس کی پوزیشن پر روشنی ڈالنی ضروری ہے۔

صلابت خاں نے اپنی اُس ذاتی دشمنی کی بنا پر جو اُسے سید مرتضیٰ امیر الامرائے برار سے تھی (جو اس وقت احمد نگر کا ایک نہایت ہی زبردست جنرل تھا) بہزاد الملک کو اُس کی بجائے سپہ سالار فوج بنایا تھا، یہ ایک کم عمر نوجوان تھا۔ اس لئے دوسرے تجربہ کار اور بوڑھے سردار اسکی سرداری کو اچھی نگاہ سے نہ دیکھتے تھے۔ جب یہ صورت حال پیدا ہو گئی تو صلابت خاں کو اس امر کا احساس

---

[1] - برہان ماثر کے مصنف نے لکھا ہے کہ حملے سے پہلے مرتضیٰ نظام شاہ نے ایک سفیر گولکنڈہ روانہ کیا تاکہ اس ریاست سے اتحاد ہو جائے اور پھر دونوں کی متحدہ اور متفقہ کوششوں سے بیجاپوری علاقوں کی تسخیر عمل میں لائی جائے۔

[2] - برہان ماثر سے معلوم ہوتا ہے کہ کشور خاں نے ۲۰ ہزار سوار افضل خاں کے ماتحت مدافعت کے لئے روانہ کئے اور ان دس ہزار سواروں سے ملحق ہونے کا حکم دیا جو بیدر کا محاصرہ اٹھانے کے لئے گئے ہوئے تھے۔

[3] - فرشتہ۔ مگر برہان ماثر کے مصنف نے اُسے ایک ترک غلام لکھا ہے۔

ہوا کہ ہزاد الملک کی سپہ سالاری میں یہ مہم کامیاب نہ ہو سکے گی اس لئے اُس نے اپنے پہلے احکام کو منسوخ کر کے سید مرتضیٰ کو ہی سپہ سالار بنایا اور متعاقب روانہ کیا۔ ادھر ہزاد الملک کو احکام روانہ کئے گئے کہ سید مرتضیٰ کی آمد کا انتظار کرے[1] لیکن اُس نے ان احکام کی پروانہ کی! اور بلا سوچے سمجھے جوانی کے نشہ و غرور میں چور ہو کر چاہا کہ بغیر سید مرتضیٰ کی مدد کے ہی دشمنوں کا خاتمہ کر دیا جائے اور کامیابی کا سہرا اپنے ہی سر رہے۔ لہٰذا اُس نے جنگ چھیڑنے میں نہایت تعجیل کی! اور اُس طرف سید مرتضیٰ ہزاد الملک کے ابتداً سپہ سالار بنائے جانے پر سخت بد دل ہو چکا تھا[2]۔ وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ اُس کے تحت رہ کر کام کرے۔ غرض اس آپس کی رقابت نے احمد نگری فوج کا بنا بنایا کام بگاڑ دیا۔ ایک طرف ہزاد الملک کی عجلت دوسری طرف سید مرتضیٰ کی عمداً تعویق و تاخیر بالآخر احمد نگری افواج کی شکست کی صورت میں ظاہر ہوئی۔

سید مرتضیٰ کی تعویق سے عادل شاہیوں کو غیر معمولی فائدہ ہوا وہ یہ کہ وہ فوج جو اس وقت بیدر پر نامزد شدہ تھی نہایت تیزی اور سرعت کے ساتھ نظام شاہیوں کے مقابلہ کے لئے یہاں آملی[3]۔ اس سے عادل شاہیوں کے دست و بازو اور بھی مضبوط ہو گئے۔ غرض دونوں فوجوں کا

---

[1] برہان مآثر۔ ہزاد الملک نے اس حکم کی یہاں تک تعمیل کی کہ ایک منزل پیچھے ہٹ گیا اور اس سے زیادہ پیچھے ہٹنا خلاف شان سمجھا۔ اور عین دشمن کے مقابلے میں عیش پرستیوں اور لہو ولعب میں مبتلا ہو گیا۔

[2] فرشتہ یہ نہیں بیان کرتا ہے کہ صلابت خاں نے بعد میں سید مرتضیٰ کو سپہ سالار بنا دیا بلکہ اُسکے بیان سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ آخر وقت تک ہزاد الملک ہی سپہ سالار رہا اور اس وجہ سے سید مرتضیٰ سخت ناراض رہا۔ مگر برہان مآثر سے معلوم ہوتا ہے کہ سید مرتضیٰ کو بعد میں سپہ سالار بنایا گیا اور ہزاد الملک کی حماقت کی وجہ سے نظام شاہیوں کو شکست ہوئی۔ (ملاحظہ ہو برہان مآثر و تاریخ فرشتہ۔

[3] اس واقعہ کی حد تک برہان مآثر و فرشتہ میں کوئی اختلاف نہیں۔

مقابلہ حوالی شاہ درگ موضع داراسن میں ہوا جو نلدرگ اور شولاپور کے درمیان واقع ہے۔ عادل شاہی فوج کو اس کا علم ہو چکا تھا کہ سید مرتضیٰ بد دل ہے اور عمداً تاخیر کر رہا ہے۔ لہٰذا انھوں نے موقع کو غنیمت جان کر یکایک احمدنگری فوج پر حملہ کر دیا۔ نظام شاہی فوج کے پیر اکھڑ گئے اور اس بری طرح شکست ہوئی کہ بہزاد الملک کو اتنی فرصت نہ ہو سکی کہ اسلحہ زیب تن کر سکے۔ اس پریشانی اور بدحواسی کے عالم میں اپنی جان بچا کر وہ میدان جنگ سے فرار ہو گیا، اور فوج تتر بتر ہو گئی۔ بہزاد الملک میدان جنگ سے جو بھاگا ہے تو اُس نے پھر سید مرتضیٰ کی فوج سے ملحق ہو کر ہی اطمینا ن کا سانس لیا۔ عادل شاہی اُمرا کو جو یہ غیر متوقع طور پر کامیابی حاصل ہوئی تو اُن کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ انھوں نے شکست خوردہ لشکر کا تھوڑی دور تک تعاقب کیا۔ اور اُن کا بہت سارا مال و اسباب لوٹ لیا اور بکثرت جنگی ہاتھی، گھوڑے اور بہت کچھ سامان حرب اُن کے ہاتھ آیا۔ ان لوگوں نے اس کامیابی سے جو فرصت پائی تو بیدر کا رُخ کیا۔ بیدر میں نظام شاہی فوجیں محاصرہ کئے پڑی تھیں، علی برید تنگ ہوا جا رہا تھا۔ اس کی مدد کو تھوڑی سی فوج بیجاپور سے روانہ کی گئی تھی۔ مگر جب خود بیجاپور پر حملہ کا اندیشہ ہوا تو یہ لوگ افضل خاں اور اُمرائے حبش سے آ ملے تھے جس کا ابھی تذکرہ کیا گیا۔ اس لئے اب اس طرف سے مطمئن ہو کر دوبارہ بیدر کی طرف متوجہ ہوئے کہ نظام شاہیوں کا محاصرہ بیدر پر سے اُٹھا دیں جیسے ہی یہ فتحیاب لشکر بیدر کی طرف پلٹا ہے نظام شاہی فوج میں کھلبلی پڑ گئی اُن کو اس کی خبر ہو گئی تھی کہ بہزاد الملک کو بیجاپوریوں کے مقابلہ میں شکست فاش اُٹھانی پڑی۔ اس سے اُن کی ہمتیں پست ہو گئی تھیں۔ اور انھوں نے اس کو مناسب سمجھا کہ محاصرہ اُٹھالیں اور سید مرتضیٰ کے لشکر سے پیوست ہو جائیں۔ اس طرح بیجاپور کی فوج کی آمد سے پہلے ہی بیدر کا محاصرہ اُٹھ گیا اور علی برید کو خلاصی نصیب ہوئی۔

اب شکست خوردہ اور منہزم لشکر نظام شاہیہ قلعہ دھارور میں پناہ گزیں ہوا۔ افضل خاں کی خواہش تھی کہ گرما گرمی میں اس بد دل و پست ہمت اور تھکی ماندی فوج کا تعاقب کیا جائے۔ اس کو ایک ایسی آخری شکست دی جائے کہ اس کا بالکل خاتمہ ہی ہو۔ تاکہ بیجاپور کو احمدنگری آفت سے پوری پوری نجات ملے۔

مگر افضل خاں کی اس رائے سے دیگر افسران فوج کو اختلاف تھا ، وہ چاہتے تھے کہ اس کاروائی کو یہیں ختم کر دیں اور پہلے گھر کے معاملات کی طرف متوجہ ہوں کیونکہ دارالسلطنت سے متوحش اور پریشان کن خبریں آرہی تھیں ، اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ پھر افق بیجاپور پر کچھ کالی کالی گھٹائیں چھا رہی ہیں جو آنیوالے طوفان کا پتہ دے رہی تھیں ۔

لہٰذا یہ طے پایا کہ فی الحال شاہ درگ کے قلعہ میں پناہ گزیں ہوجائیں جہاں فوجوں کو ستانے کا موقع بھی مل جائیگا اور اُن کی نئی ترتیب و تنظیم بھی عمل میں آسکے گی اس عرصے میں کچھ مزید تازہ دم فوج بھی انکی مدد کیلئے بیجاپور سے آسکتی ہے جس کے لیے درخواست کیگئی تھی لہٰذا پھر تازہ دم ہوکر از سر نو دشمن کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے ۔ اس میں مزید فائدہ یہ تھا کہ دارالسلطنت کے متغیر حالات کا بھی کچھ اندازہ ہوسکتا ہے ، اور اُسکے بعد یہ طے کرنا ممکن ہوگا کہ کیا طرز عمل اختیار کیا جائے ۔ غرض ان مصلحتوں کی بنا پر بیجاپور کی یہ فوج قلعہ شاہ درگ میں پناہ گزیں ہوگئی ۔

کشور خاں کا نیا طرز عمل عمائدین اور اُمراء کے ساتھ بدسلوکیاں

کشور خاں کو جب پے در پے ان کامیابیوں کی خبریں آئیں تو وہ بہت خوش ہوگیا ، اور رفتہ رفتہ اُس کی خوشی غرور سے متبدل ہونے لگی ۔ اب وہ پوری پوری طرح معاملات ملکی پر حاوی ہوچکا تھا ، تمام کاروبار سلطنت اُس کے ہاتھ میں تھے ۔ بادشاہ کمسن تھا ، ملک کے بڑے بڑے اُمراء ، اور سپہ سالار اُس کے حکم سے مشغول کار تھے اور ان جنگوں میں انھیں کامیابیاں بھی ہو رہی تھیں ۔ ملک میں اس وقت کوئی شخص ایسا نہ تھا جو اُس کی مخالفت پر کمر باندھ سکتا اس لئے ہر طریقے سے وہ مقتدر و مستحکم ہوچکا تھا ۔ قاعدے کی بات ہے جیسے جیسے انسان ترقی کرتا ہے اور اُس کی عزت و وقار میں اضافہ ہوتا ہے اُسی قدر اس کی ہوس بھی بڑھتی جاتی ہے ۔ قدرت نے انسان کی فطرت ہی کچھ ایسی بنائی ہے کہ جس قدر اُس کی امیدیں اور آرزوئیں پوری ہوتی جاتی ہیں اُسی قدر اُن میں اضافہ بھی ہوتا ہے ، چنانچہ جوں جوں کشور خاں کے اقتدار میں ترقی ہوتی گئی اُسی قدر وہ مزید طاقت حاصل کرنیکا خواہشمند ہوا ۔ متولی اور مختار سلطنت ہوجانا ہی کوئی معمولی ترقی نہ تھی ۔ یہ ایک ایسا عہدہ ہے کہ اسکے بعد ترقی کا اگر کوئی زینہ ہے تو وہ بادشاہت کا ہی ہے ۔ کشور خاں پیشوائے سلطنت تو تھا ہی ، پورے پورے اختیارات اُس کے ہاتھ میں تھے ، کوئی اُس کا مخالف نہ تھا ۔ اب اپنے اقتدار و استحکام میں مزید کوشش کے

و دمعنی ہو سکتے ہیں۔ یا تو یہ کہ اس کے بعد ترقی کا جو زینہ ہے وہ حاصل ہو جائے یا یہ کہ مستحکم و مضبوط طریقے سے اس کے پیر گڑھ جائیں کہ کوئی اُسے اس منصب سے جدا نہ کر سکے خواہ وہ بادشاہ ہی کیوں نہ ہو۔ کامل خاں نے بھی یہی کیا تھا مگر اُس کو ناکامی ہو چکی تھی۔ اب کشور خاں بھی اُس کے نقش قدم پر چل رہا تھا اور اُس کی پیروی کر رہا تھا چونکہ دونوں کا مقصد ایک تھا لہٰذا اس مشترکہ مقصد کے حصول کے لئے دونوں نے جو طرزِ عمل اختیار کیا اُس کا بھی ایک ہونا لازمی تھا چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ کشور خاں نے بھی بڑے بڑے عہدوں اور مناصب جلیلہ پر اپنے آدمی بھرنے شروع کئے۔ بڑی بڑی تعلعداریاں اپنے ہواخواہوں میں تقسیم کر دیں۔ قدیم وفادار اور جاں نثاران ریاست آہستہ آہستہ علیحدہ کئے جانے لگے۔ اور اُن کی جگہ پر کشور خاں نے اپنے رشتہ داروں اور متعلقین کو فائز کرنا شروع کیا۔ غرض یہ ایسا طرز عمل تھا جس سے ہر بہی خواہ سلطنت کو تشویش ہونی لازمی تھی۔ اُس نے چاند بی بی جیسی با اقتدار اور با اثر ملکہ کو بھی بے دست و پا کر دیا۔ اور یہاں تک نوبت پہنچ چکی تھی کہ بغیر کشور خاں کے حکم کے چاند بی بی کی ایک نہ چلتی تھی مختصر یہ کہ اُس نے اپنے آپ کو ہر طرح مستحکم کر لیا اور مزید استحکامی تدابیر میں مشغول تھا۔ اس پالیسی کی وجہ سے اکثر اُمرا و اعیان سلطنت اُس سے ناراض ہو رہے تھے۔ اور اُس کی ان کارروائیوں کو مشتبہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے بیتوئی کا یہی وہ طرز عمل تھا جس کی بنا پر سرداران فوج نے اپنی جنگی کارروائیوں کو ملتوی کر دیا تھا اور اس فکر میں تھے کہ دیکھئے اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔

کشور خاں کا یہ غلط طرز عمل یہیں تک پہنچکر رُک جاتا تو شاید ایسی زیادہ خرابی پیدا نہ ہوتی مگر اُس نے کہیں اس سے بھی زیادہ پیر پھیلائے۔ اور خصوصیت کے ساتھ وہ ایسی حرکتیں اُس نے کیں جو خود اُس کی بربادی کا پیش خیمہ بن گئیں۔

جب نظام شاہی فوج پر بیجاپوریوں کی فتح کی خبر دارالسلطنت آئی تو چاند بی بی کے حکم سے تین روز تک شہر میں شادیانے بجتے رہے اور ہر قسم کی خوشی منائی گئی۔ معزز اُمرا اور ذی وقار ارکان دولت کو اور اُن سرداروں کو جنھوں نے کہ اس جنگ کو کامیاب بنانے میں کوششیں کی تھی کشور خاں نے چاند بی بی کے حکم سے خلعت ہائے فاخرہ سے سرفراز کیا۔ مرصع تلواریں اسپ ہائے تازی معہ زین و لجام بھی عطا کئے گئے

غرض بہر طریقے سے تین روز تک تمام شہر میں خوشی کا سامان کیا گیا اور ملک کے ہر طبقہ کو خوش کرنے کی تدابیریں لائی گئیں۔ ادھر بظاہر تو یہ خوشیاں منائی جا رہی تھیں مگر اندرونی طور پر سخت اختلافات پیدا ہو رہے تھے۔ اور وہ مواد پک رہا تھا جو بالآخر کشور خاں کے زوال کا باعث ہوا چاند بی بی اور متولی سلطنت کے سیاسی تعلقات اب خوشگوار نہ رہے تھے' اور اندرونی طور پر دونوں میں مخالفتیں بڑھتی ہی جا رہی تھیں کشور خاں یہ چاہتا تھا کہ کسی معاملے میں بھی وہ چاند بی بی سے استصواب رائے کرنے پر مجبور نہ ہو لیکن چاند بی بی کا اثر و اقتدار اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ ہر ہر قدم پر اُسے اُس کی مرضی کے آگے سر تسلیم خم کرنا پڑتا تھا۔ یہی وہ چیز تھی جو کشور خاں کو سخت ناگوار گزرتی تھی' اور اب وہ کوشش کر رہا تھا کہ جہاں تک ہو سکے چاند بی بی کے اثر سے باہر ہو کر کاروبار حکومت چلائے۔ چنانچہ سب سے پہلی کارروائی جو چاند بی بی کی مشورت کے بغیر انجام پائی وہ چند ہاتھیوں سے متعلق تھی اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ کشور خاں نے سرداران فوج کو لکھا کہ وہ نظام شاہی ہاتھی جو حالیہ فتح کے سلسلہ میں بطور مال غنیمت ہاتھ آئے ہیں فوراً دار السلطنت روانہ کر دئیے جائیں۔ اُمرا نے ان کے روانہ کرنے میں تساہل کیا اور انھوں نے یہ محسوس کیا کہ کشور خاں کی یہ حرکت اُمراء و سرداران فوج کے لئے باعث تذلیل و تحقیر ہے۔ لہٰذا اکثر لوگ اُس کے مخالف ہو گئے اور اُسکے خلاف میں کارروائی کرنے لگے خفیہ طور پر ملکہ چاند بی بی سے یہ درخواست کی گئی کہ کشور خاں کے آثار برے ہیں وہ دن بدن زیادہ مغرور و مخدوش ہوتا جا رہا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ کشور خاں کو اس منصب سے علٰحدہ کر دیا جائے قبل اس کے کہ وہ کامل طور دکنی کا پورا پورا رنگ اختیار کرے۔ اور اس کیلئے انھوں نے یہ تدبیر بتائی کہ مصطفٰے خاں کو بنکاپور سے طلب کیا جائے اور کشور خاں کی جگہ اُسے متولی سلطنت بنایا جائے۔ مصطفٰے خاں ہر حیثیت سے اس عہدہ کا مستحق بھی ہے اور موزوں بھی ایک قدیم وفادار اور جاں نثار سلطنت ہے اور اُس نے بہت سارے کار ہائے نمایاں بھی کئے ہیں اس اعتبار سے اُسے وکیل السلطنت کا عہدہ دینا ملک کی فلاح و بہبودی کا سامان کرنا ہے۔ یہ رائے اپنی حد تک نہایت بہتر اور صائب تو تھی لیکن مشکل یہ آن پڑی کہ پورے اُمراء اور سردار اس رائے سے متفق نہ تھے۔ ایک جماعت ایسی بھی تھی جس کا خیال تھا کہ عین اس وقت پر جبکہ بہزاد الملک کی شکست کا بدلہ لینے کے لئے سید مرتضٰی کی سرکردگی میں ایک زبردست احمد نگری فوج کے آنیکا

اندیشہ ہے دارالسلطنت کے اندرونی انتظامات میں کوئی غیر معمولی تغیر یا تبدیلی نقصان سے خالی نہ ہوگی۔ کیونکہ اگر فوج کو گھر کے معاملات کے درست کرنے میں مشغول ہو جانا پڑے تو باہر کے دشمن کا جو اس وقت آدھمکے کون مقابلہ کریگا۔ لہٰذا جب تک سرحد پر سے دشمن کو نہ نکال دیا جائے اُس وقت تک ان اہم معاملات کی طرف توجہ نہیں کی جانی چاہیئے۔ اور جب یکبارگی نظام شاہیوں کی جانب سے کامل اطمینان ہو جائے تو پھر آسانی سے دارالسلطنت پہنچکر چاند بی بی کی مشورت سے مناسب انتظام کیا جاسکتا ہے۔

غرض اس نا اتفاقی سے فی الحال یہ معاملہ معرض التوا میں پڑ گیا۔ اور ادھر کشور خاں کو بھی اس کا علم ہو گیا کہ اُس کے خلاف کیا کیا کاروائیاں ہو رہی ہیں۔ اس نے فوراً اپنے بچاؤ کے انتظام کی طرف توجہ کی۔ وہ یہ خوب سمجھتا تھا کہ اگر پہلے ہی سے اپنی سلامتی کا انتظام نہ کر لیا جائے تو یقیناً یہ تمام اُمراء جو اُس سے بدظن اور بیزار ہو گئے ہیں اُسے قابو میں لاکر پھانس لیں گے۔ اور اُس کی وہی درگت بنائی جائیگی جو اُس نے کامل خاں کی بنائی تھی۔ "قتل الموذی قبل الایذا" کے اصول پر عمل کر کے اُس نے سوچا کہ سب سے آسان ترکیب یہ ہے کہ ان لوگوں کا ہی خاتمہ کر دیا جائے جو اُس کی نظر میں اُس کے لئے "موذی" ثابت ہو سکتے تھے۔ اس وقت اُسے سب سے زیادہ ڈر مصطفےٰ خاں اردستانی سے تھا۔ اس شخص کی عظمت کا سکہ ہر دل پر بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کے مقابلے میں کشور خاں کا کوئی ساتھ دینے کے لئے ہرگز تیار نہ ہوتا تھا۔ اس لئے اس نے خیال کیا کہ جب تک مصطفےٰ خاں زندہ ہے اس کا اقتدار مکمل نہ ہوگا۔ اور بالخصوص اس وجہ سے کہ سب کی نظریں اُسی پر پڑ رہی تھیں اور اُمراء و اعیان دولت کی تنہا امید اُسی سے وابستہ تھی گویا اگر مصطفےٰ خاں کا خاتمہ کر دیا جائے تو مخالفین کا اصلی رہبر و رہنما ہی باقی نہیں رہتا۔ اور پھر مصطفےٰ خاں کے قتل سے اُس کی ایسی دہشت اور ایسا رُعب لوگوں کے دلوں پر چھا جائیگا کہ کسی کی اتنی ہمت نہ ہوگی کہ اُس کے مقابلے کا خیال بھی دل میں لاسکے۔ اس غرض سے اُس نے ٹھان لی کہ کسی نہ کسی طرح مصطفےٰ خاں کو قتل کروا دیا جائے۔ یہاں پر مصطفےٰ خاں کے قتل کی تفصیل سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کچھ اُس کے حالات دیئے جائیں تاکہ اُس کی باعظمت شخصیت اور اُس کی اہمیت کا کچھ اندازہ ہو۔

مصطفےٰ خاں کے حالات	مصطفےٰ خاں کا اصلی نام سید کمال الدین حسین ہے۔ اردستانی خاندان سادات سے

مشرق

جہل، فاقہ، بھیک، بیماری، نجاست کا مکاں — زندگانی، تازگی، عقل و فراست کا مساں

وہم زائیدہ خداؤں کا روایت کا غلام — پرورش پاتا رہا ہے جس میں صدیوں کا غلام

جھڑ چکے ہیں دست و بازو جس کے اس مشرق کو دیکھ — کھیلتی ہے سانس سینے میں مریضِ دق کو دیکھ

ایک ننگی نعش بے گور و کفن ٹھٹھری ہوئی — مغربی چیلوں کا لقمہ خون میں لتھڑی ہوئی

ایک قبرستان جس میں ہوں نہ ہاں کچھ بھی نہیں — اک بھٹکتی روح ہے جس کا مکاں کوئی نہیں

پیکرِ ماضی کا اک بے رنگ اور بے روح خول — ایک مرگِ بے قیامت ایک بے آواز ڈھول

اک مسلسل رات جس کی صبح ہوتی ہی نہیں — خوابِ اصحابِ کہف کو پالنے والی زمیں

اس زمینِ موت پروردہ کو ڈھایا جائے گا
اک نئی دنیا، نیا آدم بنایا جائے گا

مخدوم محی الدین ام۔ اے (عثمانیہ)

فقۂ اسلامی کی ابتدا اور ترقی

تمہید[1] ایک ایسے زمانے میں جبکہ ہر طرف مغربی قوانین کی عالمگیری ہے اور خود اسلامی ممالک میں تجدد اور اصلاح کے نام سے یا زمانے کا ساتھ دینے کے بہانہ سے اسلامی نظام قانون کا چولا بدلا جا رہا ہے حیدرآباد جیسے مقام میں اسلامی فقہ اور شریعت کا مطالعہ بظاہر وقت اور رقوت کے نقصان کے مرادف خیال کیا جائیگا لیکن یہ امر واقعی سارے اسلامی ممالک کے طلبۂ فقہ اسلامی کے لئے گویا ایک تازیانہ ہے کہ اب ان کی متاع گراں مایہ بھی مشرقی مدارس کے رواق سے منتقل ہو ہو کر مغربی جامعات کے طاق و ایوان کی رونق کا باعث ہو رہی ہے۔ یہ موجودہ مغربی نظام قانون ترقی اور وسعت کے خواہ کتنے ہی مدارج کیوں نہ طے کرلے اس ضرورت سے کبھی کوئی استغنا نہیں ہو سکتا کہ پیشرو زمانے کے قانونی نظریات اور خیالات سے استفادہ کیا جائے۔

نواب سر نظامت جنگ بہادر نے اپنے ولولہ انگیز اور عالمانہ خطبۂ جلسۂ تقسیم اسناد جامعۂ عثمانیہ میں بیان کیا ہے کہ "مشرقی علوم و آداب کے لازوال سرچشمہ سے سیراب ہونے کے لئے خود حیدرآبادی نوجوانوں کو بھی کمرہمت چست کرلینی چاہیئے کہ وہ بھی اس

[1] یہ مضمون ۱۳۳۹ف میں حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسہ میں پڑھا گیا تھا جناب مولوی سید خورشید علی صاحب سکرٹری کانفرس کی اجازت سے یہاں شائع کیا جاتا ہے۔

متاع گراں مایہ کے بجا طور سے وارث ہو سکتے ہیں"۔ دراصل حیدرآباد میں باوجود موانعات کے مشرقی علوم و آداب میں تلاش و کاوش سے نئی نئی حقیقتوں کا مظاہرہ کیا جا سکتا ہے۔ ضرورت صرف ہمت اور شوق دلانے کی ہے۔

بہرحال اس مضمون کا منشا یہ ہے کہ یہ معلوم کیا جائے کہ اسلامی قانون کی ابتدا کیسے ہوئی اور یہ کہ اس میں ترقی اور وسعت کس طرح حاصل ہوتی گئی۔

ماخذ مضمون کوئی شبہ نہیں کہ موضوع نہایت دلچسپ ہے اور اس پر اگر کوئی گہری نظر ڈالی جائے تو خود بخود یہ واضح ہو سکے گا کہ اسلامی نظام قانون کوئی جامد و مطلق نظام نہیں ہے بلکہ اس میں اب بھی یہ قابلیت ہے کہ نئی وسعت اور کشادگی پیدا کی جائے لیکن ایک طالب علم کو اس عنوان پر کچھ لکھنے کے لئے جو وقت پیش آتی ہے وہ یہ کہ عربی کی متداول کتابوں سے اس کے لئے کوئی مواد مہیا نہیں ہو سکتا۔ بلا شبہ اس موضوع پر قدما اور متاخرین نے کچھ نہ کچھ لکھا ضرور ہوگا لیکن اس کا اب آسانی سے فراہم ہونا مشکل ہے۔ طبقات اور تراجم کی جو کتابیں بالعموم ملتی ہیں ان سے موجودہ ضروریات اور مذاق کے لحاظ سے کام لینا نہایت دقت طلب امر ہے۔ سر عبدالرحیم نے اپنی مشہور کتاب "محامڈن جورس پروڈنس" میں نظام فقہ کی تاریخ کے لئے بجائے کسی اسلامی مصنف کی طرف رجوع کرنے کے مسٹر مکڈانلڈ سے رجوع کیا ہے۔ درآنحالیکہ انکی باقی کتاب تمام تر اصلی ماخذوں سے ماخوذ ہے۔ کتاب کے مطالعہ سے صاف صاف واضح ہوتا ہے کہ مواد اخذ کرنے میں سر عبدالرحیم کو قدم قدم پر کس طرح احتیاط برتنی پڑی ہے لیکن باوجود اس کے کتاب کا یہ حصہ طالب علم کے دل میں اطمینان پیدا نہیں کرتا۔ سر امیر علی مرحوم نے بھی اپنی کتاب میں جو تاریخی مقدمہ لکھا ہے وہ بھی گویا ایک سرسری بیان ہے۔ ان حالات میں جو طالب علم اصلی ماخذوں کے ذریعہ تاریخ فقہ کا پتہ چلانا چاہتا ہے اس کو مقدمہ ابن خلدون میں ایک مختصر باب مل جاتا ہے۔ کشف الظنون میں بھی ایک نہایت موجز بیان ملتا ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی کے دو رسالے "انصاف فی سبب الاختلاف" اور "عقد الجید فی مسائل الاجتہاد والتقلید" سے ایک متعلم نہایت

مفید اشارے حاصل کر سکتا ہے۔ علاوہ بریں شاہ صاحب کی ہی حجۃ اللہ البالغہ میں عنوان زیر تبصرہ کے متعلق نہایت مفید اور بیش بہا نکات مل جاتے ہیں۔ اس کتاب میں شاہ صاحب نے فقۂ اسلامی کے متعلق اپنے حکیمانہ انداز میں جو بھی لکھا ہے اس سے ایک طالب علم فقۂ اسلامی کی ابتدا اور اس کی ترقی کا بہت معقول اندازہ کر سکتا ہے اور نیز یہ بھی معلوم کر سکتا ہے کہ فقۂ اسلامی کا اصلی رجحان کیا رہا ہے۔ فی الوقت اس تحریر کا اصلی ماخذ بھی شاہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے ہی تصانیف ہیں جن کے اُردو تراجم بھی ہو چکے ہیں لیکن ان سے استفادہ کے لئے اصلی کتابیں بھی پیش نظر رہنا ناگزیر ہے۔

اُردو میں موضوع زیر نظر کے متعلق جو مواد ملتا ہے اس میں قابل ذکر مولوی عبدالسلام ندوی کا "تاریخ فقۂ اسلام" کے نام سے وہ ترجمہ ہے جو انھوں نے شیخ محمد الخضری المصری کی عربی کتاب سے کیا ہے۔ "مفید المفتین" کے نام سے عبدالاول صاحب جون پوری کا ایک رسالہ مذہب حنفی کے علما اور کتابوں کے حالات میں موجود ہے۔ مولانا محمد انوار اللہ فضیلت جنگ مرحوم کی تصنیف "حقیقۃ الفقہ" مولوی سید سلیمان ندوی کی تالیفات "حیات مالک" اور "سیرت عائشہؓ" اور مولانا شبلی مرحوم کی کتاب "سیرت النعمان" وغیرہ سب سے بالواسطہ کام نکلتا ہے۔

تین اہم اصول قبل اس کے آگے قلم اٹھایا جائے تین امور کا ذہن نشین کر لینا بہت ضروری ہے۔

(۱) خوش اعتقاد اور آزاد خیال افراد ہر زمانے اور ہر قوم میں مسلسل ہوتے آئے ہیں اور اختلافات کا منبع بالعموم خوش اعتقادی یا آزاد خیالی رہا ہے۔

(۲) علوم و فنون خاص اسباب سے پیدا ہوتے ہیں۔ جب کسی غرض کی تکمیل ہو جاتی ہے تو پھر اس علم کے متاخرین اور متقدمین میں زمین و آسمان کا فرق ہو جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ ضرورت باقی نہیں رہتی جس کی بنا پر اس فن کے مشاہیر کے کارنامے بروئے کار آتے ہیں مثلاً سیبویہ و امثالہٗ ائمہ نحو و صرف کے بعد پھر اس مرتبہ کے ائمہ فن پیدا نہیں ہوئے ظاہر ہے کہ کام ختم ہو چکا تھا اس کے بعد ضرورت علم بلاغت کی ہوئی۔ وقس علیٰ ہذا۔ اہل علم کی توجہ اس

جانب مائل ہوئی ہے جس کی زمانہ کے لحاظ سے زیادہ ضرورت ہے۔

(۳) متاخرینؔ علم کو دقیق بنادیا کرتے ہیں۔ وجہ ظاہر ہے کہ نئے میدان باقی نہیں رہتے مختصرات اوران کی شرح وتاویل، توجیہ وتفسیر میں پڑکر اصل فن کی تکمیل پر توجہ نہیں کی جاسکتی۔ متقدمین کی تعظیم سے جو ذہنیت پیدا ہو جاتی ہے اس کی وجہ دماغ کی جولانی اور ذہن کی جودت اصلی میدانوں کو چھوڑ کر بھٹک جاتی ہے۔ ارباب علوم اسلامیہ کے آخری طبقہ نے تو علوم کو چیستان بنادینے میں ہی اپنی ساری کوشش صرف کی ہے، یہی حال فقہ اسلامی کا بھی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ فقہ کے تعلق سے متاخرین کا اصلی کارنامہ یہ ضرور ہے کہ انھوں نے فقہ کو استدلالی رنگ میں مرتب کیا اوراس طرح ایک حیثیت سے فلسفۂ فقہ مدون ہوگیا۔ دقت نظر اور تعمق استدلال سے فقہی کتابیں مالامال کرنا ہے لیکن لفظی موشگافیوں میں ضرورت سے زیادہ منہمک ہو جانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ فقۂ اسلامی کو حقایق زندگی سے پہلا سا ربط باقی نہ رہا۔ نئی ضرورتوں اور نئے حالات سے مطابقت پیدا ہونا تو کجا معیشت و زندگی سے اور بُعد پیدا ہوتا گیا۔

متقدمین سے مرعوب ہو کر خود کو عاجز سمجھنے کا جو نتیجہ ہوا وہ یہ کہ افراد قوم سے غور وفکر اور استنباط و اجتہاد کی قوت سلب ہوگئی۔ بہرحال فقہ اسلامی میں بھی یہ تینوں اصول شروع سے کام کرتے رہے ہیں۔

فقہ کا مفہوم واضح ہو کہ ملا محب اللہ بہاری نے اپنی کتاب مسلم الثبوت کے حاشیہ میں بیان کیا ہے کہ "فقہ" کا مفہوم ابتدائی قرنوں میں سارے علوم شرعیہ پر حاوی تھا عقاید و اخلاق تصوف بھی اس میں شامل تھے لیکن آگے چلکر عقاید کے مباحث کے لئے ایک الگ علم "علم کلام" کے نام سے مدون ہوگیا۔ تزکیۂ باطن اور تہذیب اخلاق کے لئے بھی الگ علوم مدون ہوگئے اور فقہ کا اطلاق صرف احکام ظاہرہ پر ہونے لگا یا دوسرے الفاظ میں انسان کی عملی زندگی سے متعلق جو مسائل ہیں وہ فقہ کا موضوع بنے۔ فقہ کا مفہوم اس قدر تنگ ہو جانے کے باوجود اب بھی موجودہ زمانے کے "قانون" کے مفہوم سے وسیع تر ہے کیونکہ "فقہ" میں ان مسائل سے بھی بحث

یکجائی ہے کہ جن کا تعلق انسان اور اس کے خالق سے ہے۔

فقہ کا بنیادی ماخذ فقہ کا اصلی ماخذ قرآن ہے۔ سب جانتے ہیں کہ حضور رسالت مآبؐ کی عمر مبارک چالیس سال کی ہوئی تو نزول قرآن شروع ہوا اور بتدریج آپ کی زندگی مبارک تک نازل ہوتا رہا۔ نزول قرآن کا زمانہ دو حصوں پر منقسم ہے۔ ایک وہ حصہ جو زمانہ ہجرت سے قبل کا ہے اور دوسرا وہ حصہ جو ہجرت کے بعد سے شروع ہوا۔ ہر حصۂ قرآن دوسرے سے ممتاز ہے۔ مکی حصۂ قرآن میں عموماً عقاید اور توحید ذات و صفات باری پر زور دیا گیا ہے مدنی حصہ میں وہ سب امور مذکور ہیں جو مسلمانوں کی زندگی کے ہر حصہ کو ایک خاص قالب میں ڈھالتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں مکی حصۂ قرآن میں احکام فقہی تقریباً پائے نہیں جاتے۔ فقہی احکام کی تفصیل مدنی حصۂ قرآن میں مذکور ہے۔ نیز مکی احکام بالکل مجمل ہیں بر خلاف اس کے مدنی احکام بالخصوص احکام متعلق معاملات تمدنی بہت مفصل ہیں۔

مضامین قرآن مجموعی حیثیت سے مضامین قرآنی کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

(۱) تاریخ اقوام قدیم۔

(۲) آثار و نعمات الٰہی کا تذکرہ۔

(۳) امور متعلق دین یعنی وہ امور جو خدا اور بندے کے درمیان ہیں مثلاً عبادات و عقاید۔

(۴) امور متعلق معیشت یا بندوں کا باہمی معاملہ۔

(۵) تذکرۂ موت و مابعد۔

ان میں سے فقہا بعض امور متعلق دین اور امور متعلق معیشت سے بحث کرتے ہیں۔ واضح ہو کہ قرآن میں جو فقہی احکام مذکور ہیں وہ دفعتہً نہیں صادر ہوئے۔ اسلامی سوسائٹی میں وقتاً فوقتاً حالات اور ضروریات کے لحاظ سے احکام کی احتیاج ہوتی گئی تو احکام آتے گئے۔

دوسرا ماخذ فقہ اسلامی کا دوسرا ماخذ حدیث ہے۔ حدیث سے مراد ذات رسالت پناہی کے سارے اقوال و افعال ہیں اور نیز دوسرے افراد کے ایسے افعال جو آپ کے روبرو ہوئے

اور آپ نے ان کو قائم رکھا۔

ذات رسالت پناہیؐ کے افعال و اقوال کی دو قسمیں ہیں:۔

(۱) وہ امور جن کو تبلیغ رسالت سے علاقہ ہے۔ ان میں احکام فقہی بھی شامل ہیں۔

(۲) وہ امور کہ جن کو تبلیغ رسالت سے کوئی علاقہ نہیں۔ اس لئے احکام فقہی کو بھی ان سے کوئی تعلق نہیں۔ علاج و طب کے متعلق جو احادیث ہیں وہ اسی میں شامل ہیں اور نیز وہ افعال و اعمال بھی جن کو آپ محض عادتاً عمل میں لایا کرتے تھے یا اتفاقیہ بلا قصد ظاہر ہوتے تھے یا برسبیل تذکرہ آپ جو امور بیان فرمایا کرتے تھے وہ بھی اسی میں داخل کئے جاتے ہیں۔ اس میں ایسے امور بھی شامل ہیں جو کسی جزوی مصلحت کی بنا پر آپ کے زمانے میں رائج تھے یا آپ نے ان کے لئے حکم صادر فرمار کھا تھا لیکن آگے چلکر ان پر عمل کرنا ساری اُمت کے لئے ضروری نہ رہا۔ بہرحال قرآن شریف کا جو مطلب آپ بیان فرمایا کرتے اس کو تبلیغ رسالت سے تعلق ہے۔ یہ اظہار مطلب کبھی کسی قول کے ذریعہ سے ہوتا اور کبھی کسی فعل کے ذریعہ سے اور کبھی قول و فعل دونوں کے ذریعہ سے۔ اس طرح گویا حدیث شرح قرآن ہے۔ حدیث میں کوئی امر ایسا نہیں ہے کہ جس کے متعلق قرآن میں اجمالاً یا تفصیلاً تذکرہ نہ ہو۔

صحابہؓ کا طریقہ رسالت پناہؐ کے زمانے میں صحابہ کرامؓ کے احکام فقہ کی تعلیم حاصل کرنے کے دو طریقے تھے:۔

(۱) اقوال نبیؐ سے۔ طریقہ یہ تھا کہ علی الاکثر ان اقوال کو حفظ کر لیا جاتا اور بوقت عمل ان سے استناد کیا جاتا۔

(۲) افعال و اقوال کی دلالت سے احکام فقہی اخذ کئے جاتے۔ اس کی صورت یہ تھی کہ صحابہ کرامؓ نے رسالت پناہؐ کو کوئی امر عمل میں لاتے ہوئے دیکھ لیا تو اس سے کوئی حکم معلوم کر لیا جاتا۔

صحابہ کرامؓ کا وہ گروہ جو اسلامی دنیا کی فقہی رہبری کے لئے تیار ہو رہا تھا ہر وقت حضور رسالت پناہؐ کے ساتھ ساتھ رہ کر اوامر و نواہی کے مواقع دیکھ کر اور بوقت ضرورت حضور رسالت پناہؐ

سوالات کرکے اور اگر شرف حضوری نہو تو دوسروں سے تعلیم نبوی کا حال معلوم کرکے اس قابل ہو اکہ آئندہ مشکل سے مشکل مسائل حل کر سکے۔ اس بابرکت ماحول میں صحابہ کرامؓ فقہی مسائل کے حل کیلئے جس انداز سے تیار کئے جارہے تھے اس کی مثال کے لئے ایک واقعہ کو پیش کرنا بے محل نہ ہوگا

رسالت پناہؐ نے حضرت معاذ کو یمن روانہ فرمایا۔ روانگی کے وقت ان سے دریافت فرمایا کہ "فیصلہ" کے لئے کیا طریقۂ عمل اختیار کروگے۔ عرض کیا کہ "کتاب اللہ" کے مطابق عمل کیا جائے گا۔ رسول اللہ صلعم نے دریافت فرمایا کہ اگر کتاب اللہ میں کوئی حکم نہ ملے تو اس صورت میں کیا طریقۂ عمل اختیار کیا جائے گا۔ عرض کیا کہ رسولؐ اللہ کے احکام پیش نظر رکھ کر کام کیا جائے گا۔ پھر دریافت فرمایا کہ اگر یہ بھی نہو۔ حضرت معاذؓ نے عرض کی کہ اپنی رائے سے اجتہاد کرونگا۔ یہ سُنکر رسالت پناہؐ نے ارشاد فرمایا کہ "خدا کا شکر ہے کہ اس نے اپنے رسول کے رسول کو اس کے حسب مرضی توفیق دی"

حضور رسالت مآبؐ کے زمانۂ مبارک میں جن صحابہ کرامؓ نے احکام فقہی کی تعلیم پائی ان میں حضرت عمرؓ۔ حضرت علیؓ۔ حضرت عبداللہؓ بن مسعود اور حضرت عبداللہؓ بن عمر اور نیز حضرت عائشہؓ و حضرت زیدؓ بن ثابت وغیرہ کا خاص پایہ اور درجہ ہے۔ ان کے علم نے ہی آگے چلکر وسعت اختیار کی۔

اس زمانۂ مبارک میں صرف قرآن کو ضبط تحریر میں لانے کا التزام تھا حدیثوں کو لکھنے کا رواج عام نہیں ہوا تھا لیکن اس سے بالکل تغافل بھی نہیں تھا۔ یہ ثابت ہے کہ جمع و تدوین حدیث کا کام خود زمانۂ نبوت میں شروع ہوچکا تھا۔ احکام فقہ منطقی اور علمی انداز میں ابھی مدون نہیں ہوئے تھے۔ اس وقت موجودہ فقہیانہ مباحث کا کوئی وجود نہیں تھا۔ ہر حکم کے ارکان و شروط اور آداب میں بھی کوئی امتیاز نہیں تھا۔ اس زمانے میں چونکہ عملی زندگی بسر کرنیکی تربیت خودبخود ہوتی جاتی تھی اس لئے ان امور کی جانب توجہ کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ رسولؐ کریم کا اسوۂ حسنہ موجود تھا۔ صحابہ کرامؓ اسی پر عمل پیرا ہوا کرتے۔ رسالت پناہ صلعم یہ تشریح نہیں فرمایا

کرتے تھے کہ یہ امر رکن ہے اور وہ امر شرط ہے۔ صحابۂ کرامؓ اس قسم کے امور بہت کم دریافت کیا کرتے تھے۔ اصل میں بات یہ تھی کہ صحابۂ کرامؓ کی اس طرح تربیت ہوئی تھی کہ وہ اصلی روح اسلام جان گئے تھے قانون اسلام کے دو اساسی امور "عدم حرج" اور "قلت تکلیف" کا مفہوم بخوبی ان کے ذہن نشین تھا۔ خواہ مخواہ سوالات کر کے وہ سختیوں کا اضافہ نہیں کر لیا کرتے تھے۔

بہرحال یہی طریقہ جاری رہا۔ ہر ایک صحابی نے بہ حسب امکان خود رسولؐ اللہ کی عبادت۔ فتاوی اور احکام دیکھے اور اُن کو محفوظ کر لیا۔ اور اپنے رجحان طبع اور ضرورت کے لحاظ سے ان پر عمل کیا۔ استدلال اور منطقی طریقوں کی نہ تو ان کو احتیاج تھی اور نہ وہ ان کی زندگی کے عام طریقے کے لحاظ سے اس وقت کار آمد تھے۔ ان کی تمام تر کوشش یہ ہوتی تھی کہ اطمینان قلب حاصل ہو جائے۔

الغرض اس دور میں فقہ کا دار مدار دو امور پر تھا۔

(۱) قرآن مجید۔

(۲) قرآن مجید کی وہ توضیح جو رسالت پناہؐ فرمایا کرتے تھے۔

زمانۂ خلافت راشدہ اس کے بعد خلافت راشدہ کا زمانہ آیا اور یہ نظر آتا ہے کہ دس سال کے اندر عراق۔ ایران۔ شام اور مصر میں اسلامی اثر مستحکم ترین بنیادوں پر قائم ہو گیا۔ مساوات اور رواداری، صلاح و فلاح رعایا اور رفاہ عامہ کی ایک نئی دنیا اور ایک نیا آسمان پیدا ہو جاتا ہے۔ اس جدید سیاسی رنگ کے لحاظ سے ضرور تھا کہ فقہ اسلامی بھی حقوق الناس کی حفاظت اور انصاف و عدالت کی خاطر وسعت حاصل کرے اور احکام فقہ کے عام اصول کی توضیح، تشریح اور تعبیر اس طرح ہو کہ وہ یہ ثابت کر دے کہ ان جدید پیدا شدہ حالات میں بھی وہ کار آمد ہے۔

اس دور میں سب سے اہم ترین کام قرآن شریف کے مختلف اوراق کا ایک شیرازے میں جمع ہونا ہے۔ ابتدا میں اکابر صحابہ اس کو پسند نہیں فرماتے تھے لیکن "الضرورۃ ام الایجاد"۔ جمہوریت اسلام کے اولین صدر نے بالآخر طے کر دیا کہ یہ کام ضروری ہے۔ اس نوبت پر حدیث کی

عام تدوین خود حضرت عمرؓ بھی پسند نہیں فرماتے تھے لیکن آگے چلکر ہر شخص ایک دوسرے سے مختلف فیہ احادیث کی روایت کرنے لگا تو چارہ سوا اس کے نظر نہیں آیا کہ ان کی تدوین بھی عمل میں آئے۔

اختلاف کی بنیاد بہرحال یہ وہ زمانہ تھا جبکہ تاسیس حکومت اور اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے صحابۂ کرامؓ دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئے۔ اب چونکہ اسلامی سوسائٹی دن بدن زیادہ بہ زیادہ وسعت اختیار کرتی جاتی تھی اور حکومت وسلطنت کے حدود بھی ہر وقت پھیلتے جاتے تھے لہٰذا ان حالات میں ضرور تھا کہ نئی باتیں پیدا ہوں چنانچہ اس لحاظ سے جدید فقہی ضرورتیں بھی پیش آنے لگیں۔ ہر صحابیؓ نے اپنے حوصلہ اور وسعت علم کے لحاظ سے ان جدید پیش آمدہ صورتوں کے لئے حل تلاش کرنے کی کوشش شروع کی۔ قرآن وحدیث سے جب صورت پیش آمدہ حل نہیں ہوتی تو اپنی رائے سے اجتہاد کرنا عام طریقہ ہوگیا لیکن اس اجتہاد میں یہ امر پیش نظر رہتا کہ قرآن وحدیث نے جو عام اور ہمہ گیر اصول مقرر کر دیئے ہیں ان سے سر مو انحراف نہ ہو۔ اس حالت میں لامحالہ ضرور تھا کہ اختلاف واقع ہو۔

اس موقع پر یہ امر واضح ہونا چاہیئے کہ صحابۂ کرامؓ میں بھی فرق مراتب موجود ہے۔ عالم اور عامۃ الناس کا امتیاز اس وقت بھی نظر آتا ہے سب صحابہ وسعت علم اور تفقہ کے اعتبار سے ایک مرتبہ کے نہیں تھے حضرت ابو ہریرہؓ کے زہد وتقدس میں کون کلام کرسکتا ہے لیکن باوجود اس کے حضرت زیدؓ بن ثابت اور حضرت عبداللہؓ بن عباس وغیرہ کا پایۂ علم وفقاہت میں جو ہے وہ پوشیدہ نہیں ہے۔ حضرت ابن عباسؓ اگرچہ کمسن صحابہ میں سے تھے لیکن بلحاظ علم وفضل صحابۂ کبارؓ پر فائق تھے بلکہ ان کے معلم بنگئے تھے۔ اس کے ساتھ ہر صحابیؓ کا رجحان طبع بھی ایک دوسرے سے الگ ہونا لابدی ہے۔ اس اعتبار سے حضرت عمرؓ اور حضرت سعدؓ بن ابی وقاص میں جو فرق ہے وہ معلوم ہے۔

بہرحال اختلاف کا واقع ہونا ضروری تھا اور وہ واقع ہوا لیکن وہ اختلاف سراسر

رحمت و ترقی اور سربلندی کا ذریعہ ثابت ہوا۔

اختلاف کے چند پہلو اس اختلاف کے چند پہلو ہیں:۔

(۱) کسی صحابیؓ کو کسی واقعہ اور حکم کے متعلق کوئی حدیث معلوم ہوئی لیکن دوسرے صحابیؓ کو اس کا علم نہیں ہوا تو لامحالہ اس امر کی ضرورت ہوئی کہ اپنی رائے سے اجتہاد کیا جائے۔ اس اجتہاد کی بھی مختلف صورتیں ہیں:۔

(الف) اول یہ کہ اجتہاد واقعتہً اصل حکم کے بالکل موافق واقع ہو مثلاً ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے روبرو یہ مسئلہ پیش کیا گیا کہ شوہر بلا تقرر مہر فوت ہو گیا، اس صورت میں زوجہ کے کیا حقوق قرار پائیں گے۔ حضرت موصوف نے اولاً اس مسئلہ میں رسالت پناہؐ کے کسی حکم سے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ پھر ایک ماہ کے غور و تامل کے بعد قرار دیا کہ زوجہ کو مہر مثل ملنا چاہیئے اس پر عدت ضروری ہے اور یہ کہ اس کو ترکہ ملیگا۔ یہ فیصلہ سنکر حضرت معقلؓ بن یسار کھڑے ہوئے اور کہا کہ رسالت پناہؐ نے ایک وقت اسی طرح فیصلہ فرمایا تھا۔

(ب) دوسری صورت یہ ہے کہ دو صحابیوں میں بحث و مناظرہ کے بعد ایسی کوئی حدیث معلوم ہو جائے کہ اس پر عمل کرنا ظن غالب کے لحاظ سے درست ہو۔

(ج) تیسری صورت یہ ہے کہ حدیث کا علم تو ہو جائے لیکن کسی وجہ موجہ سے اس کو قابل تسلیم نہ قرار دیا جائے۔ مثلاً ایک مرتبہ فاطمہ بنت قیس نے حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر بیان کیا کہ انکے شوہر نے ان کو تین طلاقیں دی تھیں لیکن رسول اللہؐ نے نفقہ و سکنی کا حکم صادر نہیں فرمایا تھا۔ حضرت عمرؓ نے اس کو قبول نہیں فرمایا اور یہ ارشاد فرمایا کہ ایک عورت کے کہنے سے کتاب اللہ کو ترک نہیں کیا جا سکتا۔ نہیں معلوم اس نے سچ کہا یا غلط۔

(د) چوتھی صورت یہ کہ حدیث کا بالکلیہ علم ہی نہ ہو۔

(۲) اختلاف کی دوسری وجہ یہ ہوتی تھی کہ صحابۂ کرامؓ رسالت پناہؐ سے کسی فعل یا عمل کا صدور دیکھا کرتے لیکن ہر شخص اپنے خیال و رجحان کے لحاظ سے اس سے کوئی حکم اخذ کرتا۔ بعض اصحاب یہ خیال کرتے کہ

رسالت پناہؐ کا یہ فعل بطور عبادت کے ہے اس لئے اس پر عمل واجب ہے۔ بعض یہ تصور کرتے کہ اس میں اباحت ہے۔

اختلاف کے یہ دو بڑے سبب تھے اس کے علاوہ سہو ونسیان کی وجہ سے بھی صحابہؓ میں اختلاف ہوتا تھا کبھی خوب انضباط نہ ہونے سے بھی اختلاف پیش آیا کرتا تھا کسی حکم کی علت قرار دینے میں بھی صحابہ اختلاف کرتے تھے بنا بر اں اس علت کو کسی دوسرے معاملہ میں ثابت کرکے حکم دینے میں بھی اختلاف ہونا ضرور تھا۔ قرآن مجید کے مطالب سمجھنے میں بھی اختلاف ہونا ناگزیر تھا۔ الغرض ان وجوہ کی بنا پر صحابہ کرامؓ کے مذاہب اور آرا میں اختلاف پیدا ہو گیا۔

"قیاس" اس دور میں مسائل کے حل اور فقہی احکام کی تلاش صرف اسی وقت کی جاتی تھی جبکہ فی الواقع کوئی صورت پیش آتی تھی لیکن تمدن کی تیز رفتار ترقی کے ساتھ لازمی تھا کہ نئے نئے مسائل بھی صحابہ کرامؓ کے روبرو پیش ہوں۔ قرآن و حدیث میں ہر جزوی مسئلہ کی صراحت نہیں ہو سکتی تھی۔ ان میں تو کلیات اور اصول کا انضباط کیا گیا ہے۔ لامحالہ صحابہؓ کو قیاس کرنا پڑا اسی کو "رائے" کہا جاتا ہے۔ "قیاس" کی یہی ابتدا ہے۔ حضرت عمرؓ نے حضرت شریحؒ کو جب کوفہ کا قاضی مقرر فرمایا تو ان کو ہدایت فرمائی کہ جو کچھ کتاب اللہ سے معلوم ہو سکے اس پر صریحاً عمل کیا جائے۔ اگر اس سے حکم نہ مل سکے تو پھر حدیث پہ نظر ڈالی جائے۔ پھر اپنی رائے پر عمل کیا جائے۔ اسی طرح دوسرے قضات کو بھی انھوں نے اسی طرح کے ہدایات دئے ہیں۔ صرف اس بات پر سختی سے نظر رکھی جاتی تھی کہ رائے اور اجتہاد میں خواہشات نفسانی کی پیروی نہ کیجائے۔

"شوریٰ" "اجماع" اس کے علاوہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کا یہ بھی مسلک تھا کہ کسی معاملہ میں فیصلہ کرنے کے لئے بڑے لوگوں کو جمع کرکے مشورہ کیا جائے۔ جب اس طرح اجماعی رائے حاصل ہو جاتی تو اس کے مطابق حکم قرار دیا جاتا۔ پھر اس کی کوئی مخالفت نہیں ہوتی تھی۔ اسی طریقہ کا نام "اجماع" تھا چونکہ اس وقت مجتہدین صحابہؓ کی تعداد محدود تھی اس لئے ان سے مشورہ لینا اور ان کی رائے حاصل کر لینا ممکن تھا۔

حضرت عمرؓ کے زمانہ میں مفتوحہ زمینات کی تقسیم کے متعلق جو طریقۂ عمل برتا گیا اس کو یہاں بطور مثال پیش کرنا بے محل نہیں ہے۔

عراق و شام کی فتح کے بعد یہ مسئلہ پیش ہوا کہ زمین کے متعلق کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔ آیا زمین فوج میں تقسیم کر دی جائے یا وہ سلطنت کی ملک قرار دی جائے۔ قرآن مجید کے ظاہری الفاظ کے لحاظ سے اس کے پانچ حصے کر کے چار حصے تقسیم کر دینے چاہیئے اور ایک حصہ مصالحہ عامہ پر خرچ ہونا چاہیئے۔ اس بنا پر عوام نے حضرت عمرؓ سے تقسیم کا مطالبہ کیا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اگر یہ زمین مع ذمی رعایا کے تقسیم کر دی جائے اور اس میں وراثت کا سلسلہ جاری ہو تو پھر آیندہ نسلوں کا کیا حال ہوگا۔ سرحد کی حفاظت کیسے ہوگی۔ ان ممالک کے چھوٹے چھوٹے بچوں اور بیوہ عورتوں کو کیا ملیگا۔ بہرحال عام لوگوں نے حضرت عمرؓ سے بڑا مباحثہ کیا۔ بالآخر حضرت موصوف نے مہاجرین اولین سے مشورہ کیا۔ ان میں حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کی رائے تقسیم پر مایل تھی حضرت عثمانؓ۔ حضرت علیؓ اور خود حضرت عمرؓ کے صاحبزادے نے تقسیم کی مخالفت کی۔ پھر حضرت عمرؓ نے دس انصار کو طلب فرمایا اور ان کی رائے دریافت کی۔ یہ اصحاب بھی حضرت عمرؓ سے متفق ہو گئے۔ بالآخر فیصلہ کر دیا گیا کہ زمین تقسیم نہ کی جائے۔ زمین اس کے اصلی مالکوں کے پاس رہنے دی گئی اور ان پر خراج مقرر کر دیا گیا۔

بہرحال اس طرح خلفاء راشدینؓ کے زمانے میں کام چلتا رہا تا آنکہ وہ دور ختم ہو گیا۔ اس زمانے میں فقہ کے ماخذ چار ہو گئے۔ کتاب اللہ اور حدیث یہ دونوں اصلی ماخذ تھے تیسرا ماخذ قیاس یا رائے۔ یہ قرآن وحدیث کی ہی فرع ہے چوتھا ماخذ اجماع اس میں بھی قرآن وحدیث سے ہی استناد کیا جاتا ہے۔

اس دور میں خود خلفاء راشدینؓ۔ حضرت عبداللہؓ بن مسعود حضرت ابوموسیٰؓ اشعری۔ حضرت معاذؓ بن جبل۔ حضرت ابیؓ بن کعب اور حضرت زیدؓ بن ثابت فقاہت کے لئے سند تھے۔ علاوہ بریں مدینہ میں حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ۔ ام المومنین حضرت عائشہؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ۔ مکہ میں حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ۔ مصر میں حضرت عبداللہؓ بن عمرو بن العاص۔ بصرہ میں حضرت انسؓ بن مالک۔ کوفہ میں حضرت ابوموسیٰؓ اشعری اور خود حضرت علیؓ فقہ اسلامی کی تعبیر و تشریح کے لئے سند تھے۔

فقہ کی ترقی میں غلاموں کا حصہ

سب جانتے ہیں کہ اسلام سارے مسلمانوں کے لئے ایک ہی برادری کا پیغام لیکر آیا تھا۔ اسکا مظاہرہ صرف عبادت گاہوں وغیرہ تک محدود نہیں رہا۔ زندگی اور معاشرت کا سارا نظام آقا اور غلام کے اتحاد اور تعاون کے تار و پود پر قائم تھا۔ علوم اسلامیہ کی تاریخ بھی آقا اور غلام

دونوں نے ملکر مرتب کی ہے۔ چنانچہ اس زمانے میں خود صحابہ کے غلاموں نے بھی بڑا امتیاز پیدا کیا اور دنیائے اسلام نے ان کی پیشوائی تسلیم کی حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ کے غلام عکرمہ، حضرت ابن عمرؓ کے غلام نافع۔ حضرت انسؓ بن مالک کے غلام محمد بن سیرین وغیرہ وہ افراد ہیں جن کی عظمت و بزرگی میں کوئی شخص کلام نہیں کرسکتا۔

بے تعصبی غرض اس عہد میں کبار صحابہؓ اور ان کے شاگرد اس نہج سے مصروف عمل تھے۔ کوئی صحابیؓ کسی معین اور خاص طریقے کے لئے مشہور نہیں ہوا۔ ہر شخص جس سے چاہتا فتویٰ مانگتا کوئی تعصب اور تنگ نظری نہیں تھی۔ جزوی اختلافات کے باوجود سب دائرۂ اسلام میں ہی شامل خیال کئے جاتے تھے۔

تابعین کا زمانہ اب صحابۂ کرامؓ کے شاگردوں کی جماعتیں بھی پیدا ہوگئیں۔ تابعین انھیں کو کہتے ہیں۔ تابعین میں سے ہر شخص نے اپنی ذہنی استعداد کے لحاظ سے اپنے استادوں سے استفادہ کیا اور یہ قابلیت حاصل کرلی کہ خود اپنے استادوں کے اقوال پر تنقید و تبصرہ کرے۔ خود کبار صحابہؓ میں سے بعض اصحاب کے اقوال کو انھوں نے ضعیف قرار دیا اس کے مقابلے میں صغار صحابہؓ کا مسلک ان کو قوی معلوم ہوا۔ اس طرح ہر تابعی نے اپنے ذاتی خیالات و ذاتی تحقیقات اور ذاتی غور و فکر کی وجہ سے اپنا علیحدہ علیحدہ مسلک قرار دیا۔ ہر شہر میں آئمہ تابعین وجود میں آگئے مثلاً مدینہ میں سعید بن مسیب اور سالم بن عبداللہ بن عمر۔ قاضی یحیٰ بن سعید اور ربیعہ بن عبدالرحمٰن۔ مکہ میں عطا بن ریاح۔ کوفہ میں ابراہیم نخعی۔ بصرہ میں حسن بصری۔ یمن میں طاؤس بن کیسان اور شام میں امام مکحول۔

شاہ صاحب نے بیان کیا ہے کہ سعید بن مسیب اور ابراہیم نخعی اور نیز دوسرے ان کے ہم مرتبہ افراد نے تمام ابواب فقہ کو مرتب کرلیا تھا۔ ہر فرد نے اپنے خاص اصول اور قواعد قرار دے لئے تھے۔ یہ قواعد و اصول انھوں نے اپنے اسلاف سے حاصل کئے تھے۔ بہرحال یہ زمانہ ترتیب و تہذیب فقہ کا زمانہ ہے۔

ضرور تھا کہ جماعت تابعین میں سے ہر فرد پر اس کے استاد اور ماحول کا اثر پڑے۔ دوسرے اپنے استاد اور شیخ کو ترجیح دینا خواہ دوسرے کیسے ہی سربلند کیوں نہ ہوں، انسان کا طریقہ ہے۔ پھر

رسل و رسایل کے ذرایع کی اس زمانے میں جو حالت تھی اس کے لحاظ سے بھی یہ امر ناگزیر تھا۔ سعید بن مسیب اور انکے شاگردوں کا صدر مقام چونکہ مدینہ منورہ تھا اس لئے وہ علمائے حرمین کو فضیلت دیتے تھے۔ ان کے مذہب کی بنیاد حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت ابن عمرؓ، حضرت ابن عباسؓ اور حضرت عایشہؓ وغیرہ کے آرا پر تھی۔ اس کے برخلاف کوفہ میں ابراہیم نخعی اور ان کے شاگردوں کے پاس حضرت ابن مسعود، حضرت علیؓ، قاضی شریح اور دیگر قضات کوفہ کے آرا و فتاوی قابل وقعت تھے۔ غرض تابعین بھی اپنے استادوں کے مسلک پر کام کرتے رہے تا آنکہ ان کا دور بھی ختم ہو گیا اور اب حاملین علم اور فقہا کا عہد آگیا۔

فقہا کا دور اب یہ زمانہ ہے جبکہ خلافت بنی امیہ سے منتقل ہو کر بنی عباس میں آئی سلطنت کے حدود مشرق و مغرب میں پھیل گئے۔ اسلامی تمدن و تہذیب کو عالمگیر وسعت حاصل ہو گئی۔ ہر طرف اسی کی برتری تھی علمی حلقے عظمت و ترتیب کے بلند ترین مدارج پر پہنچ گئے۔ بغداد ہو یا قرطبہ، قیروان ہو یا قاہرہ۔ دمشق ہو یا کوفہ یا بصرہ۔ مرو ہو یا نیشاپور ہر جگہ علمی اور تمدنی بہار پورے شباب پر تھی۔ تجارت وصنعت۔ زراعت و حرفت کے نئے نئے میدان کشادہ ہوتے جاتے تھے۔ یونانی علوم عربی میں منتقل ہونے لگے۔ عالم اسلامی کے تعلقات باقی حصۂ دنیا سے مربوط ہو گئے۔ ان حالات میں ظاہر ہے کہ عالم اسلامی کے فقہی ضروریات وہ نہیں رہی تھیں جو اب سے پہلے تھیں۔

اس موقع پر یہ امر بھی ذہن میں رکھنا چاہیئے کہ جس طرح سیاسی تاریخ اسلام صرف ایک قوم عرب کی تاریخ نہیں ہے بلکہ ایرانی، ترک اور مغل وغیرہ بھی اس کے جزو لاینفک ہیں اسیطرح اسلامی علوم کی تاریخ بھی صرف عربوں کے ہی کارناموں سے مرتب نہیں ہوئی ہے۔ غیر عرب قوموں نے بھی اس میں نہایت عظیم الشان حصہ لیا۔ اس کی مثال میں صرف امام اعظم نعمان بن ثابت کا نام لینا کافی ہے۔

تابعین کے بعد ان کے شاگردوں نے کام کا سلسلہ برابر جاری رکھا اور نئے حالات کا پوری کامیابی سے مقابلہ کیا۔ ان بزرگوں نے اب یہ بھی کوشش کی کہ مختلف شہروں کے قاضیوں اور مفتیوں سے

سلسلۂ ربط وضبط بڑھایا جائے اور ان کے آراء وخیالات معلوم کئے جائیں۔ درس وتدریس غور وفکر، اور طلب علم کے لئے بدرجۂ غایت جد وجہدان کا شغل تھا مسائل کا حل اور مقدمات کا فیصلہ، ان کے دن رات کا کام تھا احکام فقہ کے استخراج اور اصول سے فروع نکالنے میں تابعین کا جو مسلک تھا وہی طریقہ ان کے شاگردوں کا بھی رہا گو یہ بات درست ہے کہ بعض امور میں اختلاف رائے بھی واقع ہوتا تھا بریں ہم بحیثیت مجموعی سب ایک ہی راہ کے سالک تھے۔ احادیث سے تمسک کرنے میں بوجہ اختلاف احادیث مشکل پیش آئی تو بالاتفاق اقوال صحابہ سے رجوع کیا جاتا صحابہ میں بھی ہم آہنگی نہیں ہوتی تو لامحالہ ہر شخص اپنے شہر کے علماء پر اعتماد کرتا تھا خود تابعین کا بھی یہی دستور تھا۔

تدوین وتالیف۔ امام مالکؒ۔ اب اس دور میں تدوین وتالیف کی ضرورت داعی ہوئی اور اس کا آغاز ہوا امام مالک نے مدینے میں، ابن جریج اور ابن عیینہ نے مکے میں۔ ثوری نے کوفے میں اور ربیع نے بصرے میں اس کام کی بناء ڈالی منصور نے امام مالکؒ سے اپنی یہ خواہش ظاہر کی کہ ان کی کتاب موطاء نقل کرا کے سارے ممالک میں پھیلادی جائے۔ امام مالکؒ نے اس پر اپنی رضا مندی کا اظہار نہیں کیا اور کہا کہ لوگوں میں مختلف اقوال رواج پا چکے ہیں۔ ان کو احادیث معلوم ہو چکی ہیں۔ روایات کی نقل ہو چکی ہے۔ جو مسائل ان کو معلوم ہوئے ان پر انھوں نے عمل کر لیا اس لئے بہتر یہ ہے کہ ان کو اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے جو کچھ انھوں نے اپنے لئے پسند کر لیا ہے وہی ان کے لئے مناسب ومفید ہے۔ منصور کی طرح ہارون الرشید نے بھی امام مالکؒ سے یہی خیالات ظاہر کئے تھے لیکن امام نے کسی طرح رضامندی ظاہر نہیں کی۔

امام مالک چونکہ مدنی تھے اس لئے مدنی علماء کے آراء وافکار کا ان پر بہت اثر تھا امام مالکؒ تدوین حدیث کے امام قرار دئے جا سکتے ہیں۔ فقہ میں تدوین حدیث ان کے قلم سے ہوئی ہے۔ زبانی روایت کا سلسلہ اب اس نوبت پر پہنچ چکا تھا کہ اگر اس کو اسی طرح جاری رہنے دیا جاتا تو صحیح اور غلط میں امتیاز دشوار ہو جاتا۔ امام مالکؒ نے اس کو محسوس کیا اور موطا لکھی جو آج تک حدیث کی کتابوں میں سرتاج خیال کی جاتی ہے۔

امام اعظمؒ | امام مالکؒ کے برخلاف امام اعظمؒ کوفہ کے باشندہ تھے، عرب نہیں تھے۔ اس لئے ان پر علمائے کوفہ مثل ابراہیم نخعی کا بہت اثر تھا۔ علمائے کوفہ کا جو مسلک تھا اس سے وہ بہت کم ہٹتے تھے۔ ان کے نامور شاگرد قاضی ابویوسف اور امام محمد آسمان فقہ کے آفتاب و ماہتاب تھے لیکن یہ بھی امام صاحب کے ساتھ علمائے کوفہ کا مسلک نہیں چھوڑتے تھے۔ قاضی ابویوسف ہارون الرشید کے زمانۂ خلافت میں قاضی القضاۃ کے عہدہ پر فائز تھے۔ انھوں نے اس وقت یہ ثابت کر دیا کہ فقہ اسلامی کو تمدن و مدنیت کے ارتقا کے ساتھ پوری کامیابی سے پیوند دیا جا سکتا ہے۔

امام شافعیؒ | مجدد قرن ثالث کی حیثیت سے امام شافعیؒ میدان میں آئے تو انھوں نے فقہ میں ایک الگ رنگ اختیار کیا۔ حنفی و مالکی مکاتب اور رائے و سنت میں انھوں نے تطبیق کا بیڑا اٹھایا۔ اس کی تفصیل کے لئے مولوی سید سلیمان صاحب ندوی کے الفاظ مستعار لئے جاتے ہیں۔

"امام شافعیؒ سے پہلے تک چونکہ عہد نبوت سے زیادہ فصل نہیں ہوا تھا اس لئے لوگوں کے علم کا مدار روایت پر نہیں بلکہ عملی شکل پر تھا۔ اس لئے امام مالکؒ نے یہ اصول قایم کیا تھا کہ اہل مدینہ کا عمل حجت ہے۔ اہل مدینہ کا عمل اس وقت تک نبوت۔ خلافت راشدہ اور صحابۂ کرام کی تعلیمات کا اصلی نقشہ تھا۔ جب امام شافعیؒ میدان عمل میں آئے تو دیکھا کہ زمانہ بدل چکا ہے۔ لوگوں کی عملی زندگی متغیر ہو چکی ہے عباسی حکومت کے دور میں قوموں کے اختلاط، علوم کے تراجم اور آزاد خیال افراد کی پیدائش نے آراء و افکار کے نئے نئے دروازے کھول دئے، ان حالات میں صرف عمل پر تکیہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بنا براں انھوں نے حدیث پر تکیہ کرنے کے لئے عمل صحابہ سے بڑھ کر قول رسولؐ کو ترجیح دی اور اس کے لئے اصول وضع کئے اور ان اصول کو مدون کیا۔" (رسالۂ معارف)۔

اصول فقہ میں امام شافعیؒ ہی نے سب سے پہلے کتاب لکھی۔ یہ امر بھی واضح ہونا چاہئے کہ امام شافعیؒ کے زمانے سے پہلے بعض احادیث عام طور سے بعض علماء کو معلوم نہ تھیں اس لئے ان کو اپنی رائے سے اجتہاد کرنا پڑا لیکن جب امام شافعیؒ کا زمانہ آیا تو مختلف بلاد اسلامیہ میں میل جول بڑھ گیا تھا اس لئے کسی مقام میں جو احادیث روایت کی جاتی تھیں وہ دوسرے بلاد اسلامیہ میں بھی شائع ہونے لگیں لیکن باوجود اس کے

ابتدا میں اس لحاظ سے کہ یہ حدیثیں علمائے شہر کے عمل سے مختلف تھیں لوگوں نے ان پر تکیہ نہیں کیا لیکن جب محدثین نے چھان بین شروع کی تو پتہ چلا کہ سب حدیثیں قابل اعتماد ہیں لامحالہ امام شافعیؒ نے اس صورت میں قرار دیا کہ حدیث، خواہ اس کی روایت بصرہ میں ہو، خواہ مدینہ میں صحیح ثابت ہو جائے تو اس پر عمل کرنا چاہیے صحیح حدیث کی موجودگی میں کسی تابعی یا مجتہد کا قول ناقابل اعتنا ہے۔

رائے اور روایت

اس موقع پر یہ امر پیش نظر رہنا چاہیے کہ فقہ کے دو مسلک 'رائے' اور 'روایت' قدیم سے ہیں۔ خود عہد صحابہؓ تک اس کا سراغ لگایا جاتا ہے۔ خود امام مالکؒ کے زمانے میں اور ان کے بعد اور پہلے بھی ایسے علماء موجود تھے جو مسائل فقہ میں رائے سے حکم قرار دینے میں احتیاط برتتے تھے۔ نہایت شدید ضرورت کی حالت میں بدرجۂ مجبوری بقدر ضرورت رائے پر عمل کرتے تھے۔ ان کو بڑا اہتمام اس کا تھا کہ حدیث کی روایت کر دیں۔

امام شافعیؒ پر تدوین فقہ کا اصلی دور ختم ہو جاتا ہے گو کچھ اور عرصہ تک مجتہدین پیدا ہوتے رہے۔

امام شافعیؒ کے شاگرد امام احمدؒ

امام شافعیؒ نے جو کام شروع کیا اس کو ان کے شاگرد امام احمد بن حنبلؒ نے کمال پر پہنچا دیا۔ امام المحدثین کی حیثیت سے انھوں نے مہتم بالشان کام انجام دیا بخلاف امام اعظمؒ کے نامور شاگردوں کے امام شافعی کے شاگرد۔ امام احمد، امام داود ظاہری اور امام جعفر طبری علٰحدہ علٰحدہ راہ کے سالک بنتے ہیں۔ استاد اور شاگردوں کے مذاہب میں کافی بعد ہے۔ امام احمدؒ تو بالکل الگ ہیں۔ امام طبری حنابلہ اور شوافع میں واسطہ ہیں۔ امام ظاہری نے تو دوسری ہی راہ اختیار کی۔ امام احمدؒ اہل حدیث کے امام ہیں اور امام داود ظاہریہ فرقہ کے پیشوا ہیں۔

ارباب حدیث

امام احمد حنبلؒ کا ہی زمانہ دوسرے ارباب حدیث کا بھی زمانہ ہے۔ امیر المومنین فی الحدیث امام بخاریؒ نے ترتیب و تہذیب حدیث کا جو عظیم الشان کام انجام دیا ہے اس کی ممنونیت سے ساری اسلامی دنیا کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ انھی کے معاصر امام مسلمؒ بھی ہیں انھوں نے گویا صحیح بخاری کی ترتیب درست کر دی۔ ترمذی اور ابو داود بھی اسی ماحول میں پیدا ہوئے۔ اسلامی سوسائٹی میں ان کے آثار و مباحث کو

خوب فروغ ہوا۔

اس دور کے بعد اصفہان کے امام داؤد نے اپنا مذہب پھیلانا چاہا۔ ان کا طریق کار صرف یہی نہیں تھا کہ امام شافعی کے مذہب کے لحاظ سے خبر کو اثر پر ترجیح ہے بلکہ ان کا خیال یہ تھا کہ قیاس و رائے کی کوئی وقعت نہیں۔ تمام آیندہ پیش آنیوالے مسائل کے لئے انھوں نے قرآن و سنت کو کافی سمجھا۔ اگر ایسے مسائل درپیش ہوں کہ جن کے متعلق قرآن و حدیث سے کوئی حکم معلوم نہو تو انھوں نے قرار دیا کہ وہ شرعاً مباح ہوں گے

اہل حدیث و اہل الرائے | اس جگہ اہل حدیث و اہل الرائے کے متعلق مزید توضیح نامناسب نہیں ہے۔ واضح ہو کہ "اہل الرائے" وہ علما ہیں جو قیاس اور حدیث (خبر واحد) کے باہم متعارض ہونیکی صورت میں قیاس کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس طور پر امام اعظمؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ اہل حدیث کہلانے کے مستحق ہیں اور امام مالکؒ اہل الرائے۔

غور کیا جائے تو تین اسکول پیدا ہوتے ہیں:۔

۱۔ اہل الرائے۔ ان کا طریقہ یہ ہے کہ روایت کی کوئی دلیل قطعی ثابت نہ کرسکیں تو قیاس پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔

۲۔ اہل حدیث یا اہل ظاہر۔ ان کا مسلک یہ ہے کہ نقل یا روایت کی کسی دلیل کے موجود ہوتے ہوئے قیاس سے احتراز کرنا چاہیئے۔ حتیٰ کہ اس گروہ کے اکثر افراد قیاس کو دلیل شرعی یا ماخذ قانون ہی قرار نہیں دیتے۔

۳۔ فقہا۔ ان کا مسلک بین بین ہے۔ یہ اصحاب دلیل قطعی (قرآن، سنت مشہورہ، اور اجماع) کو سب امور پر ترجیح دیتے ہیں۔ مثلاً حالات مابعد الموت وغیرہ۔ ایسے امور جن کا عقل ادراک نہیں کر سکتی ہے ان کے متعلق خبر واحد اور قیاس میں تعارض پیدا ہو جائے تو بعض اصحاب قیاس کو اور بعض اصحاب خبر واحد کو راجح شمار کرتے ہیں۔ اگر کسی مسئلہ میں خبر واحد موجود نہو تو یہ گروہ بالاتفاق قیاس سے استدلال کرتا ہے۔ خبر واحد کے واجب العمل ہونے کے شرائط ان لوگوں کے پاس مختلف ہیں۔ جب تک وہ شرائط نہ پائے جائیں خبر واحد قابل عمل نہیں ہوتی۔

اہل حدیث نے پہلے اور آخری گروہ کو اہل الرائے قرار دیا ہے۔

فقہ منطقی قالب میں

اس دور میں مجتہدین کرام کے تمام مباحث قلمبند کر لئے گئے اور ان کی تدوین عمل میں آئی۔ حکومت نے ان کے آرار کے لحاظ سے فصل خصومات کے آئین مقرر کئے۔ مدارس و جامعات میں ان کی کتابوں کی تدریس شروع ہوگئی۔ اس طرح ان علمائے محترم نے وہ بنیادیں قایم کر دیں کہ ان پر آج تک لوگ چل رہے ہیں۔ اس زمانے میں گویا منطقی نقطۂ نظر سے فقہ کا مطالعہ شروع ہوا۔ فقہی اصطلاحات مقرر ہوئے، طرز استدلال کی داغ بیل پڑنے لگی۔ مناظرہ اور مباحثہ کی بنیادیں پڑیں۔ تحقیق و تفتیش کے نئے نئے آئین جدید نقطۂ نظر سے مدون ہوئے۔ ترتیب بیان اور اظہار مدعا کے جدید اسالیب قایم ہوئے۔ غرض ان سب امور کی بنیاد پڑی جن کی وجہ سے منتشر معلومات علمی قالب میں ڈھالے جاتے ہیں۔

قصہ مختصر، یوں فقہ اسلامی کی ابتدا ہوتی ہے، اور یوں اس کی ترقی۔ اب تدوین فقہ اور تدوین حدیث کا اصلی کام ختم ہو جاتا ہے۔ امام ابن جریر طبری پر گویا مجتہدین کا خاتمہ ہے۔ اسلامی نظام قانون اس کے بعد انہی آئمہ کے اقوال و آرار کی شرح و تفسیر قرار پا جاتا ہے۔ اس پر نظر ڈالنا اس تحریر کے دائرہ سے باہر ہے۔

قربانی و ایثار

اس موقع پر یہ تذکرہ بے محل نہیں کہ فقہ اسلامی کے ان آئمہ کبار کو اپنے خیالات اور آراء کے لئے قربانی و ایثار کے بڑے بڑے امتحان دینے پڑے۔ اسلامی قانون کی تاریخ بھی قید و بند کے تذکرہ سے خالی نہیں ہے۔

امام اعظمؒ نے بعض ذاتی وجوہ کی بنار پر قضات کے عہدے سے انکار کر دیا۔ اس بنار پر کوفہ کے والی یزید بن ہبیرہ نے کوڑے لگوائے۔ خلیفہ منصور نے بغداد کی بنا ڈالی تو امام صاحبؒ کو بھی کوفہ سے بغداد میں طلب کیا۔ یہاں بھی قضات کا عہدہ پیش کیا گیا۔ اس کو آپ نے یہاں بھی قبول نہیں کیا۔ امام اعظمؒ کو قید کر دیا جاتا ہے اور اسی قید میں

آپ نے اپنی جان عزیز جان آفرین کے سپرد کر دی۔

امام احمد حنبلؒ کو بھی مامون الرشید جیسے روشن خیال خلیفہ کے حکم سے کوڑے لگائے گئے۔ تاکہ وہ اپنے عقائد سے پلٹ جائیں۔ امام احمدؒ کوئی معمولی ہستی نہیں تھی کہ صرف مار کے ڈر سے اپنے عقاید بدل دیں۔

امام مالک جبری بیعت کے متعلق فتویٰ دیتے ہیں کہ درست نہیں۔ اس بنا پر منصور کے زمانے میں والیٔ مدینۂ منورہ نے حکم دیا کہ امام کو کوڑے لگائے جائیں تعمیل حکم میں کوتاہی نہیں ہوئی۔ پشت خون آلود ہوگئی۔ دونوں ہاتھ مونڈھے سے اتر گئے۔ پھر اونٹ پر سوار کرا کے شہر میں تشہیر الگ کی گئی۔ بعد ازاں وہ اسی طرح خون آلودہ لباس میں مسجد نبوی میں آئے اور خون صاف کر کے دو رکعت نماز پڑھی۔

عصر حاضر اس وقت ساری دنیا میں یہ خیال ہے کہ اسلامی نظام قانون اپنی زندگی کے دن پورے کر چکا ہے۔ یہ رائے صحیح ہے یا غلط اس کا فیصلہ آیندہ ہوگا لیکن اسلامی علوم و آداب کی تاریخ قدم قدم پر یہ ثبوت پیش کرتی ہے کہ ضروریات زمانہ کے لحاظ سے اور جدید خیالات کے نشو و نما کے ساتھ ساتھ علوم کی بھی تدوین ہوتی گئی ہے۔

فتنۂ تاتار و زوال بغداد کے قیامت خیز واقعات نے علوم اسلامی میں انحطاط پیدا کر دیا۔ سیاسی افراتفری کے باعث راضی بہ تقدیر ہو جانے کا غلط مفہوم پیدا ہوگیا۔ حادثۂ تاتار سے سنبھل کر پھر کام شروع ہوا تھا اور خود خانہ برانداز مغل پیر خانہ سازی پر آمادہ ہوگئے۔ ترکان آل عثمان بھی میدان میں آئے لیکن علوم کا انحطاط رو کے نہیں رکا۔ اب علوم کا آفتاب مغرب سے نکلتا ہے اور برکت تصانیف مسلمانان سے مغرب میں ترقی فنون کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔ فرنگی سیاست، اسلامی سیاست پر غالب ہو جاتی ہے۔ حادثۂ مغل کے بعد

یہ دوسرا حادثہ رونما ہوتا ہے۔ اسلامی سوسائٹی حاکم سے محکوم ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ آئمۂ اربعہ نے قانون اسلامی کو اس وقت ڈھالا تھا جبکہ اسلامی حکومت پورے اوج پر تھی۔ ان کو خیال بھی نہ ہو سکتا تھا کہ آیندہ صدیوں میں کیا حالت پیش آئیگی۔

بس ایسی حالت میں جبکہ اسلامی سیاسی اور علمی تاریخ زمانہ کو بدلتا دیکھ کر اس کو اپنے موافق بنانے کی کوشش کرتی رہی اور کامیاب ہوتی رہی ہے تو کوئی تعجب نہیں اگر ایک ادھ اور کروٹ بدلے اور

"مردے از غیب بروں آید و کارے بکند"

محمد غوث ام۔ اے۔ ال۔ ال۔ بی (عثمانیہ)

طیلسانئین سے خطاب

اے مطلعِ عالم کے درخشندہ ستارو　　میدانِ عمل میں کبھی ہمت کو نہ ہارو
ہر سعی پہ تم اپنی طبیعت کو ابھارو　　جو بگڑے ہوئے کام ہیں کوشش سے سنوارو
ہستی کی ہر اک شاخ پہ چھا جاؤ جوانو　　آپ اپنے ہی بل بوتے پہ اتراؤ جوانو

گھبراؤ نہ ہرگز تمہیں آ جائے جو آفت　　ہے طاقتِ انساں کی یہ اک جانچ کی صورت
دنیائے عمل میں ہے قیامت سی قیامت　　پا جاؤ جو ہمت ہے ان آفات پہ قدرت
سمجھو کہ کھلا بابِ فتوحات عزیزو　　ہو گرمِ طلب شوق سے دن رات عزیزو

سرشار کرے جوشِ عمل کا تمھیں بادہ　　کیف و کمِ دنیا کی نہو فکر زیادہ
ہر گام پہ اس رہ میں مصمم ہو ارادہ　　بڑھ جاتا ہے اسوار سے پُر جوش پیادہ
گر زندگیِ سادہ میں اعلےٰ ہوں خیالات　　حاصل ہو تمھیں دہر میں معراجِ کمالات

تابع ہے خیالات کے انسان کی ہستی　　کرتے رہو اسواسطے جذبات پرستی
آنے نہ دو بھولے سے خیالات میں پستی　　اَن مول ہے جو جنس وہ ہو جائے نہ سستی
سمجھو کہ خیالات ہیں اللہ کی سوغات　　دکھلاتے ہیں جو وقت پہ تاثیرِ کرامات

آئینِ جہاں جو ہیں انھیں مانو اٹل تم　　ایمائے جہاں ہے رہو سرگرمِ عمل تم
پاؤ گے ضرور اپنے مساعی کا بدل تم　　ڈالو نہ کبھی غیر کی راحت میں خلل تم
ہر قوم کی عزت کرو کہلاؤ روادار　　انساں کی رہو خیر سگالی کے طلبگار

حرماں کا کبھی بھولے سے احساس نہ آئے نزدیک جوانوں کے کبھی یاس نہ آئے
فالج ہے دلوں کی یہ کبھی پاس نہ آئے جب کام پہ اٹھو کوئی وسواس نہ آئے

تعلیم کا مقصد یہ ہے مایوس نہ ہونا اس بیش بہا عمر کو غفلت میں نہ کھونا

یہ شیوۂ مردانہ ہے بیجا ؤ رجائی ظاہر میں ہے جو ہو وہی باطن میں صفائی
ہر اہلِ وطن کی کرو للّٰلہ بھلائی ملحوظ رکھو اپنے بزرگوں کی بڑائی

سب اہلِ وطن کی ہیں لگی تم پہ نگاہیں بھولو نہ ترقیٔ وطن کی ہیں جو راہیں

بخشا ہے ہر انسان کو اللہ نے جوہر تم میں بھی جو جوہر ہے کرو اس کو اجاگر
مشہور ہوئے اس کی نمایش سے ہیں اکثر سیّد ہو کہ شبلی ہو کہ حالی ہو کہ اکبر

اے غافلِ جوہر ہے یہی حق کی ودیعت اس باب میں پوچھے گا خدا روزِ قیامت

یہ علم سکھاتا ہے کہ انساں بنو کامل شہریٔ مفید اور بنو دہر کے حاصل
اخلاقِ حمیدہ کے ہوں سب تم میں فضائل مانندِ بہائم نہ کتابوں کے ہوں حامل

زخمی نہ کرو دوسرے کو تیغ و سناں سے تکلیف نہ پہنچاؤ کبھی دست و زباں سے

ہے جنگ بپا، مادہ و روح میں دایم ملحوظ رکھو شرق کے آداب و مراسم
ہوں روحی ترقی سے روایات جو قایم پورے ہوں جہاں میں جو تمہارے ہیں عزایم

بھولو نہ خدا کے لیے تم شیوۂ اسلاف ہر گام پہ ہو پیشِ نظر اسوۂ اسلاف

اقلیمِ دکن کے ہو تمہیں آنکھ کے تارے تم قوم کے دلدار ہو تم ملک کے پیارے
شبانِ دکن برقِ ذہانت کے شرارے اللہ رکھے حاصلِ قسمت ہیں ہمارے

لکھیں گے مؤرخ جو ذکیؔ ان کی کہانی
کہلائیں گے یہ اک نئی تہذیب کے بانی

محمد عبدالسلام ذکیؔ بی۔ اے (عثمانیہ)

اُردو ادب بیسویں صدی میں

(۱)

عہدِ انقلاب

ہنگامۂ غدر نے یوں تو سیکڑوں گھر نہیں، بلکہ بستیاں تباہ کر ڈالیں، مگر قدیم اُردو ادب کا بازار جیسا تباہ ہوا ویسی تباہی سوا لکھنؤ اور دلی کے کہیں نہیں آئی۔ بات یہ ہے کہ اُردو نے ہمیشہ سلطنتوں کی آغوش میں تربیت پائی، بادشاہی درباروں اور شاہی محلوں میں پروان چڑھی، دلی لاکھ اُجڑی سہی پھر بھی ایک قدیم سلطنت کی راجدھانی تھی۔ وہ سلطنت ہزار گئی گذری تھی، لیکن ادیبوں کا ماوا و ملجا تھی۔ دلّی کے علاوہ اگر اردو کو راس آئی تو لکھنؤ کی رنگین فضا۔ مانا کہ لکھنؤ کی عیش پرور فضا نے اس کی مٹی خراب کر دی تھی اور اس کا فطری حُسن شائستگی کے ہاتھوں خاک میں مل گیا تھا، پھر بھی اس کے پرستاروں کی روٹیوں کا سہارا یہیں تھا۔

غدر کہنے کو ہندوستان بھر میں ہوا، مگر سچ پوچھو تو دلی اور لکھنؤ پر جیسی بیتی اور کسی جگہ پر نہ گذری سلطنتیں تو خیر بگڑی ہی تھیں، اُمراء، شرفاء، یہاں تک کہ سفید پوش تک برباد ہو گئے۔ اس حال میں شعراء اور اہل کمال کے مجمع تتر بتر نہ ہوتے تو کیا ہوتے ایک ہلڑ پڑ گئی، کوئی ٹونک گیا تو کوئی بھوپال، اس نے الور کا راستہ لیا تو اُس نے جیپور کا۔ غرض کہ مرشد آباد، بھاولپور، حیدر آباد اور رامپور اطراف و جوانب میں جتنی ہندوستانی ریاستیں تھیں سب ان قسمت کے ماروں کی منزل مقصود بن گئیں۔

الور کے حکمران مہاراجہ شیودھان سنگھ نے ظہیرؔ و تشنہؔ شاگردانِ ذوقؔ، اور میر مہدی مجروحؔ و سالکؔ شاگردان غالبؔ کی بڑی قدر کی۔[1] ایسے آڑے وقت میں دلی اور لکھنؤ سے مساوی فاصلہ پر ہونے کی وجہ سے رامپور جن ہستیوں کو اپنے دامن میں سمیٹ سکا وہ اس کے لیے باعث صد ہزار ناز ش ہیں۔ علماء میں

---

[1] تاریخ ادب اُردو (ترجمہ) صفحہ ۲۰۸۔

عبدالحق معقولی، ارشاد حسین، سید حسن شاہ محدث اور مفتی سعد اللہ، عبدالعلی تھے۔ شعراء کے طبقے میں امیر، بحر، امیر، داغ، جلال، تسلیم، منیر، قلق اور آغا حجو شرف وغیرہ کا ایک جگہ جمع ہو جانا رامپور کے دربار کے لیے باعث فخر نہیں تو اور کیا تھا۔

کچھ شعراء واجد علی شاہ کے پاس مٹیا برج چلے گئے تھے۔ ان میں برق، درخشاں، مرزا سینا عیش، آغا حجو شرف (جو بعد میں رامپور آ گئے تھے)۔ یاور، قیصر، بہار، صولت، مائل زیادہ مشہور ہیں۔ ان میں سے شرف کا ایک شعر بیحد مقبول ہے :۔

جھٹپٹا وقت ہے بہتا ہوا دریا ٹھہرا
صبح سے شام ہوئی دل نہ ہمارا ٹھہرا

یہ بزرگ ہمارے لیے کتنے ہی قابل تعظیم کیوں نہ ہوں، مگر ڈاکٹر عبداللطیف کے الفاظ ہیں :۔

"ان کی شاعری صرف داخلی پہلو رکھتی تھی اور اس کی بھی یہ حالت تھی کہ تخلیقی ادب سے کوسوں دور تھی . . . سچ تو یہ ہے کہ ان کے زمانے میں شاعری صرف مرصع کاری بنکر رہ گئی تھی۔ فارسی تخیل کو اردو لباس عطا کرنا بس یہی ان کا کارنامہ تھا۔"

اور صاحب گل رعنا صفحہ ۲۶ پر لکھتے ہیں :۔

"خیالات کے اعتبار سے اس دور کے شعراء کا کلام پڑھو تو ان میں کسی طرح کی تازگی نہ پاؤ گے وہی گل و بلبل کی داستان، شمع و پروانہ کا قصہ، لیلیٰ مجنوں کی کہانی، جفائے ناز، رشک اغیار، شوق وصال، رنج فرقت، زلف پریشاں، چشم فتاں، نرگس بیمار، سیب زنخدان، رندی اور بادہ خواری، زاہدوں پر طعن و تعریض کے مضامین کو الفاظ کی الٹ پھیر اور ردیف و قافیہ کے ادل بدل سے باندھ کر مختلف شکلیں پیدا کر لی ہیں۔"

فاضل مولف کی یہ رائے بیشک بہت جچی تلی ہے۔ درحقیقت اس عہد کے شعراء کا کمال صرف متذکرۂ بالا مضامین کو مختلف سوانگ میں پیش کرنا تھا اور بس اسی کی وجہ؟ بات یہ ہے کہ شعراء کا یہ گروہ عام طور پر یا تو گذشتہ اساتذۂ لکھنؤ ناسخ و آتش کے اسکول کا پیرو تھا، یا ذوق کے مذاق سے متاثر۔ ان میں کے

بہت سے اساتذۂ متاخرین کے شاگرد تھے۔ اس لیے اگلوں کے وضع کردہ قوانین پر عمل کرنا ہی اپنی سعادت سمجھتے تھے۔ حق یہ ہے کہ اس کو نباہنے میں اپنے کمال کا ثبوت دے گئے! وراپنی ساری جودت طبع زبان کی صفائی اور بندش کی چستی پر صرف کر ڈالی! ستعاروں اور تشبیہوں کی نامطبوع شکلوں سے بچے رہنا ہی ان کا بڑا کارنامہ ہے۔ پھر بھی بعض حضرات کہیں کہیں اس سے ملوث ہو ہی گئے۔ منشی منیر کا ایک شعر مثالاً پیش کیا جاتا ہے:۔

چھتر اچلا فلک پہ بت خانہ جنگ کا
چھوٹا ہے فیل گاو پہ کت تفنگ کا

شعر پڑھنے سے پہلے ہی ہنسی آجاتی ہے۔ حالانکہ منیر وہ شخص تھا کہ بقول امیر اللہ تسلیم رامپور کا ہر شاعر ان کا لوہا مانتا تھا[1]! ور تشبیہ اور استعارے میں محسن کے سوا اس عہد میں ان کا جواب ہی نہ تھا ان کے چند شعر تمثیلاً پیش کئے جاتے ہیں:۔

کعبہ کے سامنے دل خانہ خراب تھا — یہ جھونپڑا "حضور محل" کا جواب تھا
مہمان ایک رات رہا صبح چل بسا — خوشبوئی دلہن کی ہما را شباب تھا
جماہی لینے میں منھ کا یہ معمول — کبھی کچی کلی تھی گہہ کھلا پھول
گندھی چوٹی بندھے جوڑے کھلے بال — کہیں سمٹا کہیں بکھرا ہوا جال

اخیر کے دو شعر ان کی مثنوی معراج المضامین کے "صبح بنارس" والے مقام سے لیے گئے ہیں اس دور کا سب سے بڑا غزل گو شاعر داغ ہے جس کے تغزل کی بنیاد ہی بانکپن پر ہے "زبان کی صفائی روزمرہ کی خوبی اور محاوروں کی فراوانی میں ان کا مثل نہیں۔ دوسرے درجہ پر جلال ہیں جن کی زبان اور طرزادا لکھنؤ کی روزمرہ اور طریقۂ بیان کا بہترین نمونہ کہا جاتا ہے مضمون آفرینی ... اور شکوہ الفاظ میں امیر فرد ہیں[2]۔

[1] اس کے راوی مرزا عاشق حسین بزم اکبرآبادی ہیں۔ رامپور کے دربار سے ان کا تعلق بھی تھا۔

[2] گل رعنا صفحہ ۵۰۷۔

غرض کہ داغ کا بانکپن، امیر کی مضمون آفرینی، جلال کا لوچ جو اہل زبان کا طرۂ امتیاز ہے، تسلیم کے الفاظ کی رنگینی اور مضمون کی دل آویزی۔ منیر اور محسن کی تشبیہیں اور استعارے اس عہد کی یادگار چیزیں ہیں۔ یوں تو انگریزی تعلیم اس سے کہیں پہلے دوسرے مقامات میں رس بس چکی تھی، لیکن مشرق و مغرب کا پہلا سنگم دلی میں ہوا تھا۔ مگر یہ بہار چند روزہ تھی . . . یہاں کچھ اور بدی تھی ۱۸۵۷ء کی شورش میں "مشرق و مغرب کا یہ پہلا سنگم" (دلی کالج) بھی لٹا اور بند ہو گیا۔ اس کے بعد حالانکہ یہ پھر کھلا، مگر حالات تبدیل ہو چکے تھے اور ۱۸۷۷ء میں ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا اسی "مرحوم دہلی کالج" کا ایک طالب علم جدید اردو شاعری کا بانی کہا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ کرنل ہالرائیڈ کی (جو پنجاب کے سررشتۂ تعلیم کے ناظم تھے) سرپرستی نے آزاد کی مساعی کو ضائع ہونے سے بچا لیا۔ ۱۸۷۴ء میں انجمن پنجاب کی سرپرستی میں ایک جدید قسم کا مشاعرہ لاہور میں منعقد کیا گیا۔ اس میں بجائے مصرعہ طرح، نظم کے لیے موضوع تجویز کیا گیا تھا۔

کرنل ہالرائیڈ کے اثر اور آزاد کی کوششوں سے یہ مشاعرے کامیاب ہونے لگے اور جدید رنگ سے اردو والوں کی طبیعتیں مانوس ہونے لگیں۔ مگر آزاد کی شہرت بحیثیت شاعر اب ہے نہ اس وقت تھی۔ وہ تب بھی نثار تھے اور آج بھی اسی نظر سے دیکھے جاتے ہیں اس لیے اگر مولانا حالی ان کا ہاتھ نہ بٹاتے تو ان کی کوششوں کا بار آور ہونا یقیناً بعید مشکل تھا۔ حالی پہلے شاعر تھے، پھر نثر نگار بحیثیت شاعر ان کی شہرت مستقل ہو چکی تھی جس کا اثر پڑا۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنی کثرت نگاری سے جدید اردو شاعری کو ان گنت فائدے پہنچائے۔ قدیم دیوتاؤں کو معزول کر کے نئے خدائے شاعری کو بچولانے میں انکی تحریروں نے حیرت انگیز کام کیا۔ سب سے زیادہ اثر کرنے والی اور ان کی ان تھک کوششوں کا بڑا مجموعہ "مقدمۂ شعر و شاعری" ہے جو بجا طور پر نئے مذہب کی آسمانی کتاب سے کم نہیں۔

یہاں یہ سمجھنا غلطی ہے کہ حالی کی اصلاحی شاعری آزاد سے متاثر ہوئی، خود مولانا حالی کا قول ہے کہ "میں شیفتہ اور پھر مرزا غالب سے متاثر ہوا ہوں"۔ شیفتہ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں "وہ مبالغہ کو ناپسند

---

[۵] مقدمات جلد دوم صفحہ ۵۰۔

کرتے تھے اور حقائق و واقعات کے بیان میں لطف پیدا کرنا سیدھی سادی باتوں کو محض حسن بیان سے دلفریب بنانا اپنا منتہائے کمال سمجھتے تھے[1]۔ یہ درحقیقت خود مولانا کے کلام کی حالت ہے" مقدمات جلد دوم" صفحہ (۵۱) پر یہ عبارت دیکھنے میں آئیگی "چنانچہ ان کا (حالی کا) قدیم کلام بھی ان عیوب سے پاک ہے جو اُردو شاعری کی بدنامی کا باعث ہوئے . . . ان کے حقیقی دماغی آبا عرب جاہلیت اور ما بعد کے شعراء ہیں۔ ان کی بعد کی شاعری میں شعرائے عرب کا روحانی اثر ہے جو اُن اساتذہ کے کلام کے مطالعہ سے نامعلوم طور پر ارثاً مولانا کو پہنچا۔"

یہ سب کچھ صحیح ہے مگر جدید اُردو ادب کا طالب علم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ حالی کو حالی بنانے والے دراصل سرسید تھے۔ انھوں نے حالی کی قابلیت کو پرکھا اور ان سے ایسا کام لیا جو غالباً انھیں سے ممکن تھا۔ دراصل حالی کو غیر فانی بنانے والا ان کا مسدس "مد و جزر اسلام" ہے۔ حالی سرسید سے ملے بغیر بھی لکھ سکتے تھے یا نہیں ادب کا یہ مسئلہ بلا شبہ بحث کے لیے ایک دلچسپ موضوع ہے۔ میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ قوم سے "کافر و ملحد" کا خطاب پانے والا شخص ایسی شخصیت رکھتا تھا جس کی کشش سے ایسے ایسے لوگ اس کی طرف کھنچے آتے تھے جو اس کے اثر سے ملک میں روشن ستارے بن کر چمکے۔ حالی بھی ان میں کے ایک تھے۔ خود حالی نے اپنی اس سرگزشت کو نہایت دلکش پیرایہ میں مسدس کے دیباچہ میں لکھا ہے[2]۔ دراصل قدرت نے سرسید کو اصلاح کے اس سرچشمے پر لاکر بٹھادیا تھا کہ وہیں سے اس کی تمام سوتیں بہہ کر نکلتی ہیں[3]۔

جدید اُردو ادب کے بانیوں میں جتنی اہم شخصیتیں ہیں سب اس "امام وقت" سے بلا واسطہ یا بالواسطہ متاثر ہوئیں۔ ایک آزاد کو اس سے الگ سمجھو۔ شبلی بھی اس سرچشمے کی ایک شاخ تھے۔ شبلی کا تقرر علی گڈھ کالج میں فارسی کی پروفیسری پر ہوگیا تھا۔ ان کو سرسید سے کچھ ایسا اُنس ہوگیا کہ وہ شہر چھوڑ کر کالج کی فضا میں آرہے اور سرسید کی کوٹھی سے متصل ایک مکان لیکر فروکش ہوگئے۔ اس زمانے میں حالی کا سب سے زیادہ پرجوش خیر مقدم

---

[1]۔ مقدمات عبدالحق جلد دوم صفحہ ۵۱۔

[2]۔ "مقدمات" سے ملخص۔

[3]۔ جدید اُردو شاعری صفحہ ۸۲۔

کرنے والے ہی تھے اور شعر و سخن کی اصلاح میں بھی حالی کی ہمنوائی کا دم بھرتے تھے۔ مثنوی "صبح امید" (۱۸۸۳ء) پر حالی کا اثر نمایاں ہے اور دوسری نظم "مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم" بھی جو مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں پڑھی گئی انھیں اثرات کا نتیجہ تھی۔ یہ صحبتیں اور اصلاحی کوششیں سرسید کی زندگی تک برابر قایم رہیں، یہاں تک کہ ۱۸۹۸ء میں یہ مجدد اعظم ناقدر شناس قوم کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلا گیا اور شبلی تھوڑے دنوں بعد حیدرآباد چلے آئے۔ پھر ان کے خیالات کچھ ایسے تبدیل ہوئے کہ ۱۸۹۴ء میں انھوں نے خود ایک نیا تعلیمی ادارہ "ندوۃ العلماء" مولانا سید محمد علی صاحب کانپوری کے ساتھ مل کر قایم کیا، جس کا مقصد جدید طرز تعلیم کی اصلاح تھا۔ اس میں بھی جی نہ لگا تو اعظم گڈھ میں ۱۹۱۳ء میں "دار المصنفین" کا سنگ بنیاد رکھا اور اس اخیر کارنامے کے بعد ۱۹۱۴ء میں علم و ادب کا یہ چراغ بھی گل ہو گیا۔

حالی عمر بھر مسلمانوں کے تنزل کا مرثیہ پڑھتے رہے، شبلی بھی سوز خوانی میں ان کے "بازو" تھے لیکن حالی مسلمانوں کی پستی کا سبب ان کے مادی امور میں پیچھے رہنے کو سمجھتے تھے اور شبلی اس کی وجہ اصول و روایات اسلامی سے انحراف بتلایا کیے۔ آج کل اقبال اور اپنے زمانے میں اکبر الٰہ آبادی اسی اسکول کے پیرو تھے۔

اکبر کی شاعری کا موضوع وہ حالات ہیں جو مغرب کی تقلید سے ہند میں پیدا ہوئے جو ان کے خیال میں مشرقی روایات کے بالکل برعکس تھے۔ بات یہ ہے کہ اکبر ایک قسم کے قدامت پرست تھے اور اسلام سے ان کو بیحد ہمدردی تھی۔ نئی روشنی کے ہنگاموں اور یورپ کی اندھی تقلید کو دیکھ کر ان کے دل میں نفرت کے شعلے اُٹھے اور ان کا قلم خاکہ اڑانے اور ہجو لکھنے پر اڑ گیا۔ اسی زمانے میں "اودھ پنچ" جاری ہوا تھا۔ ۱۸۷۷ء سے ۱۸۸۰ء تک اکبر کے مضامین اس میں برابر شائع ہوتے رہے۔ یہ مزاحیہ نویسی کی مشق اکبر کو کچھ ایسی بھائی کہ وہ مزاحیہ نگار شاعر بن گئے۔ ان کی شاعری کا سب سے دلچسپ حصہ وہ ہے جہاں یہ پرانے مضمون کا پیوند نئی تحریکوں سے لگاتے ہیں، پھر بھی اکثر ذاتیات پر آجانا ان کے لیے کچھ اچھی بات نہ تھی:-

سید اُٹھے جو گزٹ لے کے تو لاکھوں لائے   شیخ قرآن دکھاتے پھرے پیسہ نہ ملا

اس قسم کے اشعار نہ ہوتے تو اچھا ہی تھا۔ ان کی شاعری کا یہ حصہ چاہے اصلاح ہی کے لیے کیوں نہ لکھا گیا ہو آج تو صرف

ہنسنے ہنسانے کے کام آتا ہے ۔ ہاں :۔

آج بنگلے میں مرے آئی تھی آوازاؤں — جی رہے ہیں ابھی کچھ اگلے زمانے والے

ایسے مقام پر وہ اکثر قابل عزت ہستی بن جاتے ہیں ۔

طباطبائی کے ترجمے بہت مقبول ہوئے Elegy written in a country church yard کا ترجمہ بہت ہی نفیس اور پاکیزہ ہے، مگر ان سے قبل اسمٰعیل میرٹھی نے انگریزی نظموں کے ترجمے شروع کر دیئے تھے، اور وہی اس "بدعت حسنہ" کے بانی ہیں ۔

ترجموں سے قطع نظر اسمٰعیل کی شاعری بھی قابل لحاظ ہے ۔ خالص نیچرل نظمیں آزاد کی پیروی میں لکھنا ان کا مطمح نظر تھا۔ اس میں اضافہ یہ کیا اور اسلوب ایسا رکھا کہ وہ بچوں کے لیے مفید اور دلچسپ بن گئیں۔ اس طرح گویا اُردو شاعری میں ایک اور نئے باب کا اضافہ ہوا۔ سادگی ان نظموں کی جان ہے ۔ نظیر کی طرح سوقیانہ زبان ان کے ہاں نہیں، اور نہ آزاد کی لفظی نقاشی ہے ۔ سادگی بیان اور سادگی خیالؔ ان کی شاعری کی بنیاد ہے ۔ موضوع کا پیش پا افتادہ ہونا بھی ان کی شاعری کی خصوصیت میں داخل ہے ۔

لہ ۔ جدید اُردو شاعری صفحہ ۱۵۶ ۔

(۲)

انقلاب کے اثرات

انقلاب نیچرل نظموں سے شروع ہوا اور اس کی لے قومی نظموں پر ٹوٹی۔ اس جگہ سے پورے عہد انقلاب کی شاعری کا نقشہ پیش کیا جاتا ہے۔ اسمٰعیل کی سادہ نظمیں چاہے وہ بچوں کے لیے لکھی گئی ہوں یا ان میں دیہاتی منظر پیش کیا گیا ہو، انھیں دونوں عنوانات کے تحت آتی ہیں۔ اس کے بعد سنہ ۱۹۱۹ء تک (جو زمانۂ انقلاب کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے) انھیں رنگوں میں نظمیں لکھی جاتی رہیں۔ میں نے غزل گو شعراء کو اس میں شامل نہیں کیا، کیونکہ غزل کسی ایک عنوان کے تحت لکھی نہیں جاتی، یہ ممکن ہے کہ اس میں بیان کے تسلسل سے ایک شعر دوسرے سے ملا ہوا ہو۔

سنہ ۱۹۰۰ء سے سنہ ۱۹۱۹ء تک کے کل شعراء دو گروہوں میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں۔ غزل گو، نظم گو۔ نظم گو سے ایسے شعراء مراد ہیں جنھوں نے علاوہ غزل کے دیگر اصنافِ سخن، مسدس، مثنوی، ترکیب بند وغیرہ کو اپنی فکر کے سانچے بنائے ہیں۔ خاص طور پر مثنوی اس عہد کی مقبول ترین چیز ہے۔ اس میں یہ ترمیم کر دی گئی کہ زمانۂ قدیم میں مثنوی کے لیے چند بحریں مختص تھیں، اور اب یہ قید اٹھا دی گئی۔ زیر نظر دور میں اس صنف کو بہت عروج رہا۔ اس عہد کے مشہور نظم گو شعراء بے نظیر شاہ، سرور جہاں آبادی، شوق قدوائی، اقبال، چکبست، صفی لکھنوی، وحشت، تاثر، کیفی، اور عزیز وغیرہ ہیں، ان کی نظمیں زیادہ تر مثنوی کی شکل میں ملیں گی۔ خاص طور پر شوق قدوائی کی مثنویاں "عالم خیال" اور "حسن" اور "ترانۂ شوق" بہت زیادہ مقبول ہوئیں۔ اور سچے جذبات کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کرتی ہیں۔

دوسری بات جو بہت زیادہ نمایاں ہے وہ یہ ہے کہ ان شعراء کا کل کلام بلحاظ موضوع نیچرل ہے۔ عشقیہ جذبات ان لوگوں نے غزل کے ذریعے ظاہر کئے۔ اب یہ سمجھنا بہت ضروری ہے کہ نیچرل سے ہماری کیا مراد ہے۔ مولانا حالی نے اس لفظ کی یہ تشریح کی ہے :-

"نیچرل شاعری سے وہ شاعری مراد ہے جو لفظاً و معنیً دونوں حیثیتوں سے نیچر یعنی فطرت کے موافق ہو۔ لفظاً نیچر کے موافق ہونے سے یہ غرض ہے کہ شعر کے الفاظ اور ان کی ترکیب و بندش تا بمقدور اس زبان کی معمولی بول چال کے موافق ہو جس میں وہ شعر کہا گیا ہے کیونکہ ہر زبان کی معمولی بول چال اور روزمرہ اس ملک والوں کے حق میں جہاں وہ زبان بولی جاتی ہے نیچر یا سکنڈ نیچر کا حکم رکھتے ہیں۔ پس شعر کا بیان جس قدر بے ضرورت معمولی بول چال اور روزمرہ سے بعید ہوگا اسی قدر اَن نیچرل سمجھا جائے گا۔ معنیً نیچر کے موافق ہونے کا یہ مطلب ہے کہ شعر میں ایسی باتیں بیان کی جائیں جیسی کہ ہمیشہ دنیا میں ہوا کرتی ہیں یا ہوتی جائیں"۔[1]

مولانا حالی کی اس تفصیل سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ شعر کا معنیً مطابق فطرت ہونا اور لفظاً ملک کی معمولی بول چال اور روزمرہ میں ہونا اس کو نیچرل بنا دینے کے لیے کافی ہے۔ چنانچہ مولانا نے بہت سی مثالوں سے اسی مطلب کو واضح کیا ہے اور غزل اور مثنوی وغیرہ کے بہت سے اشعار کو نیچرل ثابت کیا ہے۔

غزل کے علاوہ جن صورتوں میں نیچرل شاعری ظہور پذیر ہوئی وہ حسب ذیل ہے:۔

مناظر قدرت | مناظر قدرت کی مصوری مثلاً صبح و شام کی کیفیت، برسات کی بہاریں وغیرہ شاعر پر اثر کریں اور وہ ان مناظر کی تعریف میں کچھ کہے اور اس طرح کہے کہ اس کے سننے سے دوسروں کے دل بھی متاثر ہو جائیں۔ یہی اس کا کمال ہے اور یہ بات اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس منظر کی سچی تصویر دوسروں کے سامنے پیش نہ کی جائے۔ ظاہر ہے کہ اس کے لیے تخیل کے ساتھ ساتھ قوت بیان اور مشاہدہ کی کتنی ضرورت ہے۔ اسی قوت بیان اور مشاہدہ کا نام شعری مصوری یا محاکات ہے۔

مناظر قدرت کچھ انقلاب ہی کی وجہ سے اردو شاعری میں داخل نہیں ہوتے بلکہ اس سے پہلے

[1] مقدمۂ شعر و شاعری نسخہ ۱۸۹۳ء صفحہ ۹۱ و ۹۲۔

تقلید بتاتا ہے۔ شبلی کا اسکول اس کے برعکس ہے۔ وہ مسلمانوں کو مریض تو سمجھتے ہیں مگر تشخیص حالی کے بالکل خلاف کرتے ہیں اور جدید علوم و تہذیب کی روزافزوں ترقی میں قدیم اسلامی تہذیب کا خون ہوتے دیکھ کر صرف اسی کو ان کی پستی کا سبب قرار دیتے ہیں۔ اسی اسکول کا پیرو اور غالباً سب سے زیادہ مقبول شاعر اقبال ہے۔

۱۹۰۵ء تک اقبال اس رنگ میں نہ تھے۔ ان کی شاعری کا موضوع اتحاد وطن تھا اور قومیت کی بنیاد ان کے خیال میں وطن تھا۔ مگر انگلستان سے واپسی کے بعد ۱۹۰۹ء میں ان کے خیالات میں عظیم تبدیلی ہوئی اور وطنی اتحاد ان کی نظر میں ایک مہمل چیز بن گیا ع

بنا ہمارے حصار ملت کی اتحاد وطن نہیں ہے

اس طرح مذہبی یکسانیت پر قومیت کی بنیاد پھر پڑی اور اس شد و مد سے کہ مطالعہ کرنے والے اقبال کا یورپ جانے سے پہلے کا کلام دیکھ کر اگر "بانگ درا" حصہ دوم و سوم کا کلام دیکھیں تو متحیر ہو جائیں۔ پہلے ان کا ترانہ ع

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

تھا، اور اب ع

مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

ہو گیا۔ اقبال کی نظموں میں مولانا روم اور فارسی کے دیگر صوفی شعرا کا اثر بہت نمایاں ہے، پھر بھی تعجب ہے کہ وہ عجمیت سے بیحد نالاں ہیں اور اس کو مسلمانوں کے حق میں سم قاتل سمجھتے ہیں۔ ایک دفعہ انھوں نے ایک خط میں تحریر کیا:-

"زمانۂ حال میں عجمیت سے اجتناب لازم ہے۔ اس وقت ہر مسلمان کا فرض ہے کہ جو قوت خدائے تعالیٰ نے اسے عطا کی ہے اسلام کی خدمت اور اقوام و ملل اسلامیہ کے احیاء و بیداری میں صرف کرے۔ میری رائے میں عجمیت مسلمانوں کی تباہی کا باعث ہے۔ اس وقت باطل کے ساتھ جہاد کرنا ہر مسلمان کا فرض تھا، عجمیت کا اثر

مذہب، لٹریچر اور تمام زندگی پر غالب ہے۔"[۱]

ظاہر ہے کہ عجمیت کے خلاف جہاد کرنا بھی اقبال کا نصب العین ہے۔ یہ وہی عجمیت ہے جس کے بارے میں اکبر نے کہا تھا۔

ہم میں باقی ہے کہاں خالد جاں باز کا رنگ   دل پہ غالب ہے فقط حافظ شیراز کا رنگ

اس کے علاوہ اقبال کے فلسفۂ زندگی میں عمل کو خاص درجہ حاصل ہے۔ سکون و قرار کو وہ بہت بری نظر سے دیکھتے ہیں:۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی   یہ خاکی اپنی فطرت سے نہ نوری ہے نہ ناری ہے

اس شعر کے علاوہ اور بہت سے اشعار میں اپنے اس نظریہ کو واضح کیا ہے۔ اقبال اس عہد کے سب سے زیادہ ہر دلعزیز شاعر ہیں، اور ان کی شہرت ہندوستان سے گذر کر یورپ تک پہنچ چکی ہے۔ اب تو انھوں نے فارسی میں شعرگوئی شروع کر دی ہے اور اردو کو بالکل بھلا دیا ہے۔ حالانکہ بقول سر عبدالقادر اردو کی یہ بڑی بدقسمتی ہے اور گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے۔

قومی شعراء میں صفی لکھنوی بھی بہت مشہور ہیں، ان کو "لسان القوم" بھی کہا جاتا ہے، جس طرح اقبال مسلمانوں کے ایک طبقے کے خیالات کی ترجمانی اور ان کی اصلاح کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہیں اسی طرح صفی لکھنوی دوسرے طبقے میں کام کر رہے ہیں صفی نے بھی سیکڑوں ہی نظمیں شیعہ قوم کو مخاطب کر کے لکھیں اور ان کی پستی کا رونا رویا۔ سب سے زیادہ طویل اور مقبول نظم "لخت جگر" ہے۔ تقریباً ۲۷ سال سے برابر اس کا کچھ حصہ شائع ہوتا ہے اور پڑھا بھی جاتا ہے۔ یہ دراصل شیعہ کانفرنس کے اجلاس میں پڑھنے کے لیے لکھی جاتی ہے۔ اب وہ اجلاس جہاں منعقد ہوتا ضمناً اس کا ذکر آ جاتا ہے۔ شیعہ کانفرنس تقریباً ۱۹۰۶ء میں قائم ہوئی اور صفی لکھنوی نے اس میں نظمیں پڑھنا شروع کیں اس وقت سے برابر "لخت جگر" میں اضافہ ہوتا رہا۔ اس طرح اگر دیکھا جائے تو یہ نظم بہت طویل ہے، مگر اس کو مسلسل نظم کہنا درست نہیں، اس کی

---

[۱] "کلیات اقبال" مطبوعہ عماد پریس ۱۳۴۳ھ صفحہ ۸۷ - ۸۸۔

ادبیت بھی نہایت عمدہ ہے اور اثر بھی اس میں اچھا خاصا ہے۔ اس طرح اس عہد کے دو بڑے شعراء کا تعلق دو کانفرنسوں سے ہے، اقبال کا انجمن حمایت اسلام لاہور، اور صفی کا شیعہ کانفرنس لکھنؤ سے۔ مگر اقبال کی سی شہرت صفی کو نہیں ملی۔ اقبال کا خطاب عام مسلمانوں سے ہوتا ہے، اور صفی کا صرف ایک فرقے سے۔ کلام کے اثر میں صرف انیس، بیس کا فرق ہے۔ صفی بھی قوم میں قوت عمل پیدا کرنا چاہتے ہیں اور تہذیب جدید سے الگ رہنے کی تلقین کرتے ہیں اور اقبال بھی۔ غرض کہ بہت سی باتوں میں یہ دونوں شعراء یکساں ہیں جوش، اثر و ادبیت دونوں کے ہاں ہے۔ ممکن ہے اقبال کے پاس جوش اور اثر زیادہ ہو۔ بین الاقوامی شہرت میں صفی، اقبال کو نہیں پہنچے۔ اقبال کی اعلیٰ علمیت نے بھی ان کو بہت فائدہ پہنچایا۔ صفی کے ہاں اس کی بھی کمی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ فلسفہ کا جو رنگ اقبال کے پاس ہے وہ صفی کے کلام میں عنقا ہے۔ صفی کا میدان تغزل ہے، اس میں وہ کافی شہرت کے مالک ہیں، اور اقبال اس میدان میں ان کی برابری ہرگز نہیں کرسکتے۔ غزل گو شعراء کے سلسلے میں ان کا ذکر تفصیل سے کیا جائے گا۔

وطنی شاعری ۔ یہاں تک قومی شاعری کی اس شاخ سے بحث کی گئی، جس کا تعلق مذہب سے تھا۔ اسی کی ایک شاخ وطنی شاعری بھی ہے، جس کا ابتدائی زمانہ بھی انقلاب ہے۔ اس کے بعد سرور، چکبست اور اقبال اس رنگ میں کارہائے نمایاں کر گئے۔ "صبح وطن" مجموعہ کلام چکبست میں بہت سی نظمیں اس عنوان کے تحت ملتی ہیں، اور "خمکدۂ سرور" میں بھی اس نشے کی کمی نہیں۔ مگر چکبست اور سرور بھی اپنے مذہبی رنگ کو نہ دبا سکے۔ سرور نے خالص ہندوانی چیزوں پر بہت سی نظمیں لکھیں اور چکبست نے رامائن کا ایک سین لکھا۔

سیاسی شاعری اسی سلسلے میں سیاسی شاعری شروع ہوئی اور ۱۹۱۷ء میں "مسز بسنٹ" بھی ہم ہوم رول کہیں گے کی آواز سنائی دینے لگی۔ اس میدان کے شہسوار حسرت، مولانا محمد علی جوہر اور ظفر علیخاں اڈیٹر زمیندار ہیں۔ موخرالذکر دونوں بزرگوں نے خاص طور پر سیاسی خیالات کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اقبال جیسا شاعر سیاسی شاعری کو ہاتھ نہیں آیا اس وجہ سے اردو شاعری میں اس کا میدان صرف غزل کے بعض اشعار تک رہا اور بس۔

۳

غزل گوئی

غزل ابتدا ہی سے اُردو شاعری میں مقبول ترین صنف رہی ہے۔ قدما سے لیکر آج تک برابر شعراء اور اُردو داں طبقے کو اس کی للک رہی ہے۔ غدر تک تو سب سے زیادہ فروغ اسی کو حاصل رہا مگر اسکے بعد عہد انقلاب نے حالی کے قلم سے اس میں حسب ذیل ترمیموں کا مطالبہ کیا۔

۱۔ غزل میں محبت کا بیان لابدی ہے، مگر یہ کچھ ضروری نہیں کہ اس کا تعلق صرف شاہدان بازاری سے ہو۔ محبت عالمگیر جذبہ ہے، اس لیے اس کو محدود نہ کرنا چاہیئے بلکہ اس کا ذکر ایسے جامع الفاظ میں کیا جائے جو دوستی اور محبت کے تمام انواع روحانی وجسمانی پر حاوی ہوں۔ جہاں تک ہوسکے کوئی لفظ ایسا نہ آنے پائے جس سے کھلم کھلا مطلوب کا مرد یا عورت ہونا پایا جائے، یعنی کلاہ، چیرہ، دستار، سبزۂ خط، زرگر پسر، مطرب بچہ وغیرہ، یا محرم، کرتی، مہندی، چوڑیاں، موباف، آرسی وغیرہ۔

۲۔ خمریات یا اس کے لوازمات کے ساتھ جو زاہدوں وغیرہ کی مٹی پلید کیجاتی ہے وہ ترک کر دینا چاہیئے۔ ایسے مضامین اہل باطن (صوفیائے کرام) نے غزل میں داخل کئے کیونکہ وہ خمریات کے لوازم سے استعارہ کا کام لیتے تھے اور چونکہ اہل ظاہر علما، فقہا، وغیرہ ان پر طرح طرح کی آفتیں ڈھاتے تھے، اس لیے یہ اپنے دل کی بھڑاس ان کی ظاہر داری کے بیان سے نکالتے تھے۔ اور ان کی ریاکاریوں کا پردہ فاش کرتے تھے۔ ہم کو صرف استعاروں میں خمریات کا ذکر کرنا چاہیئے اور فقہا، و زہاد کی ذاتیات سے قطع نظر صرف ان کی ریاکاری کا بیان کرنا چاہیئے۔

۳۔ مذکورۂ بالا مضامین کے سوا جس بات کا سچا ولولہ اٹھے خواہ اس کا منشا خوشی ہو یا غم، حسرت ہو یا ندامت، غرض، شکر، شکایت، صبر، رضا، قناعت، غصہ، تعجب، حب وطن، قومی ہمدردی، رجوع الی اللہ وغیرہ۔ کچھ بھی ہو اس کو بھی غزل میں بیان کرنا چاہیئے۔

۴۔ غزل کو مسلسل بنا دینا چاہیئے۔[1]

۵۔ سنگلاخ زمینوں میں غزل نہ کہی جائے، بلکہ جہاں تک ممکن ہو، ردیف کی قید کم کردی جائے اور قوافی ایسے ہوں جو بکثرت مل سکیں۔[2]

۶۔ صنائع اور بدائع پر کلام کی بنیاد نہ رکھی جائے کیونکہ معنوی خوبیوں کا سررشتہ ہاتھ سے جاتا رہتا ہے۔[3]

۷۔ پہلے زمانے میں دولت وجاہ کے لیے جو غیر معتدل کوششیں جاری تھیں ان کو دیکھ کر ہمارے قدیم شعرا نے توکل اور قناعت کے مضامین باندھے لیکن اب جد وجہد اور رنگ ودو کا زمانہ ہے، اس لیے ہم کو غزل میں سعی اور عمل کے خیالات ظاہر کرنے چاہئیں۔[4]

ان اصلاحی خیالات کے ساتھ مولانا حالی نے جو عاشقانہ جذبات کے ساتھ اس کثرت سے اخلاقی، قومی اور سیاسی خیالات کا اظہار کیا کہ وہ بالکل ایک نئی چیز بن گئی چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں:

ایسی غزلیں سنی نہ تھیں حالی ۔۔۔ یہ نکالی کہاں سے تم نے بیاض[5]

مال ہے نایاب پر گاہک ہیں اکثر بے خبر ۔۔۔ شہر میں کھولی ہے حالی نے دکاں سب سے الگ

اس طرح غزل میں، اخلاق، تصوف، سیاسی خیالات اور قومی جذبات، بلکہ صاحب شعرالہند[6] کے

---

[1] ۔ مقدمہ شعر و شاعری ۱۸۹۳ء ملخص از صفحہ ۱۱۹ تا ۱۳۲۔

[2] ۔ مقدمہ دیوان حالی ۱۸۹۳ء صفحہ ۱۷۶۔

[3] و [4] ۔ ملخص از مقدمۂ دیوان حالی۔

[5] و [6] ۔ شعرالہند صفحہ ۳۶۸ - ۳۶۲۔

خیال میں "علم کلام تک کے نفیس خیالات داخل ہو گئے۔ تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ غزل کی لطافت میں اس سے فرق آ گیا۔ اس لیے جن شعرا نے ان اصلاحات کے ساتھ غزل کی اصلی شان کو بھی قایم رکھنا چاہا انھوں نے لکھنؤ کے قدیم رنگ کو چھوڑ کر قدما کی سادہ روش اور دلّی کے متانت آمیز رنگ کو اختیار کیا۔"

میں اس میں اتنا اضافہ اور کرنا چاہتا ہوں کہ دربار رامپور میں غدر کے بعد شعرا کا جمگھٹا غزل کے حق میں جہاں نقصان رساں ہوا اس سے کچھ فائدے بھی پہنچے۔ وہ یہ کہ جلاؔل، امیر اللہ تسلیمؔ، امیر مینائی وغیرہ نے اپنا رنگ نہ جمتے دیکھ کر یا روابط و رواسم کی وجہ سے دلّی کی شاعری سے اثر لیا۔ جلاؔل کے کلام میں یہ رنگ صاف جھلکتا ہے اور تسلیمؔ نے خود کہا ہے:-

میں ہوں اے تسلیمؔ شاگرد نسیم دھلوی — مجھکو طرز شاعران لکھنؤ سے کیا غرض

انھیں تسلیمؔ کے شاگرد مولانا حسرؔت موہانی ہیں جو "جدید غزل کے احیا کے سبب[۱] ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ انھوں نے غزل کو تکلف و تصنع سے پاک کر دیا۔ ان کی غزل میں اگرچہ فلسفیانہ خیالات بھی پائے جاتے ہیں مگر غالبؔ کا معنی آفریں انداز حسرؔت کی غزل سے کم مناسبت رکھتا ہے۔ وہ حُسن کاری کو زیادہ پسند کرتے ہیں اس لیے میرؔ کی طرف زیادہ مائل ہیں۔

حسرؔت کی زبان شستہ و رفتہ، اور ان کا طرز بیان شگفتہ اور خوشنما ہے۔ ان کی نرالی ترکیبیں، بولتے ہوئے فقرے، اور بانکے اور اچھوتے ٹکڑے پُر کیف ہیں، اور وجد آور ہیں، اور سُننے والے کے دل میں تیر کی طرح اترتے چلے جاتے ہیں:-

حُسن بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا — کیا کیا میں نے جو اظہار تمنا کر دیا

وہ دُور ہی سے ہمیں دیکھ لیں یہی ہے بہت — مگر قبول ہمارا سلام ہو جائے

مجھ سے تم چھپنے لگے، اچھا کیا، یونہیں سہی — اور جو میں اب دیدۂ دل سے تمہیں دیکھا کروں!

---

[۱] جدید اردو شاعری صفحہ ۲۶۲۔

گرفتارِ مصیبت ہوں اسیرِ دامِ الفت ہوں — میں رسوائے جہاں آرزو ہوں یعنی حسرت ہوں

بڑھ گئیں تم سے تو مل کر اور بھی بیتابیاں — ہم یہ سمجھے تھے کہ اب دل کو شکیبا کر دیا

جنوں کا نام خرد پڑ گیا خرد کا جنوں — جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

عشق سے حاصل ہوئی کیا کیا پشیمانی مجھے — عشق جب دینے لگا تعلیم نادانی مجھے

دراصل اس عہد کے غزل گو دو گروہ میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں۔ اول وہ جو انقلاب سے بالکل متاثر نہیں ہوئے مثلاً جلیل، حفیظ جونپوری، ریاض شاگردان امیر مینائی۔ مرزا رسوا، نظم طباطبائی، بزم اکبرآبادی شاگردان تیر شکوہ آبادی۔ سائل دھلوی، بیخود دھلوی، نوح ناروی، آغا شاعر دھلوی، احسن مارہروی شاگردان داغ۔ یہ سب ایک لکیر پر چل رہے ہیں۔ ان سب کا مطمح نظر داغ کا رنگ ہے۔ زبان کی سلاست اور عاشقانہ جذبات ان کی شاعری کا ماحصل ہیں۔ ان میں ریاض خیرآبادی خمریات کے لیے بہت مشہور ہیں۔ داغ کی شوخی اور بانکپن بھی ان کے ہاں بہت ہے:۔

غلط ہے آپ نہ تھے ہم کلام خلوت میں — عدو سے آپ کی تصویر بولتی ہوگی

کوئی منہ چوم لیگا اس نہیں پر — شکن رہ جائے گی یونہی جبیں پر

جناب شیخ نے جب پی تو مسکرا کے کہا — مزہ بھی تلخ ہے کچھ بو بھی خوشگوار نہیں

رندانہ مضامین کے باندھنے میں استاد اور اس عہد میں فرد ہیں مگر کبھی کبھی اس میں بھی حد اعتدال سے تجاوز کر جاتے ہیں:۔

بانس پر میکدہ میں تجھکو چڑھایا اے شیخ — پھر بھی اونچے تری مسجد کے منارے نکلے

جہاں حد اعتدال میں ہوتے ہیں طبیعت کو پھڑکا دیتے ہیں:۔

کیا جام دیا ہے مجھے کیا جام دیا ہے — ساقی کا بھلا ہو مرے ساقی کا بھلا ہو

صرف الفاظ سے رند سرشار کی خوش مستی کی تصویر کھینچی ہے:۔

چھلکائیں لاؤ بھر کے گلابی شراب کی — تصویر کھینچیں آج تمھارے شباب کی

مئے ریاض آپ بھی پیتے ہیں بایں ریش سفید — ہائے یہ نور کی شکل اور سیہ کاروں میں

جام ملے تو بہ شکن، توبہ مری جام شکن　　　سامنے ڈھیر ہیں ٹوٹے ہوئے پیمانوں کے

اس ڈگر کے جتنے چلنے والے ہیں ان کا اصل مطمح نظر روز مرہ کی خوبی، زبان کی صفائی اور بندش کی چستی ہے۔

دوسرا گروہ اعتدال پسند شعرا کا ہے۔ یہ جدید رجحانات سے متاثر ہوئے، ان میں قابل ذکر "حلقۂ معیار" کے لکھنوی شعرا ہیں۔ علی حیدر دل، مہدی حسین ناصری مرحوم، واجد حسین یاس، صفی، عزیز، ثاقب لکھنوی آرزو، جانشین جلال، کاظم حسین محشر، نوبت رائے نظر، حکیم علی محسن ابر اور رضا علی وحشت لکھنوی وغیرہ

حلقۂ معیار | یہ ایک ادبی ادارہ تھا، اس کی روح رواں اور بانی حامد علی خاں بیرسٹر تھے۔ درحقیقت جعفر علی خاں اثر کے قول کے مطابق ع بہت ممنون ہے اردو ادب حامد علی خاں کا[1]

اس عہد کے جتنے مشہور لکھنوی شعرا ہیں وہ سب اس میں شریک تھے اور ان کا ادبی نصب العین بھی قریب قریب ایک تھا۔ قدیم شعرا (میر و غالب) کے رنگ کی پیروی اور لکھنؤ کی شاعری کے ارتفاع میں اس سوسائٹی نے بہت کام کیا۔ جب تک حامد علی خاں زندہ رہے یہ بھی کچھ نہ کچھ کام کرتی رہی۔ ان کے مرتے ہی وہ صحبتیں بھی ختم ہو گئیں، کچھ جھگڑے اٹھ کھڑے ہوئے اور اس کے ممبروں میں چل گئی . . . . .

لکھنؤ کے ان شعرا میں جو رنگ جھلکتا ہے وہ سید تعشق، جلال اور تسلیم کا کہا جا سکتا ہے۔ ان لوگوں نے نہایت سختی سے مسی، چوٹی وغیرہ کے ذکر کو غزل سے دور رکھا۔ یہ عام طور پر میت، نزع، گور غریباں کے مضامین ضرور باندھتے ہیں۔ ممکن ہے یہ لکھنؤ کی اس فضا کا اثر ہو جو انیس اور ان کے پیرو مرثیہ گویوں نے پیدا کر دی تھی یا یہ کہ ان کے خیال میں غزل میں سوز و گداز پیدا کرنے کا یہ ایک آسان طریقہ ہو۔ پھر بھی اس میں بعض شعرا خاص طور پر قابل ذکر ہیں اور ان کے کلام کا ایک مخصوص رنگ ہے ان میں عزیز بھی ہیں۔ عزیز کا کلام تمام شعرائے لکھنؤ میں سب سے زیادہ رنگین ہوتا ہے اکثر تصوف کی چاشنی بھی ہوتی ہے۔ بہار کے مضامین بھی خوب کہتے ہیں۔ انکے قصائد بھی بہت ہیں، جن کی تشبیب عام طور سے یا تو غزل سے شروع ہوتی ہے، جس میں فراق کی حالت بیان

---

[1] اثرستان۔ دیوان جعفر علی خاں اثر۔

کیجاتی ہے، یا بہار کا سماں باندھا جاتا ہے۔ بہر حال پورے قصیدہ پر تغزل چھایا رہتا ہے۔ یہ حال اس دور کے اکثر قصیدہ نگاروں کا ہے، صرف طباطبائی اس سے بچے ہوئے ہیں۔ مبالغہ البتہ متاخرین سے کم ہوتا ہے۔ صفیؔ، اور محشرؔ بھی قصائد کہتے ہیں، اور محشرؔ تو "مداحِ آلِ محمدؐ" کے خطاب سے مشہور ہیں۔ انکے قصائد بھی اسی رنگ کے ہوتے ہیں۔ قوت شاعری میں صفیؔ ان سب سے بڑھے ہوئے ہیں۔ مگر رنگینی ان کے کلام میں کم ہے سوز و گداز بھی کچھ زیادہ نہیں اک افسردگی البتہ بہت نمایاں ہے۔

مرزا واجد حسین یاسؔ عظیم آباد (پٹنہ) کے رہنے والے تھے لکھنؤ میں شادی کر کے وہیں مقیم ہو گئے۔ ان کے پہلے دیوان "نشتر یاس" کے شائع ہونے پر ایک طوفان بدتمیزی اٹھا تھا۔ عارفؔ، اوجؔ وغیرہ بھی (جنھوں نے اس پر رائے لکھی تھی اور ان کو لکھنوی زبان میں مہارت کی سند دی تھی) سوالات کی بھرمار سے پریشان کئے گئے، اور "معیار" میں بھی ایک عرصہ تک ہنگامہ رہا لکھنوی شعرا تقریباً سب کے سب ان سے ناراض تھے۔ آخر کار ان کو لکھنؤ چھوڑنا پڑا، حلقۂ "معیار" کا خاتمہ بھی ہو گیا اور اسی دن سے جتھا بندی شروع ہو گئی۔ ان کا دوسرا دیوان "آیات وجدانی" اور رباعیاں "ترانہ" کے نام سے شائع ہو گئی ہیں۔ آتشؔ کے کلام سے بہت متاثر ہیں چنانچہ خود کہتے ہیں ع

یہ کون حضرت آتشؔ کا ہم زباں نکلا

اچھا خاصا کہتے ہیں، اور بعض شعر تو خوب ہی ہوتے ہیں:۔

دھواں سا جب نظر آیا سوادِ منزل کا ۔۔۔ نگاہِ شوق سے آگے تھا کارواں دل کا

بجز ارادہ پرستی خدا کو کیا جانے ۔۔۔ وہ بد نصیب جسے بخت نارسا نہ ملا

یکساں کبھی کسی کی نہ گذری زمانہ میں ۔۔۔ یادش بخیر بیٹھے تھے کل آشیانہ میں

مہدی حسین ناصری بڑے قابل لوگوں میں تھے، فارسی، عربی، اور انگریزی میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ غزل میں قید خانہ کے مضامین خوب کہتے تھے۔ آرزو، ڈرامہ بھی لکھتے ہیں، اور جلالؔ کے سچے پیرو ہیں۔ بڑی بحروں میں اکثر خوب شعر نکالتے ہیں۔ سوز و گداز ان کے اشعار میں کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا ہے۔ "فغانِ آرزو" ان کا دیوان" شائع ہو چکا ہے، کہنہ مشق شاعر ہیں۔

ان کے علاوہ اُس وقت پیارے صاحب رشید، عارف، دولھا صاحب عروج اور اوج لکھنؤ کے اساتذہ میں شمار ہوتے تھے۔ ان بزرگوں نے غزلیں بھی کہی ہیں، مگر دراصل یہ مرثیہ گو تھے۔ مرثیہ کو ترقی دینا تو کجا انیس و دبیر نے جہاں تک اس کو پہنچا دیا تھا وہاں اس کو برقرار بھی نہ رکھ سکے۔ پھر بھی انکی مشاقی میں شبہ نہیں۔ مرثیہ میں "ساقی نامہ" کا اضافہ انھیں حضرات نے کیا۔ رشید نے مرثیہ میں بہار کے مضامین خوب خوب نظم کئے ہیں۔

ان شعراء کے علاوہ شاد عظیم آبادی، فانی، حسرت بھی غزل کے استاد ہیں۔ یہ تینوں حضرات محسنین غزل کہے جانے کے مستحق ہیں اور تغزل کا جتنا اچھا معیار ان حضرات نے قائم کر دیا ہے لائق صد ہزار آفرین ہے۔ ان سب پر میر و غالب کا رنگ چھایا ہوا ہے یعنی میر کا سوز و گداز بھی ہے اور غالب کا فلسفیانہ انداز بیان بھی۔ شاد کا ایک مطلع ہے:-

تمناؤں میں اُلجھایا گیا ہوں　　کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں

کلام کے بیشتر حصہ کا یہی حال ہے۔ مگر کثرت نگاری کی وجہ سے اثر ہر جگہ نہیں پایا جاتا۔ کچھ اشعار اس موقع پر لکھے جاتے ہیں:-

میں، حسرت و حیرت کا مارا، خاموش کھڑا ہوں ساحل پر　　ہے بحر محبت کی یہ صدا، آ، کچھ بھی نہیں پایاب ہیں ہم
مُرغانِ قفس کو پھولوں نے اے شاد یہ کہلا بھیجا ہے　　آنا ہو اگر تو آ جاؤ، ایسے میں ابھی شاداب ہیں ہم

ستم ہے آدمی کے واسطے مجبور ہو جانا　　زمیں کا سخت ہو جانا، فلک کا دُور ہو جانا

ہزاروں آرزوئیں ساتھ ہے پھر بھی اکیلی ہے　　ہماری روح بن بوجھی ہوئی اب تک پہیلی ہے

جب اہلِ شوق کہتے ہیں افسانہ آپ کا　　سُن سُن کے مسکراتا ہے دیوانہ آپ کا

جلوہ گر بعد کو ہوگا رُخِ نورانیِ عشق　　پہلے اک شکل بھیانک سی نظر آئے گی

دیکھا کئے وہ مست نگاہوں سے بار بار　　جب تک شراب آئے کئی دور ہو چکے

فانی نے اس رنگ میں تصوف کی چاشنی بہت زیادہ کر دی۔ ان کے رنگ کو ایک شخص نے "فلسفہ ادبی بیکراں" کہا تھا! در واقعہ بھی ہے کہ فلسفیانہ مسائل کو نہایت شگفتہ انداز سے کہتے ہیں۔ سوز و گداز جتنا ان کے

کلام میں ہے کسی کے ہاں نہیں پہلے لکھنؤ کے رنگ میں کہا کرتے تھے چنانچہ "دیوانِ فانی" میں جو بدایون سے ۱۹۱۷ئہ میں شائع ہوا اس رنگ کے بہت سے نمونے ہیں۔

فانی کے کلام میں اب تصوف کا بہت گہرا رنگ آگیا ہے، اور اس کے ساتھ سوز و گداز بھی ہے جس کی وجہ سے کلام میں اثر پیدا ہوگیا ہے۔ یہ بڑی سے بڑی حقیقت کو اس سادگی اور پرکاری سے ادا کر جاتے ہیں کہ بسا اوقات اہل نظر بھی اس سے گذر جاتے ہیں۔ جذبات کی مصوری تخیل کی بلندی اور واقعات و واردات کی نزاکتوں کے ساتھ بہت کم کی جا سکتی ہے لیکن جناب فانی میں یہ کمال بدرجۂ اتم موجود ہے[1]۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے ان کے سوز و گداز کی وجہ سے انکو "یاسیات کا امام" کہا ہے:۔

عطائے لذتِ سوز و گداز کی خاطر	اذیتوں کے خزانے لٹا دیئے تو نے
سرورِ عقل و غمِ عشق کے دوراہے پر	بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگا دیئے تو نے
دنیا میری بلا جانے مہنگی ہے یا سستی ہے	موت ملے تو مفت نہ لوں ہستی کی کیا ہستی ہے
وفا کیا جفا جانے دو اب یہ ذکر ہی کیا ہے	محبت ہی نہیں تو پاسِ آدابِ محبت کیا
نگاہِ شوق کے دم تک تھیں آنکھیں	اب آنکھیں یادگاریں ہیں نظر کی
دھیان تیرا، بہشتِ شوق سہی	دلِ عاشق ہے ایک دوزخِ راز

حسرت موہانی کا ذکر کیا جا چکا ہے، یہاں مجموعی طور پر ان شعراء کے کلام کے متعلق کچھ عرض کرنا ضروری ہے۔

سوز و گداز جو انقلاب سے پہلے بالکل مفقود ہوگیا تھا، انھوں نے غزل میں داخل کیا ہر قسم کے جذباتی مضامین بھی باندھے۔ سیاسی مضامین کو قفس نشیمن اور صیاد کے پردے میں خوب خوب ادا کیا۔ اس قسم کا ایک شعر ہے:۔

[1] مقدمہ باقیاتِ فانی صفحہ ۷۶ و ۸۰۔

اپنی منقاروں سے حلقہ کس رہے ہیں جال کا   طائروں پر سحر ہے صیاد کے اقبال کا

تصوف کے حقائق و معارف اور اخلاق کے نکات و مسائل کو دلاویزی سے نظم کیا کثرت سے نئی ترکیبیں استعمال کیں جن کی وجہ سے ادائے مطالب میں آسانیاں پیدا ہوگئیں تمنائے خام، آتش سیال، شعلۂ بالیدہ، شوقِ بیتاب، دوزخ راز، بہشتِ شوق، جنون پردہ در، جانِ بہانہ جو، جلوۂ صد رنگ، وغیرہ۔ ایسی بہت سی ترکیبیں ہیں جو بلا تکلف یہ سب کے سب استعمال کرتے ہیں۔ غزل میں قناعت اور توکل کے مضامین کے علاوہ، عمل، جستجو، طلب اور شوق کے جذبات کو ابھارنے کے خیالات کو بھی موضوع شاعری بنایا ہے۔ رعایت لفظی اور دیگر لفظی و معنوی صنعتوں پر کلام کی بنیاد بہت کم رکھتے ہیں۔ غلو کو ناپسند کرتے ہوئے قوت تخیل کو بے لگام نہیں چھوڑتے۔ فنی حد تک قدیم اصول سے سر مو تجاوز کرنا گناہ کے برابر سمجھتے ہیں۔ قدما کی غزل کے کم و بیش تمام اوصاف ان میں موجود ہیں۔ عام طور پر میر و غالب اس گروہ کے مطمح نظر ہیں۔ غالب کا اثر بہت زیادہ ہے۔ لکھنوی شعراء کے علاوہ کسی کے ہاں محض لطف زبان کی خاطر شعر نہیں کہے جاتے، مگر سادگی زبان کے ساتھ ساتھ روزمرہ اور محاورے کی پابندی کا خیال سب کو ہے۔ حسن و عشق ان کی شاعری کے موضوع ہیں۔ لیکن حسن کو مقید نہیں کرتے۔ حسن ان کے ہاں بہت زیادہ جامع معنی رکھتا ہے۔ اور ان کا عشق متاخرین کے ہوس پرستانہ جذبات والا نہیں ہے۔ ان کے خارجی مضامین صرف سیاسی اور قومی ہوتے ہیں، جن کو قفس، نشیمن، صیاد، قاتل وغیرہ کے استعاروں اور تشبیہوں میں ادا کرتے ہیں۔ غرض کہ دراصل غزل کو زندہ کر کے مقبول عوام نہیں بلکہ "خاص پسند" بنانے والے یہی گنتی کے چند لوگ عزیز، صفی، آرزو، حسرت، شاد عظیم آبادی اور فانی بدایونی ہیں۔

یہ لرزتی ہوئی شمعیں اور جھلملاتے ہوئے چراغ پرانی محفلوں کی یادگاریں ہیں۔ شاد مرحوم تو ہم کو غمزدہ کر ہی گئے۔

آخر میں ایک ظریف شاعر کا ذکر کرنا بھی لازمی ہے، یہ مولانا صفی کے بھائی مقبول حسین ظریف اپنے رنگ میں مہارت تامہ رکھتے ہیں، کہنہ مشق شاعر ہیں، ان کی ظرافت میں ابتذال بالکل

نہیں ہوتا۔ سیاسی نظمیں بھی اسی رنگ میں خوب کہتے ہیں۔ "فیونیوں کا رجز" بہت مشہور چیز ہے۔ اس کے علاوہ ان کا سفرنامہ بھی زعفراں زار ہے۔ مصرعہ پر مصرعہ لگاتے ہیں کمال رکھتے ہیں اور اسی سے ظرافت پیدا کرتے ہیں:-

الفت میں ہر اک نقشہ اُلٹا نظر آتا ہے مجنوں نظر آتی ہے لیلا نظر آتا ہے

"انا لیلیٰ" کا یہ پہلو بھی دیکھئے۔

۱

عہدِ اضطراب

۱۹۱۷ء سے آج تک کا زمانہ اپنے پیشرو عہد سے اتنا ہی مختلف ہے جتنا کہ عہدِ انقلاب غدر کے زمانے سے۔ بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کو یا تو ہم بھلا چکے ہیں یا قصداً ترک کر چکے ہیں۔ معاشی پریشانیاں، سیاسی ہیجینیاں، اور مقتضائے زمانہ سے زندگی کی لاتعداد مصروفیتیں ہمارے دل و دماغ کو بالکل محصور رکھتی ہیں۔ بے راہی اور مسلّمہ اصول سے باغی بننا بیسوی صدی کے اس دور میں ایک عام بات ہو گئی ہے۔ مذہب، سیاست، ادب اور دیگر فنون لطیفہ سب کے سب اسی ہنگامۂ بغاوت کے شکار یا تو ہو چکے ہیں یا ہو رہے ہیں۔ یورپ کا نیا آرٹ اور وہاں کی سنگ تراشی کے نئے اصول شاعری کے نئے سانچے، سیاست کے میدان میں نئے فارسوں کی جولانیاں۔ ان سب کا اگر تجزیہ کیا جائے تو ایک اور صرف ایک نقطہ ایسا ہے جہاں پر ان کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ آزادی بے لگام اور غیر محدود آزادی، ہر چیز میں، ہر شے میں، زندگی کے ہر شعبہ اور ہر رنگ میں۔۔۔ اس کے علاوہ خود ہندوستان میں سیاسی تحریکوں نے ایک تہلکہ مچا رکھا ہے ہندوستان کے بہترین دماغ سب کچھ چھوڑ چھاڑ سیاست میں پھنس گئے ہیں۔ ان کے علاوہ جو افراد ہیں وہ مذہبیت کے شکار ہیں۔ ان دونوں گروہوں کا متصادم نہ ہونا یقیناً تعجب انگیز ہوتا چنانچہ دونوں میں جھڑپ ہوئی اور اس شد و مد سے ہوئی کہ ہنگامۂ آزادی نے جو کچھ دماغی سکون چھوڑا تھا وہ اس کی نذر ہو گیا۔

ہندی اردو کا جھگڑا اسی کا شاخسانہ ہے۔ اردو کو اس سے بہت سخت نقصان پہنچا۔ اول یہ کہ ہندی والے اردو کے نام سے ناک بھوں چڑھانے لگے۔ دوسرا سب سے بڑا نقصان اردو کو یہ پہنچا کہ ایک طرف اسلام کے جوش میں اردو بالکل عربی بنائی جانے لگی اور دوسری طرف ہندی والوں نے اس کو سنسکرت میں تبدیل کرنا شروع کیا۔ حصۂ نثر میں ہم اس کا تفصیل سے ذکر کریں گے۔ یہاں یہ غرض

کرنا ہے کہ اس زمانۂ آزادی میں ہر طرف اپنی اپنی ڈفلی اور اپنا اپنا راگ ہے۔

نوجوان نسلوں میں بہت سے شاعروں کا کلام ایسا ملے گا جو مروجہ بحروں کے قیود اور مستقل الفاظ کی وسعت سے آزاد ہونا چاہتا ہے۔ قدیم اساتذہ کے برخلاف موجودہ شاعر کسی ضابطے میں رہنے کی بجائے آزادہ روی کا خواہشمند ہوتا ہے۔ فطرت کی ظاہری بے ضابطگیوں نے اس کو یہ سبق دیا ہے کہ حسن کا بہترین پہلو انتشار اور بے اصولی ہے۔ ترنم اب ردیف قافیہ اور معین بحروں پر محدود نہیں سمجھا جاتا بلکہ ہندی اور جدید فارسی بحریں اور الفاظ کا تناسب اس مقصد کو پورا کرتا ہے چنانچہ عظمت اللہ خاں نے ہندی بحروں کو اختیار کیا اور ان کے تتبع میں کچھ اور بھی اس رنگ میں آ رہے۔

جدید نظریہ آرٹ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ آرٹ کے نمونے اخلاقی حیثیت سے ہرگز نہیں دیکھے جاتے۔ اس اسکول کا مشہور مقولہ "آرٹ صرف آرٹ کے لیے ہے"۔ اسکر وائلڈ اسی نظریہ کا پرجوش پیرو تھا۔ عظمت اللہ خاں نے اپنی بعض نظموں میں غالباً اسی پر عمل کیا ہے۔ اور لوگوں نے بھی نظم اور نثر دونوں میں ادبیت پیدا کرنے کے لیے اخلاق کے بار سے سبکدوشی حاصل کر لی۔ انگریزی کی بہت سی ایسی نظموں کے ترجمے بھی کئے گئے جن میں جسم عریاں پر ذرا سا بھی حجاب نہیں شیکسپیر کی ایک نظم کے ترجمے کے کچھ اشعار درد و آتشہ سے نقل کئے جاتے ہیں:۔

چھپا، چھپا پرے سینہ کہ جس پہ یخ بستہ — بروج سنگ ہیں، کیا غضب ہے جن کا ابھار
مرے پہ جن کے عیاں ہیں گلاب کی کلیاں — یہ غنچے ہیں کہ جنھیں نذر لائی فصل بہار
یہ ہاکرو دل مسکیں کو پہلے بندہ نواز — اسیر گنبد یخ بستہ ہے جو لیل و نہار[1]

آج کل کے اکثر نقاد، قدیم اردو شاعری پر عریاں نگاری کا الزام لگاتے ہیں، مگر نگاہِ انصاف کہتی ہے کہ شباب یات کا جو عام جذباتی طوفان آج کل کے شعراء کے یہاں ملتا ہے وہ ان غریبوں کے پاس نہیں ہے جو انیسویں صدی یا اس سے قبل گذر چکے ہیں۔ بڑی بلند آہنگی سے جرات اور امانت

---

[1] ۔ شعر الہند صفحہ ۴۴۴۔

وغیرہ پر شرم کو بالائے طاق رکھنے کا الزام لگایا جاتا ہے، مگر ایسا تو نہیں کہ ان کا کل کلام اسی رنگ میں ڈوبا ہوا ہو۔

واسوخت اور بعض مثنویوں کے مخصوص حصوں کے سوا قدیم اردو ادب میں شبابیات کا یہ جوش ہرگز نہ تھا۔ ہزل وریختی وغیرہ کا شمار ادب عالیہ میں اب تک کیا ہی نہ گیا، مگر اب تو یہ ہوتا ہے کہ ایسی نظمیں خاص طور پر ادب عالیہ میں شمار کی جاتی ہیں، اور جدید فطرت نگار شاعر عریاں جذبات اور عریاں تصویریں پیش کرنے میں تامل نہیں کرتا۔

۲

ویسے تو ہزاروں بے راہ رو ہیں۔ مگر شبابیات جوشؔ، حفیظؔ اور اختر شیرانی پر اگر ناز کرے تو ہرگز بیجا نہ ہوگا۔ ان لوگوں نے تھوڑا بہت حجاب ہر جگہ باقی رکھا ہے۔ نوجوانی کے جذبات کو زبان پر یہ بھی لاتے ہیں، مگر مشرقی شرم ابھی ان کی آنکھوں میں موجود ہے اور اسی بات نے ان کے مرتبے کو عام مغرب زدہ فرقے سے الگ کر دیا ہے، ان تینوں میں جوشؔ بہترین صناع ہے۔ پہلے ان کا رنگ صوفیانہ تھا، روح ادب کی نظمیں آج کے جوشؔ کی نظمیں نہیں معلوم ہوتیں۔ آج کا جوش شباب کا ہے۔ جذبات کی فراوانی، ترکیبوں کا حسن اور موضوعوں کا انتخاب شباب کی چھپی ہوئی آگ کی چغلی کھاتا رہتا ہے۔ شاعر کی راتیں، فنافی الشباب کی وارداتیں ہیں۔ خود جوشؔ کو بھی اس کا اعتراف ہے۔

واقعات اپنے بیاں کیجئے کیا کیا اے جوشؔ　　　ایسے ٹکڑے ہیں بہت سے مرے افسانے میں

حفیظؔ اور اختر شیرانی کے پاس بھی ایسی بہت سی رنگین وارداتیں ملتی ہیں، مگر جس چیز نے جوشؔ کو ان دونوں سے بلند کیا وہ فکر اور بیان کی فلسفیانہ جھلکیاں ہیں۔ جوشؔ کا نظریہ شباب وساغر عمر خیام سے بہت مشابہ ہے اور یہی وجہ اس کے امتیاز کی ہے۔ جوشؔ جب کبھی اپنے اس رنگ سے ہٹتے ہیں تو جوش کھو دیتے ہیں۔ اثر تھوڑا بہت پھر بھی باقی رہتا ہے۔ ان کی بعض نظمیں اصلاحی بھی ہیں۔ "ذاکر سے خطاب" اور چند دوسری نظمیں اسی قبیل کی ہیں۔ ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کا صرف دماغی زور ان کی تخلیق کا باعث ہے

سی وجہ سے ان کا اثر بھی صرف دماغ پر پڑتا ہے۔ یہ نہ دل سے نکلی ہوئی معلوم ہوتی ہیں نہ دل پران کا اثر ہوتا ہے۔ تشبیہوں کا رعب، استعاروں کا زور اور الفاظ کا جادو دماغ کو اپنا بنا لیتا ہے مگر دل خاموشی سے اس کان سنتا ہے اور اس کان اڑا دیتا ہے۔

حفیظ اپنی مترنم بحروں کی وجہ سے مشہور ہیں۔ حفیظ کی نظموں کے مجموعہ "نغمہ زار" میں بہت سی نظمیں ایسی ملتی ہیں جن میں یہ خصوصیت موجود ہے۔[1] حفیظ کی موجودہ شہرت در اصل اقبال کے پیرو کی حیثیت سے ہے۔ ان کا "شاہنامہ اسلام" بالکل نقش اول ہی سہی مگر اسلام سے ان کی ہمدردی کی خبر ضرور دیتا ہے! اور اقبال کے اثر کو صاف نمایاں کرتا ہے! اس کی بحر بھی وہ ہے جس کو عام طور پر اقبال کی نظموں سے خصوصیت حاصل ہو گئی ہے۔ اقبال کی "تصویر درد" "محبت" "خطاب بہ نوجوانان اسلام" "طلوع اسلام" وغیرہ اسی بحر میں لکھی گئی ہیں۔

اختر شیرانی کی ابتدا ٹیگور کے متبعین کے طرز پر ہوئی لیکن مذاق سلیم انھیں جلد ہی راہ راست پر لے آیا۔[2] یہ بھی اکثر نئی زمینوں میں کہتے ہیں پنجاب کی فضا اور پنجاب کا حسن اکثر ان کا موضوع رہتا ہے۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے اس عہد میں شباب کے نغمہ سرا بہت ہیں! ور ساتھ ہی ساتھ نوجوان نسلوں پر ٹیگور کی مخصوص ادبیات کا اثر ہے! اس کے علاوہ یورپ کے اثر کی بدولت روح کی لطافت سے زیادہ آج کل کے شعرا جسمانی حسن شکل اور وضع و اظہار پر زیادہ مٹے ہوئے ہیں معنوی خوبیاں بھی یورپ کے اثر سے محفوظ نہیں ہیں۔ نظموں کی بہتات دور گذشتہ سے زیادہ پائی جاتی ہے، اور سوائے اصغر و جگر کے اس عہد کا کوئی شاعر ایسا نہیں ہے جو نظم میں اپنے خیالات کا اظہار نہ کرتا ہو۔ شاعران شباب کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے! ان سے ہٹ کر ایک متین طبقہ بھی ہے، ان میں علی اختر، اختر افسر میرٹھی، نجم آفندی، اچھے کہنے والے ہیں علی اختر کے کلام میں سوچ بچار کے ساتھ ساتھ ایک قسم کی دل گرفتگی پائی جاتی ہے۔ یہ بھی اکثر اقبال سے متاثر نظر آتے ہیں۔ ایک زمانے میں ان پر جوش کا بھی اثر ظاہر ہوا تھا۔ پھر بھی ان میں اپج کافی موجود ہے۔ یہ شعر کی ظاہری خوبیوں کی اتنی پروا نہیں کرتے جتنی اس کی معنویت کو سنوارنے کی فکر کرتے ہیں! اس کوشش میں نئی فارسی ترکیبیں اور استعارے

[1] جدید اردو شاعری صفحہ ۳۱۹ و ۳۲۰۔
[2] ؍ ؍ ؍ ۳۴۰۔

بکثرت استعمال کر جاتے ہیں۔ بہرحال ان کا کلام غور و تامل کا خواستگار ضرور ہے۔ افسر میرٹھی عام روش کی طرح بحروں کی روانی، دلکش اسالیب اور نئے موضوعات کے دلدادہ ہیں۔

یہ اکثر مانوس اور روزمرہ کی چیزوں میں تلاش حسن کیا کرتے ہیں۔ سادگی خیال اور سادگی ادا ان کی خصوصیات میں داخل ہیں۔ غزل اور نظم دونوں میں اس کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ ہمارے خیال میں ان کی اس روش نے ان کو یقیناً بہت ممتاز کر دیا ہے۔ وطن پرستی کے جذبات بھی ان کے ہاں بکثرت ہیں۔ سر سلیمان "پیام روح" کی تقریب میں لکھتے ہیں۔ .... "کیا عجب ہے کہ افسر کے یہ محبت بھرے نغمے ہمارے ملک کی فرقہ وارانہ کشمکش کو دور کرنے میں کسی حد تک کامیاب ہو جائیں[1]۔"

نجم کا رجحان غالب کی طرف ہے۔ اور یہ بلحاظ موضوع ماقبل دور سے تعلق رکھتے ہیں حسرت اور فانی کیطرح میر و غالب کا تتبع کرنا پسند کرتے ہیں۔ ان کے ہاں نہ تو شباب کے جذبات ہیں نہ جوانی کا انداز بیان ہے۔ موٹے موٹے الفاظ اور نامانوس ترکیبوں کا خواہ مخواہ استعمال ان کے ہاں نہیں پایا جاتا ایک عرصہ دراز تک قومی شاعری کے دلدادہ رہ چکے ہیں۔ اور اب بھی غزل میں فلسفہ، تصوف اور محبت کے ساتھ ساتھ سیاسیات بھی ان کا موضوع ہوتا ہے۔ نظم اور غزل دونوں میں خاص مہارت رکھتے ہیں، مگر ان کا اصلی کمال قصیدہ نگاری میں ظاہر ہوتا ہے۔

نظم طباطبائی اور دیگر شعرائے لکھنؤ کے قصائد دیکھے جائیں تو بعض جگہ قصیدہ غزل معلوم ہوگا اور بعض جگہ عالمانہ زبان میں خشک وعظ۔ یہ حالت عام طور پر پائی جاتی ہے۔ نجم نے اس سے بالکل الگ رہ کر مخصوص راہ نکالی۔ وہ خود "قصائد نجم" کے صفحۂ تعارف میں لکھتے ہیں "میں نے قصیدے کی صنف میں ایک جدید شاہراہ بنائی ہے"۔ اسی سلسلہ میں یہ جملہ بھی دیکھنے میں آئے گا "میں نے کوشش کی ہے کہ شاعری سے کوئی مفید کام لوں، اور مذہب سے وہ چیزیں چن کر پیش کروں جس سے تعلیم یافتہ طبقہ کو وحشت کی بجائے (مذہب سے) انس پیدا ہو۔"

شروع ہی کے صفحہ پر یہ الفاظ بھی ملتے ہیں "قصائد نجم" رنگین فلسفہ حقیقی، مدح تبلیغی شاعری، تاریخی جواہر سرکار آئمہ معصومین میں در دولت کے شاعر نجم افندی کی شاعرانہ نذر"۔ اور درحقیقت ان کے اس ۲۷۰ صفحے کے

[1] مقدمۂ پیام روح مجموعۂ کلام افسر

مجموعے کے مطالعہ سے ان کا یہ دعویٰ صحیح معلوم ہوتا ہے کہ قصائد تشبیب اور مدح کا مجموعہ ہوتے ہیں۔ انھوں نے تشبیب میں ذکر شباب کی بجائے تاریخ اسلام کے منتخب پاروں کا بیان کیا ہے۔ اس سلسلے میں "جناب موسیٰ اور فرعون" کا واقعہ، جناب مریم کا بیت المقدس میں بچپن گذارنا، ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کا امتحان عظیم اور دشت فاران کا بے آب وگیاہ میدان سے مرجع عالم بن جانا" وغیرہ تاریخ اسلام کے اکثر واقعات خوش اسلوبی اور تاریخی خشکی کو دور کرکے لکھے گئے ہیں۔ مدح میں اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا گیا ہے کہ صرف ممدوح کے کردار کو پیش کیا جائے۔ ان باتوں کے ساتھ ساتھ جوش اور روانی بھی ان کے کلام میں اکثر پائی جاتی ہے۔ ان کی غزلیں اس شان کی البتہ نہیں ہوتیں حالانکہ وہ بھی اپنے مقام پر بری نہیں کہی جاسکتیں۔

۳

اس عہد میں بہترین غزل گو اصغر اور جگر مراد آبادی ہیں جگر اکثر مسلسل غزل لکھتے ہیں۔ ان کے ہاں حسن ومحبت کے بعض نہایت پاکیزہ مناظر پائے جاتے ہیں تخیل اور محاکات ان کے پاس کسی چیز کی کمی نہیں۔ اس کے علاوہ زبان کا لوچ مروجہ بحروں میں الفاظ کا ترنم اور اسلوب کی عمدگی نے ان کو اس عہد کا مقبول ترین غزل گو بنادیا ہے۔ ان کا کلام سرشار محبت کی رنگین داستان حیات ہے۔ یہ داغ سے بہت مناسبت رکھتے ہیں۔ جس طرح غالب کے مخصوص طرز کو فانی نے اس کے پیچ وخم کو نکال کر مقبول بنایا اسی طرح جگر کے کلام میں داغ کا رنگ نکھر گیا[1]۔ نفاست خیال اور رنگینی بھی ان کے ہاں کسی سے کم نہیں بلکہ بہتوں سے زیادہ ہے۔ ان کے اسالیب صاف اور سیدھے ہوتے ہیں اور ان کی شاعری ایک ایسی تصویر ہوتی ہے جو صرف سادہ رنگوں سے بنائی گئی ہے لیکن مصور کا قلم رنگوں کی آمیزش میں بہت چالاک ہے۔ اصغر، حیات کے خوشگوار و ناگوار دونوں پہلو پیش نظر رکھتے ہیں، لکھنؤ کے انداز تغزل (نزع میت اور گور غریباں کے مضامین) سے ہمیشہ الگ رہتے ہیں، اسی لیے وہ کہتے ہیں:۔

غزل کیا اک شرار معنوی گردش میں ہے اصغر　　یہاں افسوس گنجائش نہیں فریاد و ماتم کی

وہ زیادہ تر گہرے اثرات اور فلسفیانہ خیالات کو بیان کرتے ہیں لیکن شعریت کو بہت کم صدمہ پہنچتا ہے۔

[1] جدید اردو شاعری صفحہ ۱۰۷

اصغرؔ کی شاعری کے متعلق یہ تصفیہ کرنا مشکل ہے کہ اس میں خیال اور مضمون کی خوبی زیادہ نمایاں ہے یا لطافت اور حسنِ بیان زیادہ نظر کش ہے۔[1]

بعض یہ کہتے ہیں کہ فانیؔ نے غالبؔ کے رباب سے اگر حزنیہ ساز چھیڑا تو اصغرؔ نے اس سے رجائی نغمے پیدا کئے۔ اتنا تو میں بھی کہوں گا کہ وہ شاعری کا اصل اصول یہ سمجھتے ہیں کہ نغمہ ہائے مسرت سے پڑھنے والے کے دل و دماغ بھر دئے جائیں۔

شعر میں رنگینیٔ جوشِ تخیل چاہیئے | مجھ کو اصغرؔ کم ہے عادت نالہ و فریاد کی

غزل کے میدان میں اور ہستیاں بھی ہیں جعفر علی خاں اثرؔ اور سیمابؔ کے نام بھی فراموش نہیں کئے جاسکتے۔ اثرؔ، میرؔ کے پیرو ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ لکھنوی اسکول سے تعلق رکھتے ہیں۔

سیمابؔ کے جتنے شاگرد اس وقت اطراف و اکنافِ ہند میں پھیلے ہوئے ہیں اتنے شاید ہی کسی کے ہوں۔ غزل میں الفاظ سے کھیلنا ان کے اسکول کی خصوصیت ہے۔ مگر اکثر جہاں کچھ سادگی سے کام لیتے ہیں بہت بلند ہو جاتے ہیں:۔

ہر چیز پر شباب تھا ہر شے پہ حسن تھا | دنیا جوان تھی مرے عہدِ شباب میں

اب دل کا حال کچھ نظر آتا ہے اور ہی | کیا جانے تم نے دیکھ لیا کس نگاہ سے

لکھنؤ میں اس وقت بعض خوشگو نوجوان شعرا موجود ہیں منظرؔ، حکیم آشفتہؔ، سراجؔ وغیرہ سب خاصا کہتے ہیں۔ مگر ان سب کا طرز یکساں ہے تعشقؔ اور تسلیمؔ کی پیروی کرتے ہیں اکثر صرف زبان کی خاطر شعر کہہ جاتے ہیں۔ محاورات کی کھپت کا خاص خیال رکھتے ہیں اور سختی کے ساتھ قدیم قیود میں رہنا پسند کرتے ہیں۔

اس عہد کا تجزیہ کیا جائے تو عام طور پر اسلوب کے لحاظ سے دو قسم کے شعرا ملیں گے جو جدید رجحانات سے متاثر ہوئے اور بحروں میں تبدیلی کے ساتھ صراحۃً اور دیگر عربی، فارسی لغات سے اپنے کلام کو بھرنے کے عادی ہو گئے بعض نے صرف ہندی اور جدید فارسی بحروں کو استعمال کیا مگر سادگی اور زبان کے لوچ کا

[1] جدید اردو شاعری صفحہ ۲۷۹۔

خاص طور پر خیال رکھا۔

دوسری طرف اصغر، انجم، جگر، اثر وغیرہ ماقبل دور کے شعراء سے مشابہت رکھتے ہیں۔ آزادی کی رو انہیں بھی ہے، مگر وہ صرف مضامین کی حد تک۔ آج کل کبھی کبھی سانیٹ اور اسٹانزا بھی اُردو لباس میں دیکھنے میں آجاتے ہیں، مگر اس کا نہ تو عام طور پر اثر ہوا اور نہ کوئی کارنامہ پیدا ہو سکا، اس لیے اس کا ذکر ہی فضول ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ عہد صرف اسلوب کی رنگا رنگی سے "انقلاب کے اثرات" سے بہتر سمجھا جائے تو سمجھا جائے۔

اچھے شعرا جتنے ماقبل عہد میں گذرے اس زمانے میں نظر نہیں آتے۔ غزل میں اصغر و جگر، نظم میں جوش اور حفیظ یہی اس دور کی کائنات ہیں۔ پھر بھی نہ معلوم موجودہ عہد ابھی کیا کیا موتی ہماری نگاہوں سے پوشیدہ کیے ہوئے ہے! اور ابھی کتنے فانی اور حسرت نشو و نما پا رہے ہیں۔ نوجوان شعراء میں خدا معلوم کتنے جواں بخت اور جواں سال نکلیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس عہد کی شعری ترقیاں اب آگے نہ بڑھیں گی۔ ان شعراء کے سامنے ایک وسیع کائنات ہے اور ان کی ذہنی نشو و نما کے لیے ابھی کافی گنجائش ہے۔

اس عہد کے رسائل کا حصۂ نظم صاف کہتا ہے کہ جذبات نگاری ہی شعر کی جان ہے۔ چاہے کسی منظر کا بیان ہو یا کسی واقعہ کی تصویر۔ کوئی شاعر ایسا نہ ملیگا جو منظر اور واقعہ سے الگ ہو کر ان کی مصوری کرے۔ یہ بات دورِ گذشتہ کے نظم گویوں میں نہ تھی، وہ صرف تفصیل سے منظر اور واقعہ کا بیان کافی سمجھتے تھے اور آج کل تفصیل کی اتنی اہمیت نہیں جتنی واقعہ یا منظر سے متعلق جذبات کی۔ اس لیے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اس عہد میں عام طور پر تصویریں بےجان نہیں ہوتیں۔ جذبات اور منظر کے اس میل نے اس عہد کے نظم گو شعراء کو تھوڑا بہت عہدِ گذشتہ کے باکمالوں سے الگ ضرور کر دیا ہے۔

تنقید و تبصرہ

غالب — مولفۂ مولانا غلام رسول صاحب مہر بی اے، مدیر اخبار انقلاب لاہور، ملنے کا پتہ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی۔

مولانا حالی کی مشہور کتاب "یادگار غالب" کے بعد اگرچہ مرزا غالب کے دیوان کی بہت سی شرحیں اور طرح طرح کے ایڈیشن شایع ہوئے لیکن ان کی سیرت اور سوانحعمری پر کسی نے تفصیل کے ساتھ کوئی کتاب تالیف نہیں کی تھی اور یہ موضوع ایک عرصے سے ارباب قلم کی توجہ کا محتاج تھا۔ مولانا مہر نے اس پر قلم اٹھا کر ایک وقتیہ ادبی ضرورت کی تکمیل کی ہے۔ انھوں نے غالب کے تمام کلام کا بغور مطالعہ کرکے اس کی زندگی کے ہر پہلو پر خاطر خواہ نظر ڈالی ہے اور اس سلسلے میں جس قدر مواد مل سکتا تھا اس کو بڑی تحقیق اور کوشش سے فراہم کرکے سلیقے سے ایک قابل مطالعہ اور لایق استناد سوانحعمری مرتب کی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ قدردانان غالب اس کتاب کا بڑی گرمجوشی سے خیر مقدم کریں گے۔

میری کہانی — پنڈت جواہر لال نہرو کی خود نوشتہ سوانحعمری مجلد و مصور دو حصے قیمت چار روپیے ملنے کا پتہ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی۔

یہ پنڈت جواہر لال نہرو کی خود نوشتہ سوانحعمری کا اُردو ترجمہ ہے جو کارکنان مکتبہ جامعہ کی متحدہ کوشش سے اس قدر جلد کتابی صورت میں شایع ہو گیا ہے۔ پنڈت نہرو کی اصل انگریزی کتاب کو جو شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی ہے یہ اُردو ترجمہ بھی اس سے کچھ کم ہر دلعزیزی کا مستحق نہیں۔ جہاں تک ترجمہ کا تعلق ہے اس کی زبان نہایت صاف اور رواں ہے مصنف کے پُر اثر قلم کی اُردو میں جھلک نظر آتی ہے۔ یہ گویا ہندوستان کی موجودہ سیاسیات اور کشمکش آزادی کی داستان کا ایک دلچسپ باب ہے اور ایسے دلکش پیرایے میں لکھا گیا ہے کہ پڑھنے سے طبیعت نہیں اکتاتی۔ کتاب ضخامت اور تصاویر وغیرہ کے لحاظ سے بہت ہی سستی ہے اور اُردو میں شاید ہی ایسی سستی کتاب کوئی اور شایع ہوئی ہو جامعہ ملیہ کی یہ کوشش ہر آئینہ قابل ستایش اور لایق قدر ہے۔

فلسفۂ برگساں — مولفۂ مولوی میر حسن الدین صاحب بی اے ال ال بی عثمانیہ، قیمت عہ ملنے کا پتہ مکتبۂ ابراہیمیہ حیدر آباد دکن۔

مولوی میر حسن الدین صاحب نے فلسفے پر بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ ابھی حال میں آپ نے سر اقبال کے مشہور اور ضخیم فلسفیانہ مقالے کا بھی اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔ برگساں کی تعلیم اور اس کے فلسفیانہ خیالات کی اس مختصر رسالے میں بڑے دلکش انداز میں توضیح کی گئی ہے۔ زبان صاف اور شستہ ہے۔

سالانہ رپورٹ انجمن طیلسانئین عثمانیہ

بابتہ ۱۳۴۵ف

انجمن کا وہ پودا جو اخلاص و جذبۂ خدمت گزاری کے ساتھ بویا گیا تھا برابر نشو نما پا رہا ہے، اور یہ کوئی خود ستائی نہیں ہے کہ عام قومی اداروں کی صف میں انجمن کے لیے مناسب جگہ حاصل ہوگئی ہے۔

کابینۂ انجمن | ۱۳۴۴ف میں کابینہ کا انتخاب عمل آیا تھا۔

(۱) نواب میر اکبر علی خاں صاحب بی اے ال ال بی آنرز بیرسٹر ایٹ لا صدر۔ (۲) راجہ رائے گرو داس صاحب بی اے ال ال بی جاگیردار نائب صدر۔ (۳) محمد عبد الرحیم صاحب بی اے معتمد۔ (۴) محمد غوث صاحب ام اے ال ال بی نائب معتمد۔ (۵) شنکر جی صاحب بی اے خازن۔ (۶) اور اراکین نواب میر احمد علی خاں صاحب ام اے ال ال بی۔ (۷) محمد مظہر حسین صاحب بی اے۔ (۸) محمد کلیم الدین صاحب انصاری بی ایس ال ال بی۔ (۹) غلام محمد خاں صاحب ام اے۔ (۱۰) سید محمد صاحب ام اے۔ (۱۱) عبد المجید صاحب صدیقی ام اے ال ال بی۔ (۱۲) قاضی فصیح الدین صاحب صدیقی ام اے ال ال بی کا انتخاب عمل میں آیا تھا مگر ان کے بلدہ میں نہ ہونے کی وجہ سے نواب فخر نواز جنگ بہادر ام اے ال ال بی کا انتخاب عمل میں آیا۔

سرپرست انجمن | سال زیر رپورٹ میں بھی عالیجناب راجہ راجایان مہاراجہ سرکشن پرشاد یمین السلطنت بہادر صدر اعظم باب حکومت سرکار عالی و امیر جامعہ عثمانیہ ہی اس انجمن کے سرپرست رہے۔

طیلسانئین عثمانیہ پر خدمت ملک کی نہایت اہم ذمہ داری عائد ہے جس کو بہ احسن الوجوہ پورا کرنا صرف اجتماعی کوششوں پر منحصر ہے۔ کانفرنس اس کا ایک مناسب ذریعہ ہے جسب دفعہ (۵۲) دستور انجمن ہر نئے سال کے اوائل میں طیلسانئین عثمانیہ کی ایک کانفرنس منعقد کی جاتی ہے۔ جو سال زیر رپورٹ کے دوران میں بھی بتواریخ ۱۹ و ۲۰ آذر ۱۳۴۵ف زیر صدارت ڈاکٹر میر سیادت علی خاں صاحب ام اے ال ال بی (عثمانیہ) پی ایچ ڈی، ای سی ایل (آکسفورڈ) پروفیسر قانون جامعہ عثمانیہ بمقام ٹاؤن ہال باغ عامہ منعقد ہوئی یہ تیسری

سالانہ کانفرنس تھی۔ اس کا افتتاح عالیجناب رائٹ آنریبل نواب سر صدر المہام بہادر فینانس سرکار عالی کے ایک پیام سے ڈاکٹر میکنزی نائب معین امیر جامعہ عثمانیہ نے فرمایا۔ حاضرین میں طیلسانئین عثمانیہ بلدہ و اضلاع کے علاوہ عہدہ داران سرکار عالی اور پبلک کی خاصی تعداد شریک رہی۔ اور کانفرنس کے چار اجلاس منعقد ہوئے جن میں علمی، ادبی، تاریخی، تحقیقی، معاشی، معاشرتی اور نفسیاتی مسائل پر متعدد مقالات پڑھے گئے اور تعلیمی اور معاشی امور سے متعلق جدید اور اہم تحریکات بالاتفاق و بہ غلبۂ آرا منظور کی گئیں۔ ان تحریکات کی نسبت منجانب انجمن جو ضروری کارروائی عمل میں لائی گئی اس کے نتائج کو آگے بیان کیا گیا ہے۔

اس موقع پر بھی حسب معمول فرزندان جامعہ عثمانیہ کے علمی کارناموں کی نمائش کی گئی جس کو تمام حاضرین نے نہایت پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا۔ نمائش میں تمام علوم و فنون کی تصانیف و تالیفات و تراجم مطبوعہ و غیر مطبوعہ خوش سلیقگی کے ساتھ ترتیب دئیے گئے تھے، اس کا حاضرین پر خاصا اچھا اثر پڑا۔ منجانب کانفرنس بزم تمثیل کا تیار کردہ ڈرامہ "زمانہ" مصنفہ سید محمد اکبر صاحب و فاقانی بی اے (عثمانیہ) بمقام اکسلسیر تھیٹر پیش کیا گیا جس میں دکن کی گذشتہ و موجودہ زندگی کا مرقع کھینچا گیا تھا۔ اس کی سرپرستی عالیجناب نواب سالار جنگ بہادر نے فرمائی اور انجمن کی ضرورتوں کا احساس فرماکر ایک فیاضانہ عطیہ بھی مرحمت فرمایا۔ اس عنایت خاص کیلیے نواب صاحب ممدوح کی خدمت میں پُرخلوص ہدیۂ تشکر پیش کیا جاتا ہے

تعلیم اعلیٰ بہ شعبۂ قانون

شعبۂ قانون جامعہ عثمانیہ میں ال ال بی سے مافوق قانونی تعلیم کے انتظام کی تحریک کی گئی تھی جس کے متعلق اطلاع ملی ہے کہ ارباب جامعہ کی رائے میں ال ال بی کے امتحان کے بعد ال ال یم کی تعلیم کی جماعتیں قائم کرنا قبل از وقت ہوگا۔ تاہم اس مسئلہ کو مجلس شعبۂ قانون میں پیش کیا جارہا ہے اور اس بارے میں مناسب کارروائی عمل میں لائی جائے گی۔

روانگی طلباء بہ ممالک غیر بغرض تعلیم۔

غیر ممالک کو جس قدر طلباء تعلیم کے لیے بھیجے جاتے ہیں ان کی نسبت اس امر کا اظہار کرتے ہوئے کہ ان کی تعداد ملک کے حالات کے لحاظ سے ناکافی ہے، سرکار عالی سے درخواست کی گئی تھی کہ ان کی تعداد میں اضافہ کرکے فنی اور صنعتی تعلیم کے لیے زیادہ طلباء بھیجے جائیں جس کی بنا پر وظائف کی تعداد بجائے چار کے پانچ کردی گئی ہے منجملہ ان وظائف کے ایک وظیفہ ہر سال فنی تعلیم کے لیے مختص کیا گیا۔

اس تعداد کو اطمینان بخش نہ خیال کرکے اس بارے میں مکرر ارباب متعلقہ کی توجہ مبذول کرائی گئی جو سرکار عالی کے زیر غور ہے۔

ارتفاع تحدید داخلہ کلیات عثمانیہ۔ اولاً ممالک محروسہ سرکار عالی کلیات عثمانیہ کے سال اول کی جماعتوں میں کل (۳۶۰) نشستوں کی تحدید کی گئی تھی جس کی بناء پر انجمن کے عام جلسہ اور ما بعد سالانہ کانفرنسوں میں ارتفاع تحدید کی نسبت تحریک منظور کی گئی کہ کلیات میں داخلہ کی تحدید ملک اور قوم کی حقیقی علمی ترقی اور دماغی نشو نما میں شدید رکاوٹ ہے اس لیے اس قید کو جلد از جلد اٹھا دیا جانا چاہیئے۔ مجلس اعلیٰ جامعہ عثمانیہ نے اپنی نظر ثانی میں کالجوں کی جماعتہائے سال اول کی تعداد میں (۳۶۰) ۱۰ ۴ تک اضافہ کر دیا مگر گذشتہ سالانہ کانفرنس نے کلیات جامعہ عثمانیہ میں طلباء کے داخلہ پر جو قیود باقی ہیں ان سے اعلیٰ تعلیمی ترقی میں نامناسب رکاوٹ پیدا ہونے کا خوف ظاہر کیا اور مجلس اعلیٰ جامعہ عثمانیہ سے فیصلہ پر نظر ثانی کرنے کی استدعا کی جس کی بناء پر داخلہ طلباء کی تعداد میں مزید دس فیصدی کا اضافہ کرنے کی منظوری دی گئی۔

موجودہ حالات ملک کے لحاظ سے یہ اضافہ بھی ناکافی تصور کیا گیا اور مکرر ہمدردانہ غور کی درخواست کی گئی مجلس اعلیٰ نے بلدہ کی حد تک داخلہ کی تعداد میں بجائے دس فیصدی کے پندرہ فیصدی کا اضافہ فرمایا ہے اضلاع کے کالجوں کے لیے مقررہ تعداد ہی کافی تصور کی گئی ہے کیونکہ بسا اوقات تعداد پوری نہیں ہوتی۔

کابینہ انجمن مجلس اعلیٰ جامعہ عثمانیہ کی توجہ مکرر مبذول کرائی ہے کہ کلیات جامعہ عثمانیہ میں طلباء کے داخلہ پر جو تحدید عائد کی گئی ہے اُس کو اٹھا لیا جائے۔

قانون جبری تعلیم انجمن طیلسانئین عثمانیہ کو ابتدائی جبری تعلیم کے اصول سے پورا اتفاق ہے۔ انجمن ابتدائی جبری تعلیم کی ضرورت کو محسوس کرتی ہے اور سرکار عالی سے درخواست کرتی ہے کہ اہل ملک کی بہبودی کی خاطر اسکو قانوناً نافذ فرمایا جائے۔

مجلس علمیہ طیلسانئین عثمانیہ کانفرنس ۱۳۴۳ف میں ایک تحریک منظور کی گئی تھی کہ یہ کانفرنس انجمن طیلسانئین عثمانیہ کی کابینہ سے توقع کرتی ہے کہ وہ ملک میں اعلیٰ علمی ذوق پیدا کرنے اور اعلیٰ علمی تحقیقات کی ہمت افزائی کے لیے

دوسرے اداروں کے تعاون سے اگر وہ حاصل ہو سکتا ہو، ورنہ بطور خود ایک مناسب لائحۂ عمل مرتب کر کے علمی کام شروع کرے گی۔

کابینہ نے اس مقصد کی تکمیل کے لیے ایک ذیلی مجلس مقرر کی جس نے کافی غور و خوض کے بعد اپنے کاروبار کو مجلس علمیہ طیلسانئین عثمانیہ کی صورت میں شروع کیا ہے جس کے صدر ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور اور معتمد سید محمد صاحب ہیں۔

مجلس علمیہ نے ناظم صاحب تعلیمات سرکار عالی کے استفسار پر اصلاح و ترمیم تعلیم کے سلسلہ میں ملک کے مجوزہ نظام تعلیم کے بارے میں ایک طویل رپورٹ مرتب کی اور اس کی طرف سے علاوہ صدر مجلس کے نواب فخر نواز جنگ بہادر کو بھی زبانی شہادت کے لیے سرکاری کمیشن کے آگے پیش کیا گیا۔ یہ رپورٹ ترمیم نظام تعلیم کے متعدد حلقوں میں پسندیدہ نظروں سے دیکھی گئی۔

سہ ماہی رسالہ کی اجرائی ملک میں اعلیٰ علمی ذوق پیدا کرنے اور اعلیٰ علمی تحقیقات کی نشر و اشاعت کے لیے مجلس علمیہ طیلسانئین عثمانیہ نے فی الحال ایک سہ ماہی رسالہ جاری کیا ہے جس میں طیلسانئین عثمانیہ کے ام اے اور ام یس سی کے مقالات، چیدہ مضامین نظم و نثر اور مختلف علوم و فنون پر طیلسانئین عثمانیہ کے قلم سے بسیط اور محققانہ تبصرے شایع ہوں گے۔ چونکہ انجمن کے پاس نہ تو کوئی سرمایہ تھا کہ وہ مصنفین و مولفین کو امداد دے سکتی اور نہ ملک میں ایسے ادارے ہیں جو طیلسانئین عثمانیہ کی کتابوں کو اپنی طرف سے شایع کر کے ان کی خدمات علمی کا پرچار کریں، اس لیے خود اعانتی کی یہ مفید تجویز سوچی گئی۔ اس تجویز سے طیلسانئین عثمانیہ کے ام اے اور ام یس سی کے مقالے جو بجائے خود محققانہ علمی رسالے ہوتے ہیں اور جن کو نہ تو جامعہ شایع کرتی ہے اور نہ طیلسانئین اپنی کم استطاعتی کی وجہ سے طبع کرا سکتے ہیں، بہت جلد کتابی صورت میں منظر عام پر آجائیں گے مضامین نظم و نثر کی اشاعت سے طیلسانئین میں مضمون نگاری اور شعر گوئی کے ذوق کی حوصلہ افزائی مقصود ہے مختلف علوم و فنون کی مطبوعات پر تبصروں کے ذریعہ طیلسانئین کے علمی مرتبہ اور فنی وقار کا اظہار ہوگا۔

اس رسالے میں جو مقالات شایع ہوں گے ان کو کتابی صورت میں الگ کر کے چند نسخے مولف کو بھی دئے جائیں گے اور تقریباً (۵۰) نسخے مختلف جامعات اور علمی اداروں کو تحفۃً بھیجے جائیں گے جس سے طیلسانئین عثمانیہ کے

علمی کارناموں کا بہت آسانی اور کم صرفہ سے خاصا چرچا ہو جائے گا اور کئی ایک طیلسانئین مولف کی حیثیت سے پبلک میں روشناس ہو جائیں گے۔

یہ مفید تجویز جو اپنی مدد آپ کرنے کے اصول پر اختیار کی گئی ہے قوی امید ہے کہ طیلسانئین عثمانیہ میں ضرور پسندیدگی کی نظروں سے دیکھی جائے گی اور وہ اس کا پُرجوش استقبال کریں گے۔

دو سال کی کوشش کے بعد سرکار عالی نے اجرائی مجلۂ طیلسانئین کی منظوری مرحمت فرمائی ہے۔

مجلس علمیہ ان کرم فرما اور ہمدرد طیلسانئین کی اعانت کی مشکور ہے جنھوں نے بروقت اپنی مالی امداد سے اس پودے کو سینچا جن میں نواب میر اکبر علی صاحب بیرسٹر۔ نواب میر احمد علی صاحب۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور اور مولوی غلام دستگیر صاحب رشید قابل ذکر ہیں۔

اجرائی اجازت نامجات بقرض دہندگان۔ گذشتہ کانفرنس میں یہ اظہار رائے یہ تحریک منظور کی گئی تھی کہ اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ قرض دہندگان کو سرکاری اجازت نامہ حاصل کئے بغیر زرعی قرضی کاروبار انجام دینے کی اجازت نہ دی جائے۔

اس خصوص میں منجانب انجمن دفاتر متعلقہ سے ضروری کارروائی کرنے کے بعد انجمن کو توجہ دلائی گئی ہے کہ اس خصوص میں اخبارات کے ذریعہ رائے عامہ کو اپنے موافق بنانے کی کوشش کی جائے، سرکار عالی کی جانب سے بھی اس بارے میں سعی کی جائے گی۔

قیام عثمانیہ جوبلی بنک سرکار عالی سے یہ استدعا کی گئی تھی کہ اعلیٰحضرت خلد اللہ ملکہ کے جشن سیمیں کی مستقل یادگار عثمانیہ جوبلی بنک قائم کیا جائے، معتمد صاحب فینانس نے مطلع فرمایا ہے کہ سرکاری بنک کے افتتاح کا مسئلہ سرکار عالی کے زیر غور ہے۔

قیام کمیشن برائے تجاویز ترقی صنعت وحرفت کانفرنس کی ایک تحریک میں اس رائے کا اظہار کیا گیا کہ ریاست حیدرآباد میں صنعت پارچہ بافی کی ترقی کے لیے غور کرکے تجاویز پیش کرنے کے لیے ایک کمیشن کے قیام کی ضرورت ہے محکمہ صنعت وحرفت سرکار عالی کی توجہ اس جانب مبذول کرائی گئی جس کے متعلق وہ رقمطراز ہے کہ سررشتہ کی جانب سے مختلف گھریلو صنعتوں کی عموماً اور صنعت پارچہ بافی کی خصوصاً فروغ اور ترقی کے لیے ہر قسم کی ممکنہ کوشش کی جا رہی ہے

۱۳۳۹ف میں ایک تجربہ کار قابل ماہر فن کی خدمات حاصل کی جاکر صنعت پارچہ بافی و رنگ سازی کی ممالک محروسہ میں تفصیلی مساحت کی گئی اور حسب ذیل اسکیمیں جن کی محکمۂ سرکار عالی سے منظوری صادر ہوئی ہے خاطر خواہ طور پر چلائی جا رہی ہیں :۔

(۱) شہر حیدرآباد میں ایک فنی مدرسہ کھولا گیا ہے جس میں پارچہ بافی، رنگ سازی، طباعت، گلکاری اور سوزن کاری وغیرہ کی تعلیم دی جاتی ہے۔ (۲) اضلاع میں قابل ماہرین فن کی قیادت میں منظم طریقہ پر دورہ کر کے پارچہ باف و رنگ سازان کے مکانات پر فن کے ترقی یافتہ اصول کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ (۳) فروخت گاہ مصنوعات کا قیام عمل میں آیا ہے جو نہ صرف گھریلو صنعتوں کی پیداوار کی نکاسی کی سبیل نکالتا ہے بلکہ اندرون و بیرون ممالک محروسہ سرکار عالی ان اسباب کی تشہیر و اشاعت کا کام انجام دیتا ہے۔ (۴) پٹن کے بہترین کاریگروں کو برطانوی علاقہ جات میں منتقل ہونے سے روکنے کی خاطر جو مشہور عالم صنعت ہائے ساری و پگری بافی کی زوال پذیری کی وجہ سے اپنے وطن کو ترک کر رہے تھے ایک ادارہ کا قیام عمل میں آیا جہاں تعاون کے اصول پر کام کرتے ہوئے بہت سے خاندان مصروف بکار ہو گئے ہیں۔ (۵) ورنگل میں قالین بافی کے کارخانے کے قیام سے اس صنعت کا احیا کیا گیا اور حیدرآباد اور لندن کے مابین قالینوں کی باقاعدہ تجارت کا آغاز کیا گیا ہے۔ نظام محل دہلی کے لیے بھی یہیں سے قالین سربراہ ہوئے ہیں اور یہاں کے قالین اپنی بناوٹ کے لحاظ سے اگر اعلیٰ نہیں تو دنیا میں کسی جگہ کی قالینوں سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ ان تمام میں انڈسٹریل ٹرسٹ فنڈ استعمال کیا جاتا ہے اور اس سے وظائف بھی دئے جاتے ہیں تاکہ ان فنون میں تعلیم پاکر طلبا مہارت حاصل کریں۔

ان وجوہات کی بنا پر سررشتہ صنعت و حرفت کم از کم موجودہ صورت میں کسی کمیشن کے تقرر کے لیے قوی وجوہ نہیں پاتا، البتہ وہ ان صنعتوں کی ترقی کی مفید تجاویز پر اپنی توجہ مبذول کرنے آمادہ ہے۔

اس بارے میں توقع ہے کہ ہمارے جانشین مزید غور کر کے مناسب صورتیں اختیار کریں گے۔

قیام بیمہ کمپنی در حیدرآباد | کانفرنس میں اس امر کا اظہار کیا گیا کہ حیدرآباد میں وسیع پیمانہ پر کاروبار کرنے کے لیے ایک کمپنی کے قیام کی ضرورت ہے جس کا آغاز او رسرپرستی سرکار کو کرنی چاہیئے۔ محکمۂ تجارت و حرفت سے اس خصوص میں جواب وصول ہوا کہ حسب ذیل بیمہ کی تین کمپنیاں منجانب سرکار عالی یا بہ سرپرستی سرکار عالی

قائم ہیں :-

(۱) حیدرآباد اسٹیٹ لائف انشورنس ۔

(۲) ایسٹرن فیڈرل یونین کمپنی ۔

(۳) دی حیدرآباد کوآپریٹو انشورنس سوسائیٹی ۔

اور یہ تحریر کیا کہ ان کی موجودگی میں مزید بیمہ کمپنی کے قیام کی ضرورت نہیں ہے ۔ مگر اس بارے میں مزید کمپنی کے قیام کی واجبیت پر غور کیا جارہا ہے تاہم حکومت سرکار عالی کو منجانب انجمن توجہ دلائی جائے گی ۔

تقرر تجارتی کمشنر | پیوستہ کانفرنس میں اس امر کی شدید ضرورت کا اظہار کیا گیا تھا کہ ممالک خارجہ میں مفید ملکی پیداواروں کی مناسب قیمت پر فروخت کے لیے ٹریڈ کمشنروں کا تقرر عمل میں آئے محکمۂ صنعت وحرفت نے انجمن کو مطلع کیا ہے کہ ریاست ابدمدت کی تجارت کو فروغ دینے کے لیے عارضی طور پر ایک تجارتی ایجنٹ بمبئی میں کام کر رہا ہے اور یہ کہ اگر اس کے نتائج تشفی بخش ثابت ہوں تو اس انتظام کو مستقل بنایا جائے گا ۔ نیز اس امر کی وضاحت کی کہ انگلستان یا دیگر یوروپی ممالک میں مستقل آدمی کی ماموری کے کافی امکانات موجود نہیں ہیں ۔ تاہم دیسی مصنوعات کی وہاں نکاسی کے لیے کوشش کی جارہی ہے اس سلسلہ میں انجمن سے حسب ذیل امور کی نسبت محکمۂ صنعت وحرفت سے وضاحت چاہی گئی :-

(۱) تجارتی او کمیشن ایجنٹ کتنے عرصہ سے کام کر رہے ہیں ۔ (۲) ان کے کیا فرائض ہیں ۔ (۳) کونسی مصنوعات اور اشیاء یہاں سے بھیجی جاتی ہیں ۔ (۴) اب تک اس کے کیا نتائج برآمد ہوئے ۔

جواب وصول ہوا کہ قمر طیب جی کا بحیثیت تجارتی ایجنٹ یکم بہمن ۱۳۴۲ف سے تین سال کے لیے تقرر عمل میں آیا جو تیار اور خام اشیاء اور گھریلو صنعت کی چیزوں کی فروخت کی نسبت جد وجہد کرتے ہیں ۱۳۴۳ ۴۴ف میں ورنگل کے قالین، اورنگ آباد کی ہمرو، بیدری سامان، سنگاریڈی و سدی پیٹ کے ریشم، کنگھیاں، جوتے، فرنیچر، نمدے، رنگ سازی و گلکاری کی مختلف چیزیں اور دیگر تیار شدہ اشیائے کارخانہ صنعتی سرکار عالی روانہ کی گئی تھیں ۔ صاحب موصوف ہمہ وقتی فروخت اشیاء کی ایجنسی نہیں رکھتے بلکہ زیادہ تر باخذ کمیشن ایجنسی کا کام انجام دیا کرتے ہیں ۔

محکمۂ صنعت وحرفت سے مزید کارروائی کرنے کی بجائے کابینہ نے یہ طے کیا کہ ریاست میسور وٹراونکور سے معلومات حاصل کی جائیں کہ وہاں کی پیداوار واشیا کی نکاسی اور تجارتی ترقی کی نسبت کونسے ذرایع اختیار کئے گئے ہیں۔

ریاست ٹراونکور سے کوئی جواب وصول نہیں ہوا۔ ریاست میسور کے محکمۂ صنعت وحرفت سے جو جواب وصول ہوا ہے اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے:۔

خانگی تجار اپنی اشیاء کی نکاسی وغیرہ کے لیے خود ہی مناسب انتظام کرلیا کرتے ہیں۔ حکومت سے متعلقہ ادارہ جات کی تیار شدہ مصنوعات کی نکاسی ان ایجنٹوں کے ذریعہ عمل میں آیا کرتی ہے جو اس غرض کیلیے بعض علاقہ جات میں مامور کئے گئے ہیں۔ اور جو ضروری خام اشیاء بذریعہ سکرٹری اسٹور پرچیز کمیٹی میسور اور ٹریڈکمشنر میسور متعینہ لندن سے خرید کرتے ہیں۔ جو ٹریڈکمشنر لندن میں متعین ہے وہ بیرون ہند تمام ممالک میں مصنوعات کی اشتہار بازی وخرید وفروخت وغیرہ کی خدمات انجام دیتا ہے علاوہ خانگی ادارہ جات کی بھی جب کبھی ضرورت ہو امداد ومعاونت کرتا ہے۔ اسی طرح عمل پیرائی کے لیے محکمۂ صنعت وحرفت کی توجہ مبذول کرانے پر جواب وصول ہوا ہے کہ بحالت موجودہ اخراجات کی زیادتی ٹریڈکمشنروں کے تقرر میں مانع ہے اس لیے تقرر ٹریڈکمشنران کا ارادہ نہیں ہے اور تحریر کیا گیا کہ گھریلو صنعتیں طول وعرض ملک میں کافی مقبولیت حاصل کررہی ہیں اُن کی نکاسی غیر ممالک میں کرنے کی فی الحال ضرورت نہیں۔ اراکین انجمن خود بطور رواج ملکی اشیاء استعمال کریں تو کم تعلیم یافتہ افراد ملک کے لیے نظیر ہوگی اور اس طرح سے ملکی مصنوعات کو کافی فائدہ پہنچے گا۔

بہر حال یہ مسئلہ ایسا ہے کہ اس پر تفصیلی غور وفکر کی ضرورت ہے اور ٹریڈکمشنروں کا تقرر ناگزیر۔ امید ہے کہ آئندہ یہ کام بحسن وخوبی انجام پائے گا۔

قیام مجلس فراہمی روزگار حاجتمند طیلسانئین کو عندالضرورت مشورت وامداد کی غرض سے ایک منتخب کمیٹی "مجلس فراہمی روزگار" کے قیام کے سلسلہ میں مجلس اعلیٰ جامعہ عثمانیہ نے طے کیا تھا کہ فنی کالجوں میڈیکل، انجنیرنگ اور ٹریننگ کے لیے اس قسم کی مجلس کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ متعلقہ سررشتہ جات کے

افسران اعلیٰ کو ان کالجوں سے گہرا تعلق ہے۔

کلیۂ جامعہ عثمانیہ کی نسبت آئندہ سے ایسے طیلسانئین کی فہرستیں جو درجۂ اول یا دوم میں کامیاب ہوں جملہ معتمدین سرکار عالی کے پاس روانہ کی جائیں مجلس اعلیٰ کے فیصلہ پر کابینۂ انجمن نے نظرثانی کی ضرورت سمجھی اور گذشتہ کانفرنس میں اس خصوص میں ایک تحریک منظور کی گئی اور ارباب مقتدر کی توجہ مسلسل مبذول کرائی جاتی رہی اور ایک وفد بھی عالیجناب نواب امیر جامعہ بہادر کی خدمت میں باریاب ہوا، نواب صاحب نے بیان فرمایا کہ وہ بوقت تقررات طیلسانئین جامعہ عثمانیہ اور دوسرے ملکی تعلیم یافتہ اصحاب کو ترجیح دیا کرتے ہیں لیکن سرویس کمیشن کا قیام بھی عمل میں آرہا ہے جس کے فرائض میں وفد کی خواہش کے مطابق اس کو بھی شریک کرنے کی کوشش کیجائیگی کہ تعلیم یافتہ افراد کو کسب معاش کے دوسرے وسائل اور ذرائع کے متعلق مفید معلومات بہم پہنچائے جائیں اور ان کی حمکنہ مدد کی جائے۔

معاشی کمیٹی طیلسانئین کو حصول معاش میں جو دقتیں پیش آتی ہیں اور بعد تکمیل تعلیم وہ جو مشاغل اختیار کرتے ہیں ان کی تحقیقات کے بعد کابینہ نے ایک ذیلی کمیٹی مقرر کی جو معاشی کمیٹی کے نام سے تین سال کے لیے حسب ذیل مقاصد کے ساتھ کام کر رہی ہے:۔

(ا) ملک کی معاشی ترقی کی جدوجہد کی جائے۔

(ب) ملک کی معاشی ترقی کے لیے دوسرے اداروں سے تعاون کیا جائے۔

(ج) حصول معاش میں طیلسانئین عثمانیہ کا ہاتھ بٹایا جائے۔

اس کمیٹی کے صدر میر محمود علی صاحب ام اے عثمانیہ اور معتمد محمد غوث صاحب ام اے، ال ال بی جیسے پُرجوش کارکن ہیں۔ توقع ہے کہ اس کمیٹی کے ذریعہ آئندہ اچھے نتائج ظاہر ہوں گے۔

انجمن کے جلسۂ عام اور سالانہ کانفرنس میں ایک تحریک منظور ہوئی تھی جس میں سرکار عالی کے جملہ محکمہ جات سے استدعا کی گئی تھی کہ وہ ہمیشہ تقررات کے وقت طلبائے جامعہ عثمانیہ کو ترجیح دیا کریں۔ عہدہ داران سرکار عالی نے اس تحریک سے ہمدردی کا اظہار فرمایا اور اطمینان دلایا کہ آئندہ کے لیے

جامعہ عثمانیہ کے طلباء کے حقوق مرجح ہوں گے۔ دوران سال میں بعض دفاتر کو حسب طلب خواہشمندان ملازمت کی نشاندہی بھی کی گئی۔

کلیۂ انجنیری کے طیلسانئین کو حصول معاش میں جو دقتیں ہیں ان کے ارتفاع کے لیے جو مناسب کوشش عمل میں لائی جارہی ہے اس کی نسبت تا حال کوئی صورت پیدا نہ ہوسکی، مزید کوشش جاری ہے۔

دوران سال میں سررشتۂ تالیف و ترجمہ جامعہ عثمانیہ کو ایسے طیلسانئین کی فہرست ارسال کی گئی جو مختلف مضامین کے ترجمہ و تالیف کے کام میں شریک ہونا چاہتے تھے اور جو اس کام کی کافی مہارت بھی رکھتے تھے تاکہ بوقت انتخاب مترجمین و مولفین ان کا بھی مناسب لحاظ کیا جائے۔

سال زیر رپورٹ میں یہ اعلان کیا گیا کہ نظام ساگر کے تحت اراضی پر کاشتکاری کے لیے مناسب ذرائع اور سہولتیں بہم پہنچانے کا منجانب انجمن ضروری انتظام کیا جاسکتا ہے۔ لہذا جو طیلسانئین زراعت و کاشتکاری کا میلان رکھتے اور امداد و معاونت کے خواہاں ہوں وہ انجمن کو مطلع کریں۔ اب حال ہی میں دفتر معتمد صاحب جامعہ عثمانیہ سے ایک اعلان شایع ہوا ہے جس میں تحریر کیا گیا ہے کہ تعلیم یافتہ بے روزگاروں کو جو پیشۂ زراعت اختیار کرنا چاہیں اراضی دے کر مناسب امداد دینے کی ایک اسکیم سررشتۂ مالگذاری کے زیر غور ہے اس لیے جو اشخاص پیشۂ زراعت اختیار کرنا چاہیں وہ اپنا نام درج رجسٹر کرائیں۔

اس اسکیم کے اہم خد و خال کیا ہیں اور مراعات و امدادی وسائل کی تفصیلات کیا ہوں گی جو ان کے لیے مہیا کی جائیں گی، ارباب متعلقہ سے منجانب انجمن استفسار کیا گیا ہے جس کے جواب کا ہنوز انتظار ہے۔

بلدی خدمات | گذشتہ سال کی رپورٹ میں یہ بتایا گیا تھا کہ رقبۂ حدود بلدیہ کے بہبود کی ہر جہتی کوشش کرنے کے لیے عثمانیہ بلدی جماعت کا باضابطہ قیام عمل میں آیا ہے، اس ادارہ کے قیام سے حیدرآباد کی پرسکون فضا میں ایک لہر سی پیدا ہوگئی، دوران سال میں حدود بلدیہ کے چار حلقوں میں جماعت کی باضابطہ شاخیں قائم ہوئیں جن میں حلقۂ دوم اندرون کی شاخ کی جد و جہد قابل تحسین ہے۔ اس حلقہ کی مجلس عاملہ ہر جمعہ کو اپنے حلقہ کے کسی ایک حصہ کا دورہ کرکے عینی مشاہدات کی بناء پر رپورٹ مرتب

کرتی ہے اور صفائی و حفظان صحت وغیرہ سے جو امور اصلاح طلب نظر آتے ہیں ان کی طرف محکمہ جات متعلقہ کی توجہ منعطف کراتی ہے اور جو امور خود پبلک سے متعلق ہیں ان کی طرف پبلک کو توجہ دلاتی ہے۔

شہر حیدرآباد کے اکثر حلقہ جات کی آبادی ریاست حیدرآباد کے بعض مستقر ہائے اضلاع کے برابر ہے ایسی صورت میں بلدی معاملات کی انجام دہی کے لیے جب تک ذیلی جماعتیں قائم نہ ہوں آسانی کے ساتھ کام انجام نہیں پا سکتا اس لیے اب اس جماعت کے پیش نظر حلقوں میں مزید ذیلی حصہ واری جماعتیں قائم کرنے کی اسکیم ہے جن سے حلقہ کی جماعت کے کاموں میں بہت بڑی سہولت پیدا ہو جائے گی۔

مجلس وضع قوانین میں طیلسانئین کی رکنیت | مجلس وضع قوانین سرکار عالی میں طیلسانئین کے لیے دو نشستیں مقرر کرنے کے متعلق انجمن کی تحریک پر جناب مولوی میر اکبر علی خاں صاحب صدر انجمن نے دوران سال میں جو رکن مجلس قوانین بھی ہیں، ایک مسودہ ترمیمی پیش فرمادیا ہے۔

سلور جوبلی بندگان عالی | یہ امر طے پایا کہ اعلیٰحضرت بندگان عالی متعالی مدظلہ العالی کی سلور جوبلی کے مبارک و مسعود اور میمنت آمود موقع پر اپنی ایک ذاتی عمارت کی بھی داغ بیل ڈالے جس کے لیے زمین کے حصول کی کارروائی جاری ہے۔

حصول اراضی کے سلسلہ میں مولوی مہر علی فاضل صاحب ناظم آرائش بلدہ نے انجمن کے ساتھ دلچسپی کا اظہار فرمایا ہے اور وعدہ کیا ہے بلدہ میں تعمیر عمارت کے لیے موزوں قطعہ زمین دلانے میں ضروری امداد دی جائے گی۔ ہمیں توی توقع ہے کہ موصوف اپنے وظیفہ پر سبکدوشی سے قبل موزوں قطعۂ اراضی انجمن کے لیے مہیا فرمادیں گے۔

اس موقع پر اس امر کا تذکرہ بھی بے محل نہ ہوگا کہ جامعہ کے امتحانات جشن سیمیں کے مقرر کئے جانے سے طلبائے جامعہ عثمانیہ میں اضطراب پھیلا ہوا تھا کہ وہ امتحانات کی تیاری کی مصروفیت کے باعث جشن سیمیں کے موقع پر وفادارانہ و عقیدتمندانہ جذبات کا مظاہرہ نہ کر سکیں گے اس لیے ان کی درخواست تھی کہ امتحان کی تاریخیں بڑھا دی جائیں۔

ارباب جامعہ نے بعض انتظامی دقتوں کے مدنظر تبدیلی تواریخ میں مجبوری کا اظہار کیا جس کے باعث تمام طلبائے جامعہ میں بے چینی پیدا ہو گئی اور طے کیا کہ جب تک تواریخ امتحانات میں تبدیلی کا اعلان نہ ہوگا جامعہ میں قدم نہ رکھیں گے۔

ایسے نازک موقع پر انجمن طیلسانئین عثمانیہ کی کابینہ نے ایک غیر معمولی جلسہ کیا اور صورت حال سے واقف ہونے کے لیے فی الفور اقامت خانۂ جامعہ عثمانیہ سے چند طلباء کو مدعو کرکے ان سے تبادلۂ خیال کرنے کے بعد یہ تصفیہ کیا کہ نواب میر اکبر علی خاں صاحب صدر انجمن اس خصوص میں اشتراک عمل کریں۔ صاحب موصوف نے ڈاکٹر میکنزی سے ملاقات کی اور جامعہ کے مقاطعہ کنندگان کے تقریباً ایک ہزار کے مجمع کو مخاطب کرتے ہوئے ایک اثر آفریں تقریر کی ان کے ساتھ موجودہ طلبائے جامعہ اور مولوی الیاس برنی صاحب ناظم تالیف و ترجمہ نے بھی تقاریر کیں جن کا اچھا اثر ہوا اور مجمع جلوس کے ساتھ اپنی اپنی جماعتوں میں داخل ہوگیا اور نائب معین امیر جامعہ نے تبدیلی تواریخ امتحان کا اعلان کیا۔

اس کشیدگی کی خوش انجامی کے سلسلہ میں ڈاکٹر میکنزی آنجہانی نائب معین امیر جامعہ طلبائے جامعہ اور انجمن کا اشتراک عمل قابل یادگار رہے گا۔

انجمن کی شاخیں گذشتہ دفعہ اعلان کیا جاچکا ہے کہ ہنمکنڈہ، گلبرگہ اور بیدر میں انجمن کی شاخیں قائم ہوچکی ہیں، دوران سال میں ضلع محبوب نگر میں بھی ایک شاخ کا قیام عمل میں آیا مگر ان شاخوں کی رہنمائی کے لیے تدوین دستور کی شدید ضرورت محسوس کی جاتی ہے تاکہ دائرۂ عمل معین ہو اور کاروبار بحسن و خوبی انجام پائیں یہ مسئلہ ترمیم دستور کا ہے اور ترمیم دستور پر غور کرنے کے لیے ایک سب کمیٹی کا قیام بھی عمل میں آیا ہے۔

اس سلسلہ میں شاخہائے انجمن کا مقامی حالات و اسباب کے پیش نظر ضروری امداد و رہبری کے لیے تعاون عمل کرنا ناگزیر ہے، توقع کی جاتی ہے کہ ترمیم دستور کا کام جلد انجام پائے گا اور انجمن کے کاروبار میں نئی سرگرمی پیدا ہوگی۔

اراکین اراکین کی تعداد ۱۳۴۵ف کی اختتام پر ۳۵۳ تھی اور یہ تعداد ۱۳۴۶ف کے اختتام پر ۳۷۲ رہی یعنی بمقابلۂ سال گذشتہ ارکان کی تعداد میں ۱۹ کا اضافہ ہوا۔ یہ امر مخفی نہیں جیسا کہ سال گذشتہ بتایا گیا ہے کہ انجمن کی سرگرمی مزید وسعت کی متقاضی ہے۔ انجمن کی جد و جہد سے اچھے نتائج حاصل کرنا طیلسانی برادری کی زیادہ سے زیادہ توجہ پر منحصر ہے۔ انجمن کی سرگرمی کی وسعت کے مد نظر طیلسانئین اپنی زیادہ سے زیادہ توجہ اس طرح مبذول کرسکتے ہیں کہ اولاً وہ اپنے اس فرض کو محسوس کریں جو بحیثیت ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے ان پر عائد ہے اور دوسرے یہ کہ اگر وہ اب تک انجمن کے رکن نہیں ہوئے ہیں تو رکن بن جائیں، اور رکن ہوچکے ہیں تو حتی الامکان

چندہ ادا کریں، اور وقتاً فوقتاً اپنے مفید مشوروں اور تحریکات سے انجمن کی جد وجہد کو آگے بڑھانے میں کوشاں رہیں۔

آمد وخرچ | سال زیر رپورٹ میں انجمن کی آمد وخرچ حسب تفصیل ذیل رہی:۔

	روپیے	آنے	پائی
آمدنی ...	۴۴۹	۱۴	۸
خرچ ...	۵۹۵	۲	۵
سلک ...	۹۴۳	۱۲	۳

بشمول آمدنی سلور جوبلی (۱۷۲) روپیہ ۱۱ آنے ۴ پائی۔

اختتامیہ | مقاصد انجمن کو آگے بڑھانے اور انجمن کی کارگزاریوں کو پبلک تک پہنچانے میں جن نیوز ایجنسیوں اور اخبارات نے حصہ لیا، ان کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے۔ اس کے بعد جناب میر سعادت علی صاحب رضوی ام اے عثمانیہ کا شکریہ لازم ہے جنھوں نے اپنی ان تھک کوششوں سے گذشتہ کانفرنس کو نہایت کامیاب بنایا۔ نواب میر احمد علی خاں صاحب کو بھی ہرگز نہیں بھلایا جا سکتا جن کو انجمن کی ہر تحریک سے دلچسپی ہے اور جن کا ایثار وخلوص لائق ہزار آفریں ہے۔ ناقدر شناسی ہوگی اگر نواب میر اکبر علی صاحب بیرسٹر کا شکریہ ادا نہ کیا جائے جو بحیثیت صدر انجمن اپنی گوناگوں مصروفیتوں کے باوجود انہماک اور دلچسپی کے ساتھ انجمن کے کاروبار میں دامے، درمے، قدمے، سخنے ہر طرح حصہ لیتے رہتے ہیں۔ ہم ان تمام اصحاب کے بھی ممنون ہیں جنھوں انجمن کے دفتر اور جلسوں کے انعقاد کے لیے مکان اور ہال کی اجازت عطا فرمائی۔ بالآخر ان تمام اصحاب کی خدمت میں ہدیۂ تشکر پیش کیا جاتا ہے جن کا انجمن کے مقاصد کو کامیاب بنانے میں نمایاں اور بڑا حصہ رہا۔

انعقاد کانفرنس کے لیے خدام اعلیٰحضرت بندگان عالی متعالی نے ٹاؤن ہال کی اجازت مرحمت فرمائی اس کی نسبت ہم بارگاہ جہاں پناہی میں نہایت ادب سے اپنا ناچیز نذرانۂ تشکر پیش کرتے ہیں اور عقیدتمندانہ طور پر اپنی غیر متزلزل اور کامل وفا شعاری کا اظہار کرتے ہوئے اس دعا پر رپورٹ ختم کرتے ہیں کہ خداوند کریم ہمارے شفیق، ہمدرد اور ترقی پسند بادشاہ کا سایۂ گرامی اقبال مندی اور فرخندگی کے ساتھ عرصۂ دراز تک ہمارے سروں پر قائم ودائم رکھے آمین ثم آمین۔

محمد عبدالرحیم معتمد انجمن طیلسانیین عثمانیہ

سالانہ رپورٹ عثمانیہ بلدی جماعت

بابتہ ۴۵ ف

انجمن طیلسانئین عثمانیہ ہر آئینہ لایق ستایش ہے کہ اُس کی منظم جد و جہد کے باعث حیدر آباد کی پُرسکون فضا میں زندگی کی لہر پیدا ہوگئی ہے۔ انجمن کی مختلف تحریکات میں سے تحریک بلدی خدمات ایک نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ اگرچہ انجمن طیلسانئین عثمانیہ بلدی خدمات میں کئی سال سے نمایاں حصہ لے رہی تھی لیکن یکم شہریور ۱۳۴۴ف کو تاریخ انجمن میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے، اس لیے کہ بلدی خدمات کو منظم طریقہ پر چلانے کے لیے عثمانیہ بلدی جماعتوں کی باضابطہ تشکیل ہوئی اور اس کے مستقل قواعد و ضوابط مدون کئے گئے۔ اس جماعت کے اغراض و مقاصد حسب ذیل قرار دیے گئے۔

(الف) جو رقبہ حدود بلدیہ حیدر آباد میں شامل ہے اس کے بہبود کی ہر جہتی کوشش کرنا۔

(ب) حفظان صحت کے لیے ہر قسم کی ممکنہ جد و جہد کرنا۔

(ج) اس امر کی کوشش کرنا کہ بلدیہ کا مالیہ مستحکم ہو اور غیر ضروری محاصل عائد نہ ہوں۔

(د) حتی الامکان صفائی، روشنی، آبرسانی، ڈرینج، محلوں، سڑکوں کی ترتیب و تنظیم۔ نیز اسی قسم کے دوسرے بلدی معاملات میں حیدر آباد کو اعلیٰ ترین معیار پہ لانے کی کوشش کرنا۔

(ہ) حیدر آباد کے شہریوں میں اپنے بلدی حقوق اور ذمہ داریوں کا صحیح احساس پیدا کرنا۔

(و) بلدی انتخابات میں حصہ لینا۔

قواعد مذکور کی مطابقت میں جماعت ہذا نے ابتدائے ۱۳۴۵ف سے اپنے کام کا آغاز کیا، اور بحمد اللہ پہلی سالانہ رپورٹ ایک سال کے اختتام پر انجمن طیلسانئین عثمانیہ اور پبلک کی آگاہی کے لیے پیش کر رہی ہے۔ سال زیر رپورٹ میں مولوی ابو الحسن سید علی صاحب وکیل ہائیکورٹ و رکن بلدیہ جیسے ہمدرد ملک نے صدارتی فرائض انجام دیئے۔ صاحب موصوف نے نہایت دلچسپی اور انہماک کے ساتھ جماعت ہذا کی رہنمائی فرمائی جس کے لیے ہم ان کے تہ دل سے سپاس گذار ہیں۔

مولوی محمد نذیرالدین صاحب بی اے ال ال بی (عثمانیہ) معتمد اور راقم الحروف شریک معتمد منتخب ہوئے مولوی صاحب نے آٹھ ماہ نہایت سرگرمی و تندہی کے ساتھ کام کیا مگر مستقر بلدہ کے باہر چلے جانے کی وجہ سے بقیہ مدت کے لیے فرائض معتمدی راقم الحروف نے انجام دئے مجلس عاملہ میں مندرجہ ذیل اراکین مجلس بلدیہ شریک تھے (۱) مولوی محمد شاہ عالم خاں صاحب (۲) جناب گنڈے راؤ صاحب ہرواکر بی اے ال ال بی (عثمانیہ) (۳) جناب بی رام کشن راؤ صاحب بی اے ال ال بی (۴) نواب فخر نواز جنگ بہادر، نیز دوران سال میں نواب بہادر یار جنگ بہادر مجلس عاملہ کے رکن مقرر ہوئے۔

سال زیر رپورٹ میں جماعت ہذا کے ارکان کی تعداد (۱۲۰) رہی جو عثمانیہ بلدی جماعت کی اہمیت و وسعت اور اس کے اغراض و مقاصد کی عظمت کا لحاظ کرتے ہوئے قطعاً ناکافی اور غیر تشفی بخش ہے۔ اس موقع پر اپنے ابنائے شہر سے عموماً اور تعلیم یافتہ طبقہ سے خصوصاً یہ استدعا بیجا نہ ہوگی کہ وہ اس جماعت میں شریک ہوکر بلدی خدمات کی تحریک کو تقویت پہنچائیں تاکہ ایک کثیر تعداد کے تعاون اور امداد سے وہ اپنے عظیم الشان مقاصد کو حاصل کرنے کے قابل ہوسکے۔ اگر ہمدردی اور ملک کی خدمت گذاری کا احساس رکھنے والے افراد استعانت کریں تو سال آئندہ ہم اہل ملک کی توقعات سے کہیں زیادہ بہتر نتائج پیش کرنے کے قابل ہوسکیں گے۔

اس سال مجلس عاملہ کے آٹھ اجلاس منعقد ہوئے جس میں جماعت ہذا اور حلقہ واری شاخوں کے ضروری انتظامی امور طے کئے گئے، اس کے دو کاروباری عام جلسے منعقد ہوئے۔

حلقہ واری شاخیں چار حلقوں میں جماعت کی باضابطہ شاخیں قائم ہوئیں جن کے صدر و معتمد حسب ذیل اصحاب ہیں:۔

حلقۂ دوم اندرون۔ صدر مولوی میر احمد علی خاں صاحب صوبہ دار میدک

معتمد۔ میر وزیر علی خاں صاحب بی اے (عثمانیہ)

حلقۂ سوم اندرون۔ صدر۔ نواب فیاض الدین خاں صاحب جاگیردار

معتمد۔ مولوی محمد علی صاحب ام اے (عثمانیہ)

حلقۂ چہارم اندرون۔ صدر۔ مولوی محمد شاہ عالم خاں صاحب وکیل ہائیکورٹ و رکن بلدیہ

معتمد۔ مولوی محمد فاروق حسین صاحب بی اے (عثمانیہ)

حلقۂ سوم اندرون کی مجلس عاملہ کے ارکان نے گو ابھی تک اپنے حلقہ کے دورے شروع نہیں کئے تاہم صفائی وغیرہ سے متعلق انفرادی شکایتوں کو رفع کروانے کی کوشش برابر کر رہے ہیں۔ حلقۂ مذکور کی مجلس عاملہ کارکنان بلدیہ کی شکر گذار ہے جس تحریک مختلف محلہ جات کی موریوں وغیرہ کی درستی کے متعلق فوری توجہ کی گئی۔ بالخصوص مولوی سید محمد محی الدین صاحب مدیر رہبر دکن ورکن بلدیہ کا بھی شکریہ ادا کیا جاتا ہے جو معتمد حلقہ کی استدعا پر معائنہ موقع کے لیے ایک مقام پر تشریف لائے اور جماعت کی امداد فرمائی۔ ہم ریلوے بورڈ کے بھی ممنون ہیں کہ بر بنائے تحریک محلہ جات چوک کسارٹہ حسینی علم وغیرہ کی طرف ریلوے بس سرویس جاری کی گئی۔

حلقۂ چہارم اندرون کی حالیہ تشکیل شدہ مجلس عاملہ سے توقع ہے کہ بہت جلد عملی کام کا آغاز کر دے گی۔ بقیہ حلقہ جات میں بھی ذیلی شاخوں کے باضابطہ قیام کی کارروائی جاری ہے۔ انشاء اللہ سال آئندہ کی رپورٹ میں جملہ حلقہ جات کی جماعتوں کی کارگذاریوں کا اظہار کیا جا سکے گا۔

مالیہ | تفصیلات موازنہ سال رواں حسب ذیل ہیں :-

انجمن طیلسانیئن عثمانیہ . . . . لعـہ

عطیہ از مولوی ابو الحسن سید علی صاحب سکریٹری جماعت للعـہ

〃 مولوی نذیر الدین صاحب بی اے . . . ـے ۲/۸

ال ال بی (عثمانیہ)

چندہ سالانہ ارکان جماعت . . . لعـہ

جملہ . . . . مالہ ۸ ۶/۸

اور خرچ سال دوراں کی تفصیل حسب ذیل ہے :-

صادر . . . . ـہ ۵/۲

خریدی صندوق وغیرہ . . . . للعـہ ۴/۶

خریدی نقشہ جات بلدیہ . . . . . عـہ

امداد حلقۂ دوم اندرون . . . . . . ـے

امداد حلقۂ اول بیرون . . . . . . عـہ ۴

الاؤنس ملازم دفتر . . . . . . عـہ

اُجرت طباعت قواعد مرمہ . . . . لعـہ ۶

جملہ . . . . ماعـہ ۴/۸

باقی . . . . لہـہ ۴

معتمد میر وزیر علی بی اے (عثمانیہ)

حلقۂ اول بیرون ۔ صدر ۔ نواب بہادر یار جنگ بہادر جاگیردار و رکن بلدیہ

معتمد ۔ مولوی محمد کرم علی خاں صاحب بی اے (عثمانیہ)

حلقۂ دوم اندرون کی مجلس عاملہ نے چند ماہ سے نہایت سرگرمی اور انہماک سے عملی کام کا آغاز کر دیا ہے جو مولوی میر احمد علی خاں صاحب صوبہ دار میدک کی غیر معمولی دلچسپی اور قیادت کا نتیجہ ہے جس کے لیے ہم موصوف کے بیحد ممنون ہیں۔ اس حلقہ کی مجلس عاملہ ہر جمعہ کو حلقہ کے کسی ایک حصہ کا دورہ کر کے عینی مشاہدات کی بنا پر رپورٹ مرتب کرتی ہے اور صفائی، حفظان صحت وغیرہ سے متعلق جو امور اصلاح طلب نظر آتے ہیں ان کی طرف محکمہ جات متعلقہ کی توجہ منعطف کراتی ہے، نیز جو امور پبلک سے متعلق ہوتے ہیں پبلک کو توجہ دلاتی ہے چنانچہ اب تک مغلپورہ، کوچہ لکھن لال، بازار جہاندار جاہ، کنٹہ تالاب میر جملہ، احاطۂ مبارز الدولہ، دریچۂ رنگ علی شاہ، کوچہ مسجد جعفری، کوچہ اندھیری باؤلی، کوٹلہ عالیجاہ، بی بی بازار، احاطۂ میر پادشاہ، چوک میدان خاں، پنج محلہ، کوچۂ رفعت الملک، کوچۂ حسن صالح اور شاہ علی بنڈہ کا دورہ ختم ہو چکا ہے۔ ارباب پولس اور صفائی نے ہمدردی و خلوص سے ہماری تحریکات پر غور کیا اور ان کو درخور پذیرائی سمجھا جس کے لیے ہم بدل اُن کے شکر گذار ہیں۔

یہ جماعت باشندگان حلقہ کی بھی سپاس گذار ہے جن کی اعانت و اشتراک کے بغیر ہماری جدوجہد شرمندۂ کامیابی نہیں ہو سکتی تھی۔

جماعت ہذا کے پیش نظر مزید چار ذیلی شاخیں قائم کرنے کی اسکیم ہے۔ امید ہے کہ ان حصہ واری جماعتوں کی وجہ سے جماعت کے کاموں میں مزید سہولت پیدا ہو جائے گی، یعنی یہ کہ اکثر حلقہ جات بہ لحاظ آبادی مستقر بائے اضلاع کے برابر ہیں، ایسی صورت میں بلدی معاملات کی انجام دہی کے لیے جب تک ذیلی جماعتیں قائم نہ ہوں سہولت سے کام انجام نہیں پا سکتا۔ توقع ہے کہ حلقۂ دوم اندرون کی یہ عملی کارروائیاں دوسرے حلقوں کے کارکنوں کے لیے باعث تقلید ہونگی۔

حلقۂ دوم اندرون کے علاوہ حلقۂ اول بیرون کے صدر نواب بہادر یار جنگ بہادر اور معتمد مولوی محمد کرم علی خاں صاحب بی اے (عثمانیہ) نے بھی سرگرمی اور دلچسپی سے اپنے فرائض کی انجام دہی شروع کی ہے، اس حلقہ کی مجلس عاملہ کے ارکان اپنے حلقہ کے مختلف محلہ جات کا معائنہ کر رہے ہیں۔ ناقدر شناسی ہوگی اگر ان کی کارروائیوں کو بنظر استحسان نہ دیکھا جائے۔

مجلہ طیلسائین

۱۔ یہ مجلس علمیہ طیلسائین عثمانیہ کا سہ ماہی علمی و ادبی رسالہ ہے جو جنوری، اپریل، جولائی، اکتوبر مطابق بہمن، اردی بہشت، امرداد، آبان میں شایع ہوگا۔

۲۔ اس رسالے میں طیلسائین عثمانیہ کے علمی و ادبی مضامین، بلند پایہ نظمیں، اور وہ تحقیقی مقالات بھی بالاقساط شایع ہوں گے جو جامعہ عثمانیہ کی ام اے اور ام یس سی کی ڈگریوں کے لیے قبول کئے گئے ہیں نیز انجمن طیلسائین عثمانیہ کی عملی سرگرمیوں کی روداد بھی پیش کی جائے گی۔

۳۔ مضامین متعلقہ سیاسیات حاضرہ اور دل آزار تنقید کسی صورت سے قابل اشاعت متصور نہ ہوں گے۔

۴۔ رسالے کی ضخامت کم سے کم (۱۲۵) صفحے ہوگی۔

۵۔ سالانہ چندہ پیشگی ۷ روپیے سکۂ عثمانیہ علاوہ محصول ڈاک۔

۶۔ زر چندہ اور تمام مضامین نظم و نثر معتمد کے نام بھیجے جائیں اور دیگر امور کیلیے منتظم اعزازی سے مراسلت کیجائے

زندہ طلسمات پریس

حیدرآباد دکن

مجلّۂ طیلسانیین کے مقاصد و قواعد

(۱) "مجلّۂ طیلسانیین" انجمن طیلسانیین عثمانیہ حیدرآباد دکن کا ترجمان ہے۔

(۲) اغراض انجمن کے لحاظ سے مجلّہ میں مضامین مقالے اور نظمیں شایع ہونگی۔

(الف) جامعۂ عثمانیہ کے منظورہ مابعد طیلسان مقالے شائع کئے جائینگے۔

(ب) اردو مطبوعات پر تنقید و تبصرہ کیا جائیگا۔

(ج) انجمن طیلسانیین عثمانیہ اور اسکے ملحقہ اداروں کی سرگرمیوں اور کاروبار کے تفصیلات کی اشاعت عمل میں آئیگی۔

(د) علمی اور ہر جہتی ترقی کے معلومات و اطلاعات شائع کی جائینگی۔

(ھ) سیاسیات حاضرہ اور اختلافی مذہبی امور کے متعلق مضامین وغیرہ کسی صورت میں شائع نہ کئے جائینگے۔

(۳) حسب ضرورت مجلّہ کے مختلف حصّے خاص خاص علم وفن سے مختص ہونگے۔ فی الوقت مجلّہ کے دو حصّے ہونگے ایک عام حصّہ دوسرا موسوم بہ "معاشیات"

(۴) مجلّہ بہمن۔ اردی بہشت۔ امرداد۔ آبان مطابق جنوری۔ اپریل۔ جولائی۔ اکتوبر میں شایع ہوگا۔

(۵) مجلّہ کے ہر حصّہ کی ضخامت کم از کم سو صفحات ہوگی۔

(۶) مضمون یا مقالہ نگار کو ان کے مضمون یا مقالہ کے ۲۵ نسخے بلا قیمت ارسال ہونگے۔ اگر ۲۵ نسخوں سے زاید نسخے درکار ہوں تو کاغذ کی قیمت قبل از قبل ادا کرنے پر انتظام عمل میں لایا جائیگا۔

(۷) اگر مضمون یا مقالہ نگار پہلے سے مجلّہ کے خریدار نہوں تو مجلّہ کا وہ شمارہ جسمیں مضمون شایع ہو بلا قیمت ارسال کیا جائیگا۔

(۸) سال بھر میں کسی صاحب کے دو مضمون یا مقالے شایع ہونے کی صورت میں سال مابعد کے لئے اگر قواعد انجمن طیلسانیین عثمانیہ مانع نہوں تو مجلّہ بلا قیمت جاری کیا جائیگا۔

(۹) اگر کوئی مضمون یا مقالہ یا نظم قابل اشاعت قرار نہ پائے تو اسکو واپس کردیا جائیگا۔

(۱۰) اگر کسی مضمون یا مقالہ کیلئے مجلّہ اپنے خرچ سے تصاویر کے بلاکس تیار کرے تو ان کو مناسب قیمت پر جسکا تصفیہ مہتمم مجلّہ کریگا فروخت کیا جاسکیگا۔

(۱۱) اگر مجلّہ کا کوئی شمارہ اشاعت کے مقررہ مہینہ میں وصول نہ ہو تو اسکی اطلاع مہتمم کو دوسرے مہینہ میں کردینی چاہیئے۔

انجمن طیلسانیین عثمانیہ حیدرآباد دکن کا سہ ماہی ترجمان

مجلۂ طیلسانیین

جلد ششم سنہ ۱۳۵۱ف مطابق سنہ ۱۹۴۲ء شمارہ سوم و چہارم

مجلسِ ادارت

فہرست

صفحہ

۱۔ اداریہ

۱۔ عرض حال ۵

۲۔ مجلہ کی ترتیب ۱۰

۳۔ فکر و نظر ۱۲

۲۔ مقالات

۱۔ سواحل ہندوستان پر مسلمانوں کا توطن ..... مولانا محمد مرتضیٰ مرحوم ۱۸

۲۔ تعلیقات بر مقالۂ صدر .... ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب ۳۹

۳۔ خاندان والا جاہی کا خاتمہ .... مولوی محمد غوث صاحب ام اے ۵۳

۴۔ حیدرآباد کا دفتر دیوانی و مال و ملکی .... مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی ۷۰

۳۔ مخطوطات کے خزانے

۱۔ میر عبدالرزاق شاہ نواز خاں کے خطوط .... مولوی محمد غوث صاحب ام اے ۸۰

۲۔ چند فرامین بادشاہان دہلی موسومہ روسائے دکن ... مولوی محمد غوث صاحب ام اے ۸۵

۴۔ تاریخی کاغذات کے ذخیرے

۱۔ حضرت آصفجاہ اوّل و نواب ناصر جنگ شہید کے عنایت نامے موسومۂ مجتبیٰ جاور ... مولوی محمد غوث صاحب ام اے ۹۲

۵۔ تنقید و تبصرہ و رسید کتب وغیرہ

۱۔ "ہندوستان کے آثار قدیمہ" .... ک۔ ا۔ ۹۵

۲۔ "جنگ ۱۹۳۹ء کیوں ہوئی" .... ک۔ ا۔ ۹۵

۳۔ "خنداں" .... ن۔ م ۹۶

۴۔ رسید کتب

۵۔ انجمن طیلسانیین عثمانیہ کے کتب خانہ میں جدید اضافہ ۹۹

۶۔ کتب خانۂ معاشی کمیٹی حیدرآباد میں جدید اضافہ ۱۰۰

۶۔ معاصروں کے صفحے ۱۰۴

۷۔ جامعاتی معلومات ۱۰۹

۸۔ انجمن طیلسانیین عثمانیہ اور اسکے ملحقہ اداروں کی اطلاعیں ۱۱۶

نمایش مملکت آصفیہ سال بسال ۱۲۰

" خلاصۂ پیش نامہ ۱۳۵۲ف ۱۲۱

۹۔ حصۂ معاشیات (اسکی فہرست اپنے مقام پر درج ہے)

اداریہ

عرضِ حال

چھے سال کی مدت ہوئی کہ "مجلّہ طیلسانیین" کی اشاعت کا آغاز ہوا۔ بہمن ۱۳۴۶ف میں مجلّہ کا پہلا شمارہ شائع ہوا تو اسکے اداریہ میں مجلّہ کے اغراض و مقاصد حسب ذیل بیان کئے گئے :۔

۱۔ یہ مجلّہ طیلسانیین عثمانیہ کا ترجمان ہے۔

۲۔ اس مجلّہ میں طیلسانیین عثمانیہ کے حالات اور خیالات پیش کئے جائینگے۔

۳۔ ان مقالوں کو بالاقساط شائع کیا جائیگا جو ام۔اے اور ام۔ایس سی وغیرہ کے امتحانوں کے لئے جامعۂ عثمانیہ کے طیلسانیین نے قلم بند کئے۔

۴۔ اُردو مطبوعات پر تنقید و تبصرہ کیا جائیگا۔

اپنے ان مقاصد کی تکمیل میں مجلّہ نے اپنی عمر کی چھے منزلیں طے کرلی ہیں، ہرچند اس عرصہ میں انجمن طیلسانیین عثمانیہ کی سرگرمیاں برابر جاری رہیں، اور اسکے بعض ملحقہ اداروں نے کام کرنے اور آگے بڑھنے کا کامیاب مظاہرہ کیا، لیکن مجلّہ کو ہر منزل پر گوناگوں دقتوں اور مشکلات کا سامنا ہوا۔ یہ نہیں کہ ان مشکلات کو دُور کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ لیکن چونکہ ناکامی ہی کامیابی کا پیش خیمہ ہوتی ہے اسلئے مجلّہ کی ترقی کیلئے پھر ایک اور کوشش کی جاتی ہے۔ خدا کرے کہ یہ کوشش سازگار ثابت ہو۔

یہ امر برمحل نظر آتا ہے کہ مجلّہ کے مطمحِ نظر کے متعلق کچھ وضاحت کی جائے، اس وضاحت سے قبل نامناسب نہیں اگر پلٹ کر پاؤ صدی پہلے کے حیدرآباد پر نظر ڈالی جائے۔

۲۸ سال قبل حیدرآباد میں ایک انجمن "انجمن معارف" کے نام سے قائم تھی۔ اسکے سرپرست مشہور محبِ وطن اور خادمِ قوم ملا عبدالقیوم مرحوم تھے، اسکے ترجمان کی حیثیت سے ۱۳۱۶ف میں صحیفۂ ماہواری کا بہ ادارت مولانا محمد اکبر علی صاحب آغاز ہوا۔ اسکے خیر مقدمی مقالہ میں مولانا محمد مرتضیٰ مرحوم نے لکھا تھا کہ :۔

"اے حیدرآباد! تجھ میں اور فرنگستانی نامور شہروں میں کیا فرق ہے؟ جیسے ان کی فضا میں بسنے والے آدمی ہیں

تیری فضا میں بھی بسنے والے آدمی ہیں وہی قومی جوان کے ہیں ہم بھی رکھتے ہیں، وہی تمدنی ضرورتیں جو ان کو درپیش ہیں، ہم کو بھی ہیں فرق ہے تو یہی کہ ان شہروں کے بسنے والے اپنے کاموں کا مقصد اپنے وطن کی عزت سمجھتے ہیں اور ہم محض اپنی ذاتی خواہشوں میں سرگرداں ان کے بسنے والے اپنے ملک کی خوبیوں کی شہرت پھیلاتے ہیں اور ہم صرف اپنی خوبیوں کے اظہار میں مستغرق، ان کے بسنے والے اپنے وطن کی قدرتی خوبیوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور ہم ان سے بے خبر، ان کے بسنے والے اپنی ضرورت پر اپنے طرز زندگی اور معاشرت کی بنیاد رکھتے ہیں اور ہم اندھی بھری تقلید کے جال میں پھنسے ہوئے ان کے بسنے والے اپنی تاریخ کو حرز جان بنائے رکھتے ہیں اور ہم اس سے محض نابلد، ان کے بسنے والے اپنی مادری زبان کے لئے جان لڑائے دیتے ہیں اور ہم اُلٹے اسکو ذبح کر دینے میں دریغ نہیں کرتے مختصر یہ کہ جو تجھ میں بستے ہیں تجھ سے غافل ہیں اور نہیں جو بستے ہیں وہ اس سے کبھی غافل نہیں ہوتے"

عام طور سے ملک و اہل ملک کے بارے میں آج سے (۳۱) برس پہلے جب کہ صحیفۂ ماہانہ نے صحیفۂ روزانہ کی شکل اختیار کی یہ تصویر کھینچی گئی تھی کہ:—

"ہماری علمی زندگی کا عام طور سے کوئی پائدار نشان نہیں ملتا، معاشرت اور تمدن کی جیسی کچھ ابتر اور رو بہ تنزل حالت ہے وہ محبان وطن سے چھپی ہوئی نہیں ہے، لٹریچر کے لحاظ سے یہ امید ابھی پوری نہیں ہوئی کہ حیدرآباد اردو کیلئے بہ لحاظ شاہی زبان کا دارالسلطنۃ ہونے کے، بہمہ وجوہ مستند بن جائے، مشرقی علوم کی شادابی کی کچھ بھی کوشش نہیں ہو رہی ہے بلکہ یہ چمن اور سوکھتے ہی چلے جا رہے ہیں اگر کسی پہلو میں کوئی ترقی بھی ہوئی ہے تو وہ اسقدر آہستگی کے ساتھ کہ اس سے اس خوفناک رفتار تنزل کا کسی طرح مقابلہ نہیں ہو سکتا جو بدقسمتی سے جاری ہے، تمدن کی کونسی شاخ ایسی ہے جس سے ہم اپنے دل کو تسلی دے سکیں اور یہ کہیں کہ ہاں حیدرآباد اس میں ترقی کر رہا ہے، علمی حلقے جن کی تازگی پر ملک کی تازگی مسلّم ہے اس طرح سنسان ہیں جس طرح پہلے تھے بلکہ اور زیادہ، کوئی دماغ دکھائی نہیں دیتا جو فیضان مغرب سے منور ہونے کے بعد ملک کی اس بے حس و حرکت علمی حالت میں ذری سی بھی جنبش دلانے کی کوشش کرتا ہوا پایا جائے جو چند دردمند ملی حسن اتفاق سے پیدا ہو گئے ہیں ان کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ نئی نسل ان کو مدد دینے کے لئے تیار نہیں ہو رہی ہے تو ان کی دردمندی اور بڑھ جاتی ہے

ایسے رہبران طریقت کا جلوہ نظر نہیں آتا جو ابنائے ملک کے صدیوں کے مستحکم عیوب کو دور کریں اور ان کو زمانہ کی رفتار سے آگاہ کریں، قحط الرجال کا خوفناک اثر ہم میں علیٰ حالہ جاری ہے۔ جس طبقہ سے کوئی نامور فرد اٹھ جاتا ہے تو اس کا جانشین نہیں ملتا، اور نہ اسکی کوشش ہو رہی ہے نئی نسل کو کوئی نمونہ بنکر دکھانے والا نظر نہیں آتا کہ پرانی فطرت اور قدیم خصائل اور نئی ضرورتوں کو کسی عمدہ سانچہ میں ڈھال کر ہماری معاشرت و تمدن کی بنیاد قائم کر سکے۔ مالی حالت اس سے بھی بدتر ہے۔ سرمایۂ ملک دن بدن گھٹتا چلا جا رہا ہے ذرائع کسب دولت جو باعث رفاہ قوم و ملک ہوں، مشترکہ سرمایہ سے کام لینا، ملک کے پیداوار و صنائع کو ترقی دینی ان سب باتوں سے ہم اسی طرح کورے ہیں جیسے پہلے تھے، غرض کہ تعلیم کی قوت جو تمدن کی تمام شاخوں کو زندہ کرنے والی اکسیر ہے ویسی ہی پژمردہ ہے جیسے پہلے تھی بلکہ اور زیادہ"۔

اس ۳۰ اور ۳۱ سال کی طویل مدت میں دنیا کے طول و عرض میں بیسیوں انقلابات ہو گئے اور ترقی کی دوڑ میں قومیں اور ممالک کہاں سے کہاں پہنچ گئے، شکر ہے کہ حیدرآباد بھی اعلیحضرت جلالت الملک نواب میر عثمان علیخاں بہادر مدظلہ العالی کے عہد آفرین دور میں بیدار ہو رہا ہے اور چاہتا ہے کہ عظمت و ترقی کے وہ منازل طے کرے جنکو دنیا کی زندہ قومیں اپنا حق سمجھتی ہیں۔ اعلیحضرت خسرو حیدرآباد دو برار کی نگاہ دقیقہ رس نے جان لیا کہ ملک میں جب تک اپنی جامعہ قائم نہ ہو ترقی اور سربلندی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ جامعۂ عثمانیہ کا قیام سینکڑوں آرزوؤں اور تمناؤں کے ساتھ عمل میں آیا۔

ایک حیدرآبادی جامعہ سے جو تمنائیں ہو سکتی ہیں ان کو بھی مولوی محمد مرتضیٰ مرحوم ہی سے سننا چاہئیے۔[۱]

"اے حیدرآبادی جامعہ تیرے بسنے والوں کو خواب غفلت سے جگائیگی اور بتائیگی کہ ان کے کیا فرائض ہیں، اور اگر وہ اپنی زندگی چاہتے ہیں تو ان کو کیا کرنا ضرور ہے۔ تیری سنگستانی زمین میں

---

[۱]۔ ہر چند مرحوم نے ان امیدوں کو انجمن معارف کے ترجمان سے وابستہ کیا تھا لیکن ایسی بڑی امیدیں کوئی جامعہ ہی پوری کر سکتی ہے، مرحوم کے الفاظ میں تھوڑا سا تصرف کر لیا گیا ہے۔

کیسے کیسے انمول جواہر ہیں اور تیری صاف فضا میں کیسے کیسے نایاب پھول کھلتے ہیں، جامعہ انہیں انمول جواہر کا ہار اور نایاب پھولوں کا گلدستہ بنانے والی ہوگی، انہی پھولوں کی مہک تیرے بسنے والوں کے مردہ دلوں میں تازگی کی وہ روح پھونک دیگی جو فرنگستانی شہروں میں پائی جاتی ہے۔ تیرے علمی حلقوں میں جو سنسان پڑے ہوئے ہیں وہ ایک ہل چل مچادیگی، وہ تیری خوبیوں کو عام شہرت دیگی۔ تیرے بے شمار قدرتی وسایل سے جو اس وقت تک معطل پڑے ہوئے ہیں فائدہ اٹھانے کے ذرائع بتائیگی، تیری معاشرت کے لئے جو اس وقت تزلزل اور ضغطہ کی حالت میں ہے صاف اور سیدھا راستہ بتائیگی، جامعہ بتائیگی کہ اندھی تقلید کی بجائے کن اصولوں پر معاشرت کی بناڈالی جائے وہ تیری تاریخ کو جو تاریکی میں پڑی ہوئی ہے اور جس سے تیری خوش آیند زندگی وابستہ ہے روشنی میں لائیگی۔ تیری زبان کو صاف کرکے اس درجہ پر پہنچادیگی جس سے آئندہ تو ہی اُردو زبان کے لئے ٹکسال بن جائے، اس طرح سے وہ تیرے باشندوں کو ایک زندہ طاقت بنادیگی"

جامعۂ عثمانیہ سے یہ اُمیدیں کس حد تک پوری ہوئیں، اس کا جواب تو خیر آیندہ کسی مورخ کا قلم ہی دے سکیگا لیکن اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ آج حیدرآباد نے جو اُمید بخش کروٹ لی ہے وہ جامعۂ عثمانیہ کی ہی مسیحائی کی مرہون منت ہے، زندہ باد شاہ عثمان! پائندہ باد جامعہ عثمانیہ!!

لیکن یہ چند نوجوان جنکو جامعہ نے پیدا کیا ہے دراصل پانی کے ان چند قطروں کے مماثل ہیں جو اس آگ کو بجھا نہیں سکتے جو دردمند دلوں کے دل و جگر کے سوز سے پیدا ہوکر زندگی کا لازمہ بن جاتی ہے۔ ایسی حالت میں گو خوشی کا موقع تو ضرور ہے لیکن دم لینے کا کوئی موقع نہیں ہے۔

جامعۂ عثمانیہ کی برادری کے جو فرایض ہیں ان کی اہمیت سے انکار کس طرح ہوسکتا ہے، جامعہ کی چار دیواری سے باہر آجانے کے بعد عثمانیین کا کام صرف یہی نہیں ہے کہ فکر معاش کی پریشانیوں میں مبتلا ہوکر دنیا و ما فیہا سے بے خبر ہو جائیں، زندگی کی صعوبت اور مشقت ہر زمانہ میں قوموں اور ملکوں کا امتحان لیتی رہی ہے اور آخر کار اس امتحان میں وہی قومیں کامیاب ہوئیں جن کا عزم راسخ، جن کا ارادہ مضبوط اور جن کا عمل خالص ہوتا ہے۔

ملکی تعلیم کی برکتوں سے فیض یاب ہونے کے باعث جامعۂ عثمانیہ کی برادری کا یہ فرض ہے کہ وہ عزم راسخ کیسا تھ

اس بات پر کمر باندھ لے کہ اپنے عزیز ملک کو عزت اور مرتبت کے بلند ترین کنگرہ پر پہنچا دے۔ ملک میں ترقی کرنے کی پوری صلاحیت موجود ہے اور اسکے باشندے صحیح رہبری اور رہنمائی کے منتظر ہیں، وہ اسباب موجود اور مہیا ہیں جو ترقی کے کاروان کو ایک منزل کے بعد دوسری منزل پر پہونچاتے ہیں، ضرورت صرف جوش اور سرگرمی کی ہے اور صحیح قیادت کی۔

انجمن طیلسانیین عثمانیہ کا یہ ایقان ہے کہ ملک کا مستقبل تعلیم یافتہ نوجوانوں کے ہاتھ میں ہی ہے اور ان کی صحیح رہبری میں ہی ملک کی نجات مضمر ہے۔ انجمن کی ساری کوششوں کا مآل محض "خدمت ملک و مالک" ہے۔ انجمن کوشش وسعی کا جو حق ادا کرنا چاہتی ہے اُس کا ایک ذریعہ یہ مجلّہ بھی ہے۔ مجلّہ کی ہمیشہ یہ کوشش رہیگی کہ وہ اپنے فرض کو انجام دینے میں انجمن کے لئے نیک نامی کا ذریعہ ثابت ہو۔

مجلّہ طیلسانیین کا کام محض یہ نہیں ہے کہ اپنے ناظرین کیلئے بہ اوقات مقررہ تفریح طبع کا سامان فراہم کرے افسانوں اور نام نہاد ادب لطیف کی بھول بھلیاں میں سرگرداں رہے، اور تنقید و تبصرہ کی وہ روش اختیار کرے۔ جس سے صرف باہمی رقابت اور آویزش کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ اسکے صفحات پر کوئی چیز ایسی نہ آنی چاہیے جو دماغی و ذہنی تعیش کی مظہر ہو۔ مجلّہ طیلسانیین کو حقیقی علم اور صحیح تاریخ کی اشاعت کا علم بردار ہونا چاہیے، اسکو ادب آموز بھی ہونا چاہیے اور اخلاق ساز بھی، اس کا یہ فرض ہونا چاہیئے کہ بلاخوف اعدے معاشرت کی ان خرابیوں کو بتائے جو نہ صرف مردگی اور پستی کی علامتیں ہیں بلکہ جو گھُن کی طرح قوم کی اصلی قوت کو اندر ہی اندر کھائے جا رہی ہیں، مشاہیر ملک کی زندگی کے حالات کو روشنی میں لانا، ان کی کامیابی اور ناکامی کا پتہ چلانا، ان کے کام کو صحیح تنقید کے معیار پر جانچنا، معاشی برتری کے وسایل کی تلاش و تحقیق، غرض ملک کی ہر جہتی صلاح و فلاح کے لئے غور کردہ خیالات کو خالص علمی نقطۂ نظر سے پیش کرنا مجلّہ کا مسلک ہونا چاہئے، ہر حالت میں راست گفتاری اس کا شعار اور دیانت اس کا وتیرہ ہونا چاہیئے۔

اس آرزو اور اس نیت سے مجلّہ اپنا راستہ چلنا چاہتا ہے کوشش وسعی کے اس ارادہ میں خلوص عطا ہونا اور بالآخر کامیابی بخشنا، بخشندۂ ازلی کے ہاتھ میں ہے۔

مجلہ کی ترتیب

مجلہ کی اس اشاعت سے "معاشیات" کا حصہ اور بعض دوسرے ابواب مستقل طور سے شروع کئے جارہے ہیں
اس سلسلہ میں بعض امور کے متعلق ضروری صراحت مناسب معلوم ہوتی ہے۔

۱۔ مجلہ کا ہر ناظر اس بات سے واقف ہے کہ اُردو رسایل اور مجلات میں ایک ہی علم یا فن کے متعلق اختصاصی مجلے یا رسالے زیادہ تر حیدرآباد سے ہی شاذ و نادر شائع ہوتے ہیں کچھ عرصہ قبل حیدرآباد سے "تاریخ" کے نام سے ایک مجلہ محض تاریخ کے موضوع پر مضامین و مقالات طبع کرنے کیلئے شائع ہونا شروع ہوا تھا اور گو وہ اب بھی شائع ہوتا ہے لیکن یہ بات ظاہر ہے کہ وہ اپنے مالیہ سے بے فکر نہیں ہو سکا ہے۔ اسی طرح قانون کے موضوع پر معیاری مضامین شایع کرنے کے ارادہ سے حیدرآباد میں "مقنن" وجود میں آیا تھا لیکن جاری نہ رہ سکا۔ گو قانون کے موضوع پر یہاں سے اب بھی بعض مجلے شایع ضرور ہوتے ہیں لیکن وہ زیادہ تر سرکاری احکام اور قانونی نظائر کے مخزن ہیں۔ "کشافہ" کے نام سے اسکوٹنگ کے موضوع پر ایک اچھا رسالہ حیدرآباد سے ہی نکلتا تھا لیکن باقی نہ رہ سکا۔ "المعلم" اور "حیدرآباد ٹیچر" جو حیدرآباد میں طبع اور شائع ہوتے ہیں مسائل تعلیمی کے اختصاصی رسایل ہیں اور کافی عرصہ سے جاری ہیں۔ ابھی حال میں انجمن ترقی اُردو نے "سائنس" کے نام سے ایک ماہواری مجلہ کامیابی کیساتھ حیدرآباد سے شایع کرنا شروع کیا ہے۔ سیاسیات کے موضوع پر "سیاسیات" کے نام سے ایک معیاری مجلہ بھی حیدرآباد سے ہی پابندی کے ساتھ طبع ہو رہا ہے۔ طب اور طبابت کے متعلق دو ایک خاص رسایل ہندوستان اور حیدرآباد سے شائع ہو جاتے ہیں۔ باقی دوسرے بیسیوں اُردو مجلے بلا کسی اختصاص کے ہر موضوع پر مقالے اور مضامین چھاپ دیا کرتے ہیں۔

معاشیات کے سیر حاصل اور خاص اہمیت کے موضوع پر اکثر اُردو رسائل میں کافی معیاری مضامین طبع ہو جاتے ہیں لیکن اس موضوع کی اہمیت اس بات کی متقاضی ہے کہ اس پر ایک خاص مجلہ شائع ہوا کرے چنانچہ مجلہ طیلسانئین کی اس اشاعت کے ساتھ اسکے حصۂ معاشیات کا آغاز کر دیا گیا ہے۔ اُمید کہ مجلہ کی یہ کوشش پوری طرح کامیاب ہوگی اور ملک میں خوش حالی اور فارغ البالی پیدا کرنے کے لئے اسکے مضامین ہر طرح ممد و معاون ثابت ہونگے۔

۲۔ سب اصحاب علم پر یہ بات واضح ہے کہ مشرق کے علوم و فنون کے شہ کار اب بھی صرف مخطوطات کی شکل میں ہی محفوظ ہیں۔ مخطوطات کے مالکوں اور محافظوں کی جہالت یا غفلت سے سینکڑوں قیمتی کتابیں یا تو کیڑوں اور دیمک کی غذا ہوگئیں یا غیر ملکوں کے قدردانوں کے ہاتھوں میں پہنچ گئیں لیکن اسکے باوجود اس وقت بھی ہندوستان کے طول و عرض اور خود مملکت آصفیہ کے گوشہ گوشہ میں سینکڑوں مخطوطات شائقین اور اصحاب ذوق کی خبر گیری اور استفادہ کی منتظر صندوقوں اور الماریوں میں بند ہیں۔ مشرقی علوم و فنون اور مشرقی تمدن و ثقافت کے طلبہ کسی تحقیق و تلاش کا پورا حق اس وقت تک ادا نہیں کرسکتے جب تک کہ وہ مخطوطات سے استفادہ نہ کریں۔

اس سلسلہ میں بڑی مشکل یہ ہے کہ مملکت آصفیہ کے ذخائر کی تفصیلی فہرستیں تاحال مرتب نہیں ہوئی ہیں، یا اگر مرتب ہوئی بھی ہیں تو ان سے عام استفادہ نہیں ہوسکتا، دو ایک کتب خانوں نے اپنے ذخائر کے کسی خاص حصہ کی تفصیلی فہرست شائع کی ہے جیسے کہ جامعہ عثمانیہ کے کتب خانے کے اردو مخطوطات کی فہرست یا کتب خانۂ آصفیہ کے بعض مخطوطات کی کیفیت۔ البتہ ہندوستان کے بعض کتب خانوں نے اپنی تفصیلی فہرستیں یا تو شائع کردی ہیں یا ان کا سلسلہ جاری ہے۔ بہرحال مخطوطات کے متعلق مضامین کا ایک خاص سلسلہ ایک بڑی مدت کیلئے مستقل طور سے جاری رہ سکتا ہے۔

مجلّہ کی حالیہ اشاعت سے اُس میں ایک باب کا مستقل اضافہ کیا گیا ہے تاکہ مخطوطات کے جو خزانے مملکت آصفیہ میں یا اسکے باہر موجود ہیں ان سے عام آگاہی کا سامان ہو۔ اُمید ہے کہ اسطرح مختلف علوم و فنون کے شائقین کو قیمتی مخطوطات سے وقتاً بوقتاً آگاہ ہونے کا موقع حاصل ہوگا یا دوسری ضروری معلومات فراہم ہونگی۔

۳۔ ہندوستان کی تاریخ لکھنے میں تاحال کاغذات سے بہت کم استفادہ کیا گیا ہے۔ اس بارے میں اس وقت تک جو توجہ کی گئی ہے وہ گویا نہ ہونے کے برابر ہے، حالانکہ اسکی ضرورت اور اہمیت مسلّم ہے۔ ہندوستان کے ہر گوشہ میں ایسے کاغذات جو تاریخ کا ماخذ بن سکیں بہ تعداد کثیر حاصل ہوسکتے ہیں، حیدرآباد بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے، یہاں کے بیسیوں قدیم خاندانوں میں ایسے سینکڑوں کاغذات موجود ہیں کہ انکی اشاعت عمل میں آئے تو بے شمار تاریخی امور پر روشنی پڑیگی، اور کئی مختلف فیہ مسائل حل ہو جائینگے۔

اسی نقطۂ نظر سے مجلّہ کے اس شمارے سے ایک باب مستقل طور سے قایم کیا گیا ہے تاکہ اہم اور دلچسپ تاریخی کاغذات کی اشاعت عمل میں لائی جائے اور بشرط امکان ان کے عکس شامل کئے جائیں۔ اس شمارے میں تبرکاً دو ایسے عکس شامل کئے گئے ہیں جن میں سے ایک پر حضرت آصفجاہ اوّل کی مہر اور بعض ثبت ہے دوسرے عکس میں حضرت ناصر جنگ شہید کی مہر اور بعض کے علاوہ حضرت موصوف کی خود نوشتہ تحریر بھی موجود ہے ان کے متعلق تفصیلی کیفیت اپنے مقام پر ملاحظہ فرمائی جا سکتی ہے۔

توقع ہے کہ یہ سلسلہ ایک مدّت دراز تک جاری رہ سکیگا اور بے شمار ضروری اور اہم کاغذات تاریخی کے عکس اصحاب تاریخ کے فائدے کے لئے مہیّا ہو جائینگے۔

۴۔ ہندوستان کی جامعات میں وقتاً فوقتاً ترقی اور اصلاح کے جو مراتب عمل میں آتے رہتے ہیں ان سے عام آگاہی کا کوئی ذریعہ مہیّا نہیں ہے کوئی ایسا رسالہ یا اخبار نظر سے نہیں گزرا جس میں سب جامعات کی کیفیتیں فراہم کی جاتی ہوں، حالانکہ اس علم کیلئے یہ امر بہت ضروری ہے کہ وہ دوسری جامعات یا اعلیٰ علمی اداروں کے حالات سے واقف رہیں، اسکے مدنظر مجلّہ کے اس شمارے سے ایک باب جامعاتی معلومات کیلئے مختص کر دیا گیا ہے، اس باب میں بالعموم ہندوستانی جامعات یا مماثل اداروں کے ضروری حالات فراہم کئے جائینگے اور حالات اجازت دیں تو دُنیا کی بڑی بڑی جامعات کے متعلق بھی معلومات فراہم کی جائینگی۔

خوش قسمتی سے ہندوستان کے انٹر یونیورسٹیز بورڈ کا مستقر الہ آباد کی بجائے اب حیدرآباد قرار پایا ہے اور اسکی معتمدی پر جناب پروفیسر ہارون خاں صاحب شروانی صدر شعبۂ تاریخ و سیاسیات جامعہ عثمانیہ کا انتخاب عمل میں آیا ہے۔ جناب موصوف نے اپنی مہربانی سے اس بات کا یقین دلایا ہے کہ وہ بورڈ کی جانب سے ہر قسم کی سہولت مہیّا فرمائینگے۔ اس باہمی تعاون سے توقع ہے کہ بہت کچھ علمی اور عملی فواید حاصل ہونگے۔

فکر و نظر

۱۳۴۵ف میں کانفرنس طیلسانین عثمانیہ نے یہ تحریک منظور کی تھی کہ جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ قانون میں ال ال بی کے مافوق قانونی تعلیم کا انتظام عمل میں لایا جانا مناسب ہوگا۔ یہ ایک حقیقت تھی کہ ال ال بی کا امتحان

کامیاب ہونے کے بعد طلبہ فکر معاش کی پریشانیوں میں مبتلا ہو جاتے تھے، وکالت یا ملازمت کے حلقہ میں گھر جانے کے بعد قانون کا مطالعہ بھی محدود ہو کر رہ جاتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گو مملکت آصفیہ میں نصف صدی کے زیادہ عرصہ سے مجلس عالیہ عدالت قائم ہے اور اس سے مافوق ایک اور اعلیٰ عدالت جوڈیشل کمیٹی کے نام سے موجود ہے لیکن اعلیٰ قانونی ادب وجود میں نہ آسکا۔ قانون پر علمی نقطہ نظر سے بہت ہی کم کتابیں لکھی گئیں جو قانونی ادب موجود بھی ہے وہ محض عدالت کے فیصلوں پر مشتمل ہے۔ کتابیں لکھی بھی گئیں تو بالعموم نظائر، شرح اور خلاصہ کے طور پر۔ ملک میں اب جو قانون رائج ہے اور پہلے جو قانون رائج تھا اسکے تقابل اور تنقید اور نتائج کو جانچنے کی گویا کوئی نوبت ہی نہیں آئی۔ عدالتوں سے جو فیصلے صادر ہوتے ہیں ان کی بھی خالص قانونی اور علمی نقطہ نظر سے کبھی جانچ پڑتال نہیں ہوئی۔ غرض ملک میں اعلیٰ قانونی ادب مہیا کرنے، وکالت اور عدالت کے کاروبار کے معیار کو بلند تر کرنے اور مختلف قوانین کے تقابل اور تنقید کا صحیح ذوق پیدا کرنے کے لئے اس بات کی شدید ضرورت تھی کہ جامعۂ عثمانیہ میں اعلیٰ قانونی تعلیم کا انتظام عمل میں لایا جائے۔ بہت خوشی کی بات ہے کہ ۱۳۵۱ف کے تعلیمی سال کے آغاز سے جامعۂ عثمانیہ میں ال ال ایم ابتدائی کی جماعت مکمل گئی۔ اس کے قیام کیلئے جو جد و جہد کی گئی اسکی مشکلات کا اندازہ مجلہ کا محرر نہیں کرسکتا بہرحال سعی جو مشکور ہوئی وہ قابل مبارکباد ہے، ال ال ایم کے مضامین امتحان اور نصاب میں دوسری جامعات ہند کے مقابل جدت اور عملیت کو پیش نظر رکھا گیا ہے، نیز خانگی اُمیدواروں کیلئے بھی شرکت امتحان کی صورت پیدا کی گئی ہے۔

یونین انجمن طیلسانئین عثمانیہ کی تحریک سے اب ام اے کے امتحان کا دروازہ بھی خانگی اُمیدواروں کیلئے کھل گیا ہے۔

۱۳۴۲ف میں کانفرنس طیلسانئین عثمانیہ نے تحریک کی تھی کہ کتب خانہ آصفیہ کے اوقات مطالعہ میں وسعت دی جائے، تعطیلات کم کی جائیں اور فہرستوں کی عصری نقطہ نظر سے تکمیل کی جائے یہ تحریک بڑی حد تک منظور ہو چکی اور اب ہمیں یہ مسرت حاصل ہے کہ کتب خانہ آصفیہ اب بلا تعطیل تمام ہفتہ کھلا رہتا ہے، اوقات مطالعہ بلا وقفہ صبح کے آٹھ سے شام کے آٹھ تک مقرر ہیں اور یہ کہ سال بھر میں بجائے ۴۱ یوم کے صرف ۹ یوم تعطیل دیجائیگی، جیسے کہ انجمن کی سالانہ رپورٹ بابتہ ۱۳۵۰ف میں ظاہر کیا گیا ہے، یہ ثبوت ہے

اس امر کا کہ کسی ادارہ کا انتظام کسی نوجوان عثمانیہ طیلسانی کے سپرد ہونے سے کیا فوائد حاصل ہوتے ہیں۔

جدیدہ اعلامیہ مورخہ ۲ آبان ۱۳۵۱ف میں مرتبہ دستورالعمل کتب خانہ آصفیہ شایع ہوا ہے یہ توقع بے جا نہیں کہ اس جدید دستورالعمل کے نفاذ سے دکن کے اس عظیم الشان ادارہ کی خوش نظمی اچھے معیار پر پہنچ جائیگی جدید قواعد میں ایک خوش خبری یہ ہے کہ کتب خانہ آصفیہ کے لئے سرکاری محاذنہ میں سالانہ جو رقم کتابوں کی خریدی کیلئے فراہم کی جائیگی وہ عدم خرچ کی صورت میں بحق سرکار بازگشت نہیں ہو جائیگی بلکہ بحق کتب خانہ محفوظ رہیگی۔

جدید قواعد کی رو سے جو مجلس قائم ہوئی ہے اسکو سب سے پہلے اپنی توجہ فہرستوں کی اصلاح اور ترتیب جدید پر مبذول کرنی چاہیئے، فہرستوں کی عصری ترتیب کے بغیر اس عظیم الشان علمی ادارہ کی سودمندی مکمل نہیں ہوسکتی، اس بارے میں مہتمم صاحب کو علحدہ متوجہ کیا جاچکا ہے۔

سرکاری مشاورتی مجالس کے قیام سے مملکت آصفیہ کے دستور اور نظم و نسق میں ایک جدید باب کا اضافہ ہوا ہے۔ کونسل آف اسٹیٹ، کیبنٹ کونسل، مجلس وضع قوانین، اور باب حکومت سب اپنی اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک ایک نئے دستوری پہلو کے حامل تھے۔ آٹھ مشاورتی مجالس سے جو مالیات، امور مذہبی، ترقی صنعت، تعلیم، صحت عامہ، زرعی ترقی، اوقاف مسلمین، اور اوقاف ہنود کے متعلق قائم ہوئی ہیں ایک نئی دستوری ترقی کی ابتدا ہوئی ہے۔

اسی سلسلہ میں "آئین موضع پنچایت" بھی نافذ ہوا ہے۔ اس آئین کا منشا یہ ہے کہ ڈھائی ہزار سے پانچ ہزار تک کی آبادی والے مواضع کے لئے بلدیاتی کاروبار انجام دینے کے لئے مجالس قائم کی جائیں اس آئین کی رو سے قرار دیا گیا ہے جہاں کہیں پنچایت قائم ہو اسکے ارکان کی تعداد اس علاقہ کا اول تعلقدار مقرر کریگا، ارکان کی تعداد ۶ سے کم اور ۱۲ سے زیادہ نہ ہوگی، ارکان کے انتخاب کا طریقہ یہ قرار دیا گیا ہے کہ تحصیلدار اس موضع میں جہاں پنچایت قائم کرنا مقصود ہے موضع کے بالغ مالکان مکان کا ایک کھلا جلسہ منعقد کریگا اور اس جلسہ کے مشورے سے تعلقدار کی مقررکی ہوئی تعداد سے مضاعف تعداد میں پنچایت کے قابل لوگوں کو نامزد کریگا، اس طرح جو لوگ نامزد ہوئے ہوں ان میں سے تعلقدار اپنی مقررکردہ تعداد میں پنچ منتخب کریگا۔

اس سرکاری نوشتہ میں "آئین" کا لفظ غالباً پہلی مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ اس وقت تک منشور، قانونچہ قانون، ضابطہ، دستور العمل، اور قواعد کے الفاظ استعمال ہوتے آرہے ہیں، پہلے سے زیر استعمال الفاظ کے ساتھ ایک نیا لفظ سرکاری نوشتوں کی اصطلاحات میں شامل ہوا ہے۔ اسی طرح "پنچایت" بھی اب ایک جدید غرض کیلئے عمل میں آگئی

پنچایتوں کے اختیار تمیزی پر جو امور منحصر رکھے گئے ہیں ان میں موضع میں پیدا ہونے والے افراد کی ولادت وموت کا اندراج بھی ہے، ضرورت ہے کہ اس قومی اہمیت کے مسئلہ کے بارے میں ہر پنچایت پوری طرح توجہ کرے ملک کے طول وعرض میں اس نوعیت کے انتظام کی سخت ضرورت ہے۔ دوسرے فوائد سے قطع نظر ملازمت کے نقطۂ نظر سے مختلف نوعیت کے جو صداقت نامے سعی وکوشش سے حاصل کرلئے جاتے ہیں ان کا حقیقی اور قطعی سدباب صرف اسی وقت ہوسکیگا جب کہ کل مملکت آصفیہ میں ولادت اور موت کے رجسٹروں کا تشفی بخش انتظام ہوجائے۔

کانفرنس طیلسانئین عثمانیہ نے سرکاری ملازمت کے سلسلہ میں ۵۵ سالہ عمر کی تکمیل کے بعد مزید توسیع کے خلاف ۱۳۵۲ف سے آواز بلند کی، بعد میں انجمن کی کابینہ اور خود کانفرنس نے توجہ دہانی کا تسلسل قائم رکھا۔ مسرت کا مقام ہے کہ سرکار عالی نے اس مسئلہ کی اہمیت محسوس فرمائی اور اب جو احکام صادر فرمائے ہیں اسکی رو سے جس گزیٹیڈ ملازم کی عمر ۵۵ سال کی ہوچکی ہو وہ ملازمت میں نہیں رکھا جاسکیگا بجز اسکے کہ صرف ناقابل تردید وجوہ نظم ونسق کی بنا پر ایسی توسیع ناگزیر ہو اور ملازم سرکار کی صحت جسمانی اچھی ہو نیز یہ کہ شرائط مصرحہ کے تحت اگر کوئی توسیع دیجائے تو اسکی مدت وقت واحد میں ایک سال سے زیادہ نہوگی۔ کانفرنس کی تحریکوں کا مفہوم بالکل یہی تھا۔

فصلی سال نو کا جشن منانے کی تحریک جناب غلام محمد خاں صاحب ایم اے (عثمانیہ) رکن مجلس بلدیہ نے شروع کی تھی، پہلا جشن آج سے چار سال پہلے بڑی دھوم دھام سے منایا گیا بعد میں بھی اس کا سلسلہ بیش وکم جاری رہا سال حال بھی اس کا جلسہ اور عشائیہ منعقد ہوا۔ اور بعض گوشوں سے اختلاف کی صدا بلند ہونے کے باوجود دونوں تقریبیں کامیاب ثابت ہوئیں، نہ صرف سال نو بلکہ جلالت الملک خسرو دکن وبرار کی سالگرہ اور جشن خود مختاری کو شایان شان

طریقہ سے منانے کے لیے مستقل انتظام کی ضرورت ہے۔ اسکے بغیر کوششوں میں تسلسل باقی نہیں رہ سکتا اور بے دلی پیدا ہوجانا لازمی ہے۔

بلدۂ فرخندہ بنیاد کی قدیم ترین درس گاہ دار العلوم کی ۹۰ سالہ سالگرہ اور جشن تاسیس منانا بعض سرگرم اور مخلص فرزندان دار العلوم کے پیش نظر ہے۔ غالباً اس بات کا کم علم ہوگا کہ ۲۰ برس پہلے اس مدرسہ کی ۷۰ سالہ جوبلی منائی گئی تھی۔ مدار المہام وقت نواب سالار جنگ بہادر جو بانی مدرسہ کے پوتے ہیں جلسہ کے صدر تھے یہ جلسہ کچھ اس طرح مبارک ثابت ہوا کہ اسکی آواز بازگشت میں حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کا آوازہ بلند ہوا۔ اُس جلسہ میں حیدرآباد میں یونیورسٹی کے قیام کیلئے بھی ایک مخلصانہ صدا بلند ہوئی کہ۔

"ہمارے ملک میں دار العلوم قائم ہے جسکے امتحانات ہمارے ہی ہاتھ میں ہیں ضرورت ہے کہ ان امتحانات کی بناء مستحکم طور سے قائم ہو یا بالفاظ دیگر نظام یونیورسٹی قائم کی جائے، مشرقی یونیورسٹی قائم ہونے کے لئے حیدرآباد میں کسی قسم کی کوئی دقت نہیں ہے"

اس صدائے اخلاص کو بہت جلد سمع قبول حاصل ہوا اور آج جامعۂ عثمانیہ ملک کے نوجوانوں کی زندگی کا محور بنی ہوئی ہے۔ خدا کرے کہ دار العلوم کی بھی مبارک درس گاہ کی ۹۰ سالہ سالگرہ ملک کے لئے نئی برکتوں نئی امیدوں اور نئی سعادتوں کی ایک سرور بخش اور دل نواز صبح ثابت ہو۔

نواب مرزا یار جنگ بہادر جوڈیشل کمیٹی کے صدر، وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوگئے۔ نواب صاحب موصوف ۱۳۲۰ف میں حیدرآباد آئے اور مجلس عالیہ عدالت کی میر مجلسی پر فائز ہوئے۔ کئی سال اس اہم ترین خدمت کے فرائض انجام دینے کے بعد ان کو حضرت بندگانعالی نے صدر المہام عدالت و امور مذہبی کے عہدۂ جلیلہ پر مامور فرمایا پھر جوڈیشل کمیٹی کی صدارت پر فائز ہوئے۔

ہر چند نواب صاحب کو پہلے سے حیدرآباد سے کوئی تعلق نہیں تھا لیکن آنے کے بعد تھوڑے ہی عرصہ میں اپنے کام، خصائل، اخلاق اور ہمدردی سے ملک کے سب طبقوں میں ہر دل عزیزی حاصل کرلی۔ اپنے بڑے عہدوں کے اہم فرائض بخوبی و بخوش اسلوبی انجام دئے سررشتہ عدالت کی اصلاح و ترقی میں کامیابی حاصل کی انتظامی و عدالتی اختیارات کی علیحدگی کے لئے نواب صاحب نے جو کوشش کی اور اپنی کوشش میں جس طرح کامیابی حاصل کی اسکو

مملکت آصفیہ کے نظم و نسق عدالت کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھا جائیگا۔ اسکے علاوہ نواب صاحب نے مملکت کے تعلیمی اور معاشرتی امور میں بھی گرم جوشی سے حصہ لیا۔ انجمن طیلسانین عثمانیہ سے بھی ابتدا سے ہی ہمدردی برتی اور اسکے کاروبار میں دلچسپی لی بہر حال جو اصحاب باہر سے حیدرآباد میں بڑے عہدوں پر آتے ہیں ان کو نواب مرزا یار جنگ بہادر کی شخصیت اور علمیت اپنے پیش نظر رکھنی چاہیئے۔

چند قابل دید کتابیں

سیر کائنات:۔ یہ کتاب انگلستان کے مشہور سائنس داں جی جینس کی آٹھ تقریروں کا مجموعہ ہے جو موصوف نے رائل انسٹیٹیوٹ لندن میں زمین، ہوا اور چاند ستاروں پر کی تھیں قیمت مجلد عہ۔

سلطنت خداداد:۔ میسور کی نامور سلطنت کے بانی حیدر علی اور اسکے جانشین ٹیپو سلطان کی مکمل تاریخ قیمت للعہ

تاریخ جنوبی ہند:۔ جنوبی ہند کی مکمل تاریخ بڑی چھان بین کی گئی ہے اور داخلی اور خارجی ہر ممکن سند پیش کی گئی ہے قیمت ہے

معلم کی زندگی:۔ یہ مولف کی محض آپ بیتی ہی نہیں بلکہ جامعہ کی دلچسپ اور مکمل تاریخ نیز اکیس سالہ تعلیمی تجربوں کا نچوڑ ہے قیمت ہر دو حصص

محشر خیال:۔ سجاد علی انصاری مرحوم کے مجموعہ مضامین کا دوسرا ایڈیشن۔ اس میں مرحوم کا ہنگامہ خیز ڈرامہ وزرا بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ قیمت مجلد ہے غیر مجلد عہ

مبادی سیاسیات:۔ مصنفہ پروفیسر ہارون خانصاحب شروانی۔ اس میں تفصیل سے علم سیاست کی ابتدائی معلومات اور عہد حاضر کی سیاسی تحریکوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ۶۰۰ صفحات قیمت مجلد صہ

جگ بیتی:۔ پنڈت جواہر لال نہرو کی کتاب (Glimpses of World History) کا اردو ترجمہ قیمت جلد اول ہے

روح اقبال:۔ یہ کتاب ڈاکٹر یوسف حسین خانصاحب کے تین مقالوں اقبال اور آرٹ، اقبال کے فلسفہ تمدن اقبال کے مذہبی اور مابعد الطبعی تصورات پر مشتمل ہے۔ قیمت غیر مجلد ہے۔

ذکر حسین:۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خانصاحب پرنسپل جامعہ ملیہ اسلامیہ کی "ذکر حسینی" کے موقعہ پر معرکہ آرا تقریر جسے پبلک کے مطالبہ پر کتابی شکل میں شائع کیا گیا۔ قیمت ۳

مکتبہ جامعہ دہلی ۔ نئی دہلی، لکھنؤ، بمبئی

سواحلِ ہندوستان پر مسلمانوں کا توطن

از مولانا محمد مرتضیٰ مرحوم

پیش لفظ

از جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب استاذ قانون جامعۂ عثمانیہ

مولوی مرتضیٰ مرحوم کی مجسمۂ علم و عمل شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ انہیں اپنے علمی مشاغل میں تاریخ تمدن سے بڑی دلچسپی تھی۔ "سواحل ہندوستان پر مسلمانوں کا توطن" نہ معلوم کتنے عرصے سے ان کی توجہ منعطف کئے ہوئے تھا بہر حال جہاں تک مجھے علم ہے، اس کی ایک قسط کو انہوں نے ماہنامہ صحیفہ (حیدرآباد دکن) میں جمادی الاول ۱۳۲۵ھ/۱۹۰۷ء میں — یعنی راقم الحروف کی پیدائش سے بھی پہلے — شائع کرایا تھا اور کئی سال تک یہ سلسلہ جاری رہا بعد میں ان مضامین کو از سر نو مرتب کیا چنانچہ مرحوم کا جو قلمی مسودہ اس وقت میرے سامنے ہے اس کا مطبوعہ مضمون سے مقابلہ کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ مسودہ اصل میں گویا مطبوعہ مقالوں کا دوسرا اڈیشن ہے اور جابجا اس میں اضافے عمل میں لائے گئے ہیں۔

یہ ایک قیمتی دستاویز ہے جسے بعینہ شائع کرنا ہی مناسب خیال کیا گیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ گذشتہ چند ایک سال میں عرب اور ہند کے تعلقات پر کافی وسیع لٹریچر پیدا ہو گیا ہے۔ خود اردو میں مولانا سید سلیمان ندوی کی تالیفیں ارض القرآن (سنہ ؟)، عرب و ہند کے تعلقات (سنہ ۱۹۳۰ء) اور عربوں کی جہاز رانی (سنہ ۱۹۳۵ء) کافی معلومات کی حامل ہیں۔ پانکر کی انگریزی تالیفیں ملیبار کے متعلق کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتیں۔ ہائڈ کی جرمن تالیف کے فرانسیسی اڈیشن "مشرقی تجارت کی تاریخ" میں جو بھی ہمارے موضوع کے متعلق ہے وہ اپنے مولف کی عظیم اہمیت کے باعث قابل ذکر ہے۔ زین الدین المعبری کی عربی تاریخ ملیبار (تحفۃ المجاہدین) سے مرحوم واقف تھے اور اس کا بھی ذکر کیا ہے کہ اس کا نسخہ ان کی نانی کے بھائی کے ہاں موجود ہے[1] مگر نہ معلوم کیا اتفاقات

---

[1] قاضی عبید اللہ مرحوم کے اسی نسخہ سے جو بڑا نفیس اور صحیح ہے، حکیم شمس اللہ قادری صاحب نے یہ کتاب ۱۹۳۱ء میں شائع کی تھی۔ غیر عربی داں پروفیسروں نے اس کی مٹی پلید کر دی ہے۔ اس کا ۱۸۹۸ء میں لزبن میں پرتگالی ترجمے کے ساتھ جو عربی متن چھپا ہے، وہ ہمارے پیش نظر ہے۔

پیش آے کہ اس سے اس مضمون کے چھپنے تک راست استفادہ نہ کیا اور تاریخ فرشتہ پر تکیہ کر لیا جس میں تحفۃ المجاہدین ہی سے ملیبار کے حالات اخذ کئے گئے ہیں۔ تاریخ فرشتہ کے مولف کو عربی زیادہ نہیں آتی تھی چنانچہ زیرِ ذکر اقتباسات میں کئی جگہ تحفۃ المجاہدین کا ترجمہ اس قدر غلط کیا گیا ہے کہ مطلب اُلٹ گیا ہے۔

چند اور فرانسیسی اور جرمن کتابوں یا مضمونوں کا مجھے علم ہے جن سے اس موقع پر استفادہ ضروری تھا لیکن موجودہ ناتسی ملحمۂ کبریٰ نے فی الحال ان کے منگوانے کے راستے بند کر رکھے ہیں۔ مرحوم نے تمدّن عرب مترجمۂ سید علی بلگرامی سے پورا استفادہ کیا ہے لیکن نُبوں کی۔ (جو اُردو میں لی بان بن گیا ہے)۔ اصلی فرانسیسی تالیف سنہ ۱۸۸۴ء میں چھپی تھی۔ میں نے ایک زمانے میں اصل اور ترجمے کا مقابلہ کرنا شروع کیا تھا اور کافی نظرثانی اور تصحیح کی ضرورت محسوس ہوئی تھی البتہ جو دو ایک اقتباس مرحوم نے دیئے ہیں انکی حد تک اب مکرّر اطمینان کر لیا گیا ہے کہ ان میں اصلی فرانسیسی کا مفہوم بدل نہیں گیا ہے۔ ملیبار فخر کر سکتا ہے کہ اس نے ایک امیر البحر خانوادہ کنج علی مرکار پیدا کیا جو کئی پشت تک ہند کے مغربی ساحل کا واحد محافظ بنا رہا۔ اسکے حالات اور کارگزاریاں تلاش بھی چاہتی ہیں اور تفصیل بھی اور ان کا ذکر مختصر حواشی میں نہ ممکن تھا اور نہ مناسب۔

میرے پیش نظر ملیالم زبان میں "ملبار چرترم اتام کھنڈم" ملیبار کی ایک اسلامی تاریخ مولفہ ابراہیم الملوی الملیباری کا حصّہ اوّل ہے۔ کہیں کہیں سے جو سمجھ میں آسکا یہ رسالہ بہت دلچسپ معلوم ہوا لیکن کسی ملیالم جاننے والے کی مدد سے اس کو پوری طرح سمجھے بغیر اس کا کوئی حوالہ دینا مناسب نہ ہوگا اور فی الحال یہ ممکن نہیں ہے۔

مجھے ہمت نہیں ہوتی تھی کہ مرحوم کے مقالے پر کچھ حواشی لکھنے کی ذمہ داری لوں۔ اسکے لئے طویل مطالعے کی ضرورت ہے لیکن مرحوم کے فرزند مولوی محمد غوث صاحب کا اصرار ہے کہ میں ہی اسے انجام دوں اور وہ بھی جلد۔ مجبوراً مذکورہ بالا اور بعض دیگر کتابوں کی مدد سے، جن کا اپنی اپنی جگہ حوالہ مل جائیگا، چند تعلیقات سپردِ قرطاس کئے جاتے ہیں[۱]۔ قدرت کو منظور نہ تھا کہ مرحوم خود اپنے مضمون کی اس وقت نظرثانی کر سکتے۔ اب جہدِ المقل کے سوا کیا چارہ ہے۔ (اصل مضمون اگلے صفحے سے شروع ہے مجلہ)

---

[۱] یہ تعلیقات اصل مضمون کے آخر ضمیمے کے طور پر شامل کئے گئے ہیں متن میں اعداد کے اندر جو نشانات ہیں وہ تعلیق کی رہبری کرتے ہیں۔

عربوں اور ہندوؤں کے قدیم تعلقات

جدید تحقیقات نے یہاں تک پہنچا دیا ہے کہ "عربوں کے تعلقات ہندوؤں کے ساتھ ابتدا از زمانہ تاریخی سے شروع ہوئے ہیں لیکن کل واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ قبل زمانۂ اسلام وہ ہندوستان ہی کے لوگ تھے جو اپنے ملک کی پیداوار کو سواحل عرب تک لاتے تھے نہ یہ کہ عرب تاجر اُن کی تلاش میں ہندوستان جاتے تھے۔ اور جس وقت یمن کی بندرگاہوں سے ہندوستان کو جہاز جانے لگے وہ زمانہ آنحضرت علیہ السلام کی بعثت سے بہت قریب تھا" (۱) (تمدن عرب صفحہ ۵۰۳) ان تعلقات کی تصدیق فرشتہ سے اس طرح ہوتی ہے:۔

"از عہد آدم علیہ السلام تا آں زماں (یعنی زمان فتح سندھ) از جزیرہ سرندیپ از راہ دریا کشتی ہا بمکہ و دیار عرب متردد بودند و براہمۂ ہندوستان پیش از ظہور اسلام جہت زیارت خانۂ کعبہ و پرستش اصنام آنجا بمکہ و دیار عرب متردد بودند" (تاریخ فرشتہ جلد دوم ذکر سندھ)

آدم علیہ السلام کے ہند یا سرندیپ میں ہبوط کی تاریخی روایت گویا ان تعلقات کی مشہور یادگار دستاویز ہے۔ (الف)۔

یہودیوں اور مسیحیوں کی آمد ہندوستان میں

قبل اسکے کہ فرنگستان کے مسیحی ساحل ہند پر اپنا قدم جمائیں، صدیوں پہلے ایشیا کے یہودی اور مسیحی ہندوستان میں اسی بحری راستے سے پہنچ چکے تھے جس کی تصدیق تحفۃ المجاہدین سے اس طرح ہوتی ہے:۔

"پیش از ظہور اسلام و بعد از ظہور اسلام طائفۂ یہودی و نصاریٰ برسم تجارت از راہ دریا بداں دیار آمد و شد می کردند و در آخر الامر میان ملیبار یان ایشان بواسطۂ منافع دنیوی الفتے بہم رسید بعضے از بازرگان یہود و نصاریٰ در شہر ہائے ملیبار ساکن شدہ منازل و بساتین ساختند" (ب)

(الف) سبحۃ المرجان میں آزاد بلگرامی نے اسبارہ میں تاریخی روایات جمع کئے ہیں۔ تمام مورخین کا ماخذ امام طبری کی تاریخ ہے جلد اول طبع یورپ صفحہ ۱۲۔

(ب) یہودی چین میں بھی نہایت قدیم زمانہ سے آباد تھے (دعوت اسلام آرنلڈ) اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اسی راستہ چین گئے۔

(تحفۃ المجاہدین سے فرشتہ نے فارسی ترجمہ کیا ہے۔ (۲) اصل تحفۃ المجاہدین کا نسخہ شمس العلماء مولوی قاضی عبداللہ صاحب کے پاس موجود ہے)۔ اسوقت بھی کوچین و ترانکور میں یہ پرانے عیسائی بکثرت موجود ہیں اپنے کو سوریانی چرچ کا متبع بیان کرتے ہیں۔ کسی اور مقام پر اتنے عیسائی نہیں ہیں۔ پانچویں صدی عیسوی میں نسطوری فرقے نے ہندوستان میں نصرانیت کی اشاعت کی تھی (ج)۔ ان قوموں کے فرسودہ آثار مختلف بلاد سواحل میں اب بھی موجود ہیں جن میں سب سے زیادہ اہم سینٹ توما (تہامس) کا مقبرہ واقع میلاپور (مدراس) ہے۔

سینٹ توما

مختصر تاریخ کنیسۃ المسیح میں (جسکا حوالہ اوپر دیا گیا ہے) لکھا ہے "نیقوفورس نے بیان کیا ہے کہ یہ مبشر اخیر میں ہندوستان گیا۔ یہاں کے باشندوں نے پرتگیزوں سے بیان کیا کہ مبشر مذکور سب کے اخیر میلاپور دارالحکومت کورومنڈل میں آیا اور بہت سے لوگ اس کی تلقین سے ایمان لے آئے حتی کہ یہاں کا فرماں روا ساگاموس نامی بھی ہدایت پایا اور اب اس نے کنیسہ (چرچ) بنانا چاہا۔ برہمن لوگ اس سے غصہ میں آگئے۔ اور موقع تاک کر ایسے وقت جبکہ وہ تنہا نماز پڑھ رہا تھا اسکو گھیر لیا اور نیزہ سے مار ڈالا" (صفحہ ۱۸)۔

فی الحال یہ مقبرہ رومن کیتھلک فرقہ کے قبضہ میں ہے عربی دائرۃ المعارف میں بھی جس کا مولف شام کا عیسائی ہے سینٹ تھامس کا مختصر تذکرہ ہے (صفحہ ۲۷۔ جلد ۶) جس میں وہ یہ بھی لکھتا ہے "بعض نصرانیوں کے پاس سینٹ تھامس کے واقعات ہند فرقہ مانویہ (ح) کے اختراع ہیں۔ ہندوستان کا سینٹ تھامس مانی کا شاگرد تھا"

ج۔ مختصر تاریخ کنیسۃ المسیح زبان عربی طبع یورپ صفحہ ۱۰۶ مطبوعہ ۱۸۳۹ء۔ یہ کتاب کتب خانہ جناب قاضی الملک بدرالدولہ مرحوم کے صندوق متعلقہ کتب عیسائیاں میں موجود ہے۔ پروفیسر آرنلڈ نے بھی نسطوریوں کے متعلق لکھا ہے کہ انہوں نے اسلام کے زمانہ میں مسیحی مشن کے کاموں کو بھی بڑی دھوم دھام سے بیرونی ممالک میں جاری کیا چین اور ہندوستان کو اپنے مشنری روانہ کئے (دعوت اسلام صفحہ ۸۲)

ح۔ مانی نے مجوسی و نصرانی مذہب کو ملا کر ایک نیا مذہب پیدا کیا تھا شہرستانی کی ملل والنحل جلد اول صفحہ ۱۴۳۔ رسایل شبلی صفحہ ۲۲۵۔

نسطوریہ فرقہ کا مرکز بھی ایران تھا (دعوت اسلام صفحہ ۸۲) اور اسی بنا پر گویا نسطوریوں کی کوشش ان کی طرف منسوب کی گئی ہے لیکن حسب بیان مختصر تاریخ کنیسہ نسطوریوں کی دوبارہ کوشش کی بنا پر سینٹ تھامس کے پہلی صدی عیسوی میں ہندوستان آنے کی تردید نہیں کیجا سکتی۔ مشہور فرنگستانی سیاح مارکو پولو جس نے تیرھویں صدی عیسوی میں (مطابق ساتویں صدی ہجری) ہندوستان کی بھی سیاحت کی تھی سینٹ تھامس کے مقبرہ کا ذکر اسطرح کرتا ہے "صوبہ معبر (کارومنڈل) میں سینٹ تھامس کا مزار ہے۔ یہ مزار میلاپور میں واقع ہے۔ وہاں تاجر کم جاتے ہیں کیونکہ تجارت کی کوئی چیز نہیں ملتی عیسائی اور مسلمان دونو اس قبر کی زیارت کرتے ہیں مسلمان بھی سینٹ تھامس کو ایک ولی مانتے ہیں وہ اسے حواری کے لقب سے یاد کرتے ہیں" (مارکو پولو سفرنامہ ترجمہ اردو مطبوعہ مشن پنجاب ریلجیس بک سوسائٹی صفحہ ۱۵۳) یہ مسیحیوں کا بیان ہے۔ ابن اسحق نے حواریوں میں توماس کا نام لکھا ہے اور بتایا ہے کہ وہ بابل بھیجا گیا[ھ] مابعد اسلامی مورخین مثلاً طبری[ق] کا ماخذ ابن اسحق ہے۔ ابن اسحق کا ماخذ نصرانیوں کی ہی روایتیں ہیں کیونکہ ظاہر ہے کہ ماقبل زمانۂ اسلام کے حالات کی نسبت بجز غیر مسلموں کی نقل کے اور کوئی ذریعہ تاریخی نہیں ہو سکتا۔ بہر حال اسلامی اصول کے لحاظ سے توما حواری کے ہندوستان میں آنے کی نفی نہیں کیجا سکتی۔

مسلمانوں کی آمد ساحل ہندوستان میں

جب حضرت خاتم النبیین علیہ السلام کی ہدایت سے فیض یاب ہو کر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی حواریان حضرت مسیح علیہ السلام کی بشارت کی طرح دعوت اسلام کیلئے اپنی زندگی وقف کردی تو یہ امر کسی طرح مستبعد نہیں ہوسکتا کہ ساحل ہندوستان بھی ان کے آثار سے محروم نہ رہا۔ چنانچہ حضرت تمیم انصاری کا مزار بمقام کولم (۳) جو ساحل مدراس سے جانب جنوب (۱۲) میل کے فاصلہ پر واقع ہے جسکی زیارت سے میں بھی متعدد دفعہ مشرف ہو چکا ہوں اور حضرت عکاشہ رضی اللہ عنہ کا مزار بمقام محمود بندر[ح] اس کے ثبوت میں

ھ۔ سیرۃ ابن اسحاق بروایت ابن ہشام طبع یورپ صفحہ ۹۷۱۔ ق۔ جلد دوم صفحہ ۷۳۸ ہ۔ ن۔ ابن اسحاق کی نسبت مسلم ہے کہ یہود و نصاریٰ سے بھی اخذ کرتا تھا۔ علامہ ابن الندیم کی کتاب الفہرست۔ ح۔ مدراس کے جانب جنوب ساحل کارومنڈل پر واقع ہے۔

موجود ہے۔ چونکہ چین کے بندر گیانٹین (۴) میں حضرت وہب رضی اللہ عنہ کا مزار گویا تواتر سے ثابت ہے تو پھر ساحل کارومنڈل میں ان کے وجود سے انکار نہیں ہوسکتا۔ اور ان متبرک ناموں کی شہرت خود ایک قوی ثبوت ہے۔ یہ تو مسلم تاریخی واقعہ ہے کہ مسلمان سواحل ہند پر اپنی حکومت قائم ہوتے ہی پہنچ گئے لی بان لکھتا ہے کہ اپنی حکومت قائم ہوجانے کے ساتھ ہی عربوں نے تعلقات تجارتی کو بہت بڑی وسعت اور ترقی دی۔ وہ بہت جلد ساحل کارومنڈل۔ ملابار۔ سوماٹرا۔ جزائر بحر ہند کو طے کرتے ہوئے جنوب چین تک پہنچ گئے (تمدن عرب صفحہ ۵۰۳) (۵) موجودہ عربی تاریخوں میں انکا ذکر نہ ہونے سے ان کی نفی نہیں کی جاسکتی۔ قبل اسکے کہ ہم روایات سماعی قلمبند کریں عربوں کی بحری تاریخ کے متعلق کتابی مواد جو دستیاب ہوا قلمبند کرینگے۔ اس قسم کی تاریخیں جن میں عربوں کے بحری کارنامے بتلائے گئے ہوں اگرچہ عربوں نے بہت کچھ لکھی تھیں لیکن ہندوستان میں وہ مفقود ہیں۔

مسلمانوں کی بحری اور تجارتی حالت

اس سلسلہ میں صرف ایک کتاب کتب خانہ آصفیہ میں ہماری نظر سے گذری جس کا نام "عجائب الہند برہ وبحرہ" جو ایک ایرانی النسل مسلمان جہاز ران" بزرگ بن شہریار ناخدا رام ہرمزی" کی تصنیف ہے اور یورپ کے علمی شغف کی بدولت ۸۱-۱۸۸۶ء میں پروفیسر فان ڈرلائٹ کے ضروری تحشیہ اور فرنچ ترجمہ کے ساتھ نہایت اہتمام سے بمقام لیڈ چھاپی گئی ہے۔ سنہ کتابت ۱۸۲۵ء درج ہے معلوم ہوتا ہے کہ دیگر نامور گذشتہ قوموں کی طرح عربوں میں بھی اس وقت ہندوستان عجائب کا گھر شمار کیا جاتا تھا اور راسی ادبی ذوق رکھنے والے جہاز ران نے اپنی بحری سیاحتوں میں سُنے ہوئے عجائبات کا تحفہ متمدن عربوں کی خدمت میں پیش کیا ہے اور اپنے موضوع کے لحاظ سے بجائے عام تمدنی حالت کے جو آج عجائبات سے زیادہ قابل تحقیقات شمار کی جاتی ہے غیر معمولی واقعات اس رنگ میں پیش کرنا زیادہ مناسب خیال کرتا ہے جس سے سند باد جہازی کے سے قصوں کا لطف آئے۔ فی الواقع ایک جہاز ران سے اس تحقیق کی امید کس طرح کیجاسکتی ہے جو ابوریحان بیرونی جیسے محقق کے شایان ہو لیکن بہر کیف اس کتاب سے ضمناً عربوں کے ہندوستان کے ساتھ تجارتی و بحری تعلقات کی تاریخ پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔ اس کتاب سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسوقت عربی جہاز رانی اور تجارت کسقدر باعث عظمت تھی۔ بہت سے عرب ناخداؤں کے

کارنامے معلوم ہوتے ہیں جنہوں نے اس زمانہ میں کمال فن اور نہایت شہرت و ناموری حاصل کی تھی محمد بن بابشاد ایک جہازران اور عبہرہ نامی ایک دوسرے جہازران کے حالات معلوم ہوتے ہیں جس نے چین تک جہازرانی کو ترقی دی تھی۔ بحر ہند و چین و ہندوستان کے متعدد شہر و جزائر مثلاً انڈمان وغیرہ کے حالات بھی اس کتاب سے دریافت ہوتے ہیں۔ غرض اسلامی جہازرانی کی ترقی کی تاریخ اس کتاب سے نہایت عمدہ طور سے واضح ہوتی ہے ان آفات و مصائب کے حالات بھی معلوم ہوتے ہیں جو اس وقت کے غیر دخانی جہازوں کو پیش آیا کرتے تھے چنانچہ سنہ ۳۱۳ھ میں تین بڑے جہازوں کی تباہی کا حال لکھا ہے جن میں (۱۲) سو آدمی سوار تھے اور جو سیراف (عرب کے اُس زمانہ کے مشہور بندرگاہ سے ساحل ہند پر آرہے تھے) کنارے کے قریب پہونچکر سمندر میں طوفان کی وجہ سے باستثناء (۳۳) آدمیوں کے جو ایک کشتی میں سوار ہو کر ساحل سے آلگے سب کے سب غرقاب فنا ہوگئے۔ اس کتاب سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کس انداز سے امن و امان کے ساتھ جہازوں کے ذریعہ سے اسلام کا اثر پھیلا کرتا تھا چنانچہ متعدد نومسلموں کے حالات لکھے ہیں۔

سب سے زیادہ اہم تاریخی واقعہ جزیرۂ سیلون کی سفارت کا حضرت ختم المرسلین علیہ السلام کی نبوت دریافت کرنے کیلئے جانا ہے۔ سراندیپ کے جوگیوں میں سے ایک فرقہ بیکور نامی کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ مسلمانوں کو چاہتے ہیں اور ان کی طرف بہت میلان رکھتے ہیں۔ تحفۃ المجاہدین میں جس کا ذکر آئندہ آتا ہے ملیبار میں اسلام پھیلنے کا زمانہ تیسری صدی ہجری قرار دیکر اس روایت کو غیر صحیح قرار دیا ہے جس میں حضرت ختم المرسلین علیہ السلام کے زمانہ میں ہی راجہ ملیبار کے اسلام لانے کا بیان ہے۔

ملیبار اور سیلون کی تاریخ ایک حد تک ملی جلی ہوئی ہے (ملاحظہ ہو عجائب الاسفار ترجمہ سفرنامہ ابن بطوطہ جس میں پیرزادہ مولوی محمد حسین ایم اے نے نہایت تحقیقات کی ہے) اور ایک عرصہ تک ملیباری راجہ ہی سیلون پر حکمران ہو گئے تھے۔ چنانچہ پہلی صدی ہجری میں ملیباری راجہ بھی سیلون میں حکمران تھے بس جو روایت اِس جہازران نے اہل سیلون سے سُنکر بیان کی ہے وہ مصنف تحفۃ المجاہدین کے زمانہ میں سات سو برس کے امتداد سے مالک بن دینار کے واقعہ سے مل کر مخلوط ہو گئی ہے معلوم ہوتا ہے کہ دراصل وہ الگ الگ واقعات ہیں اور جس طرح مالک بن دینار کا واقعہ (جس کا ذکر آئندہ آئیگا) بجائے خود بالکل ثابت ہے اسی طرح کوئی وجہ نہیں کہ اس سیلونی یا ملیباری سفارت کے واقعہ کو

جو مالک بن دینار کے واقعہ سے علیحدہ ہے صحیح نہ تسلیم کیا جائے جبکہ سواحل ہند پر آثار صحابہ کرام تواتر سے ثابت ہیں۔

راجہ سیلون کا اسلام لانا پروفیسر آرنلڈ نے اگرچہ سیلون کے متعلق لکھا ہے کہ "معلوم ہوتا ہے کہ سیلون میں تبلیغ اسلام کیلئے زیادہ عملی کوشش صرف نہیں کی گئی" لیکن مجمع الجزائر ملایا کے بیان میں وہ لکھتے ہیں "دوسری صدی ہجری میں جزیرۂ سیلون کی تجارت عربوں کے ہاتھ میں تھی" (صفحہ ۳۸۱) پس جبکہ عربی تاجروں نے سیلون میں ایسا طاقتور اثر قائم کر لیا تھا تو ضرور یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ دعوت اسلام کی کوشش ضرور ہوئی ہو گی چنانچہ فرشتہ نے سندھ کے بیان میں عربوں اور ہندوؤں کے پرانے تعلقات ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے:۔

"ہر آئینہ حاکم سراندیپ پیشتر از رایان دیگر مواضع ہندوستان بر حقیقت اسلام مطلع شدہ در عہد صحابۂ کرام مقلد قلادۂ شریعت مصطفوی گردیدہ بود چوں بسلاطین اسلام اعتقاد فراوان داشت از دریا کشتی مملو از تحف و ہدایا جہت ولید روانۂ دار الخلافہ ساخت"

فرشتہ نے یہ روایت سندھ کی قدیم تاریخوں سے اخذ کی ہے اور ان کے غیر صحیح قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔ بلاذری نے اس واقعہ کو تو لکھا ہے لیکن راجہ کا مسلمان ہونا نہیں لکھتا۔

سواحل ہند پر مسلمانوں کی نو آبادی پہلی صدی میں

مابعد مصنفین مثل مصنف تحفۃ المجاہدین اور ابن بطوطہ نے سواحل ہند پر اسلامی آبادی کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اور جس کا ذکر آئندہ آئیگا اسکی تصدیق اور ابتدائی حالات اس کتاب عجائب الہند سے معلوم ہوتے ہیں سواحل ہند خصوصاً ساحل بمبئی و سندھ کے شہروں میں بکثرت مسلمان تاجروں کے توطن کا حال معلوم ہوتا ہے۔ مصنف نے تصریح کی ہے کہ ہندو راجا مسلمانوں کے ساتھ لطف و مہربانی سے پیش آتے تھے اور درباری مراسم وغیرہ کی پابندی سے ان کو معاف رکھا گیا تھا۔ مسلمانوں کی اندرونی حکومت ان ہی کے قاضی وغیرہ کیا کرتے تھے۔ کولم مالی میں ناگ سانپ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ وہاں ایک مسلمان شخص موجود ہے جسکو ہندی میں بنجی بولتے ہیں یہ شخص پابند صلوۃ ہے اور ناگ کے کاٹے ہوئے پر کچھ پڑھکے پھونکتا ہے اگر زہر پوری طور سے سرایت نہ کر گیا ہو تو اس کا پڑھنا اثر کرتا ہے۔ ہندو منتر پڑھنے والوں کا بھی ذکر کر کے لکھا ہے کہ بہ نسبت ان کے اس مسلمان شخص سے

پڑھنے میں تاثیر زیادہ ہے۔ ملیبار کوارٹرلی ریویو (۷) کے کسی نمبر میں ملیبار کے ماپلے مسلمانوں کی نسبت ایک مضمون چھاپا گیا تھا۔ جو نئی بات اس مضمون سے معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ "کوینڈی کے قریب ایک پتھر پر کندہ ہے کہ علی بن عبدالرحمٰن نے اس جہان فانی کو چھوڑ کر عالم بقا کو سدھارا ۱۶۶ھ" بہر حال یہ تاریخی طور سے ثابت ہے کہ مسلمان پہلی دوسری صدی میں ہی سواحل ہند پر آباد تھے۔ (۸)

سواحل ہند پر اسلامی آبادی کا دوسرا دور

مسلمانوں کے تجارتی اثر کے ساتھ ان کا معاشرتی اثر بھی دن بدن بڑھتا گیا اور تیسری صدی کے بعد داعیانِ اسلام کی کوششیں سواحل ہند پر پوری طور سے بار آور ہوئیں۔ یہ دوسرا دور مالک بن دینار مشہور داعی اسلام کے ہندوستان میں آنے کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ "تحفۃ المجاہدین فی اخبار البرتکالیین" کی ہی وہ کتاب ہے جس کی بدولت اس دعوت کا حال محفوظ رہا۔ یہ رسالہ مع ترجمہ انگریزی میں بھی طبع ہوا ہے اور اسی سے پروفیسر آرنلڈ نے بھی انتخاب کیا ہے۔ اس کا قلمی نسخہ جناب شمس العلما قاضی عبیداللہ صاحب کے پاس موجود ہے اور اس رسالہ کے مطالعہ کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک خلاصہ اس رسالہ کے متعلق لکھا جائے جس سے اسکی وقعت، اس کے اغراض تصنیف اور اعتبار روایت پوری طرح ظاہر ہو اور اس ضمن میں ساحلی تاریخ بھی ساتھ ساتھ معلوم ہوتی جائے۔ اس رسالہ کے مصنف شیخ زین الدین مشہور شافعی فقیہ ابن حجر مکی کے شاگرد ہیں جو ملیبار میں آکر متوطن ہو گئے تھے اور بہت سی فقہی کتابیں بھی ان کی یادگار موجود ہیں۔ اس نامور فقیہ نے اس تاریخی تصنیف سے ثابت کر دیا ہے کہ فقہا جب تاریخ پر توجہ کریں تو وہ اسکو کس اعلیٰ پیمانہ پر لکھ سکتے ہیں۔ رسالہ کے پڑھنے سے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ مصنف ضرور کوئی عالم ہے جس کا دل اپنی قوم کی بگڑی ہوئی حالت دیکھ کر بے تاب ہو جاتا ہے، اس عالم میں یہ رسالہ لکھ کر علی عادل شاہ کے نام پر معنون کرتا اور اسکو مسلمانان ملیبار کی اسوقت کی بگڑی ہوئی حالت پر توجہ دلاتا ہے۔

دیباچہ میں اس نے صراحتاً بیان کیا ہے کہ اللہ نے اہل ملیبار کو دین اسلام بطیب و رغبت قبول کرنے سے اکرام بخشا نہ کہ خوف و بربادی کے ذریعہ سے یہ اس طور سے ہوا کہ مسلمانوں کی ایک جماعت ملیبار کے بندرگاہوں میں آئی اور یہاں اپنا وطن بنایا۔ یہاں کے باشندے روز بروز اللہ کے دین میں داخل ہوتے گئے اور

اس طرح اسلام کو پورا عروج ہوا تا آنکہ مسلمانوں کی کثرت ہوئی اور ان سے اس سرزمین کے شہر بس گئے۔ بوجہ اس کے کہ ہندو راجا ظلم نہیں کرتے تھے نہ اپنے رسوم قدیم سے تجاوز کرتے تھے۔ اس کے بعد پرتگال والوں کا غلبہ ہوا اور ان کے ظلم و ستم کی وجہ سے مسلمانوں کی حالت نہایت خراب ہوگئی۔ بلحاظ ضعف بے زوری ذلت کے جو مصیبت مسلمانوں پر نازل ہوئی اس کے دور کرنے کیلئے باوجود طاقت و شوکت کے مسلمان بادشاہوں میں سے کسی نے توجہ نہ کی۔ اس رسالہ کو میں ان کی ترغیب کے لئے لکھتا ہوں کیونکہ اہل پرتگال نے بہت سے مسلمانوں کو قید کیا بہتوں کو مار ڈالا اور ایک جماعت کو مرتد کرکے نصرانی بنا لیا۔ بہت سی مسلمان عورتوں کو گرفتار کرلیا جس سے نصرانی اولاد پیدا ہوئی جو مسلمانوں سے ہی لڑتے اور ان کو اذیت دیتے ہیں

اس رسالہ کے چار حصے ہیں۔ دوسرے حصہ میں ملیبار میں اشاعت اسلام کی تاریخ قلمبند کی ہے۔

اس تاریخ اشاعت اسلام کو بحذف زواید مختصر طور سے اس طرح قلمبند کیا جاسکتا ہے کہ مسلمان زائرین کی ایک جماعت قلۂ آدم کی زیارت کیلئے سیلون جارہی تھی۔ راستہ میں کرانگانور میں یہ لوگ اُتر پڑے۔ وہاں کے راجہ چیرامن پیرومل (حسب بیان عجائب الاسفار) نے ان کے ساتھ عمدہ اخلاق کا برتاؤ کیا۔ قافلہ سالار نے حضرت علیہ السلام کے حالات راجہ کے سامنے بیان کئے اور اسلام کی حقیقت اسکو بتائی۔ تائید میں معجزۂ شق القمر پیش کیا۔ راجہ مسلمان ہوا اور ملک کی تقسیم کردینے کے بعد ان کے ساتھ پوشیدہ طور سے حجاز میں گیا اور وہیں اس کا انتقال ہوگیا۔ مرتے وقت اس نے اپنے رفیقوں کو وصیت کی کہ ملیبار میں تبلیغ اسلام کا جو مصمم قصد تھا اسکو تجارت و سیاحت کے وسیلہ سے پورا کیا جائے اور اس کام میں مدد کے لئے راجہ نے سفارش کا خط نائب ملیبار کے نام لکھا یہ جماعت جس میں شرف بن مالک۔ مالک بن دینار، مالک بن حبیب سر برآوردہ تھے ملیبار میں آئی اور راجہ کا خط اس کے نائب کے سامنے پیش کیا جس نے ان کے ساتھ عمدہ برتاؤ کیا اور جہاں چاہیں توطن اور مسجد و مکانات و باغات تیار کرنے کی اجازت بخشی چنانچہ کرانگانور میں یہ جماعت مقیم ہوئی اور پھر اس کے بعد مالک نے کل ساحل ملیبار کا دورہ کیا اور مسجدیں تعمیر کیں۔

پروفیسر آرنلڈ نے اس روایت کی نسبت یہ ریمارک کیا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ تاریخی حیثیت سے مستند ہو یا غیر مستند ہمارے خیال میں گو زواید روایت پورے طور سے صحیح نہ ہوں لیکن مالک بن دینار کے

اسلام کی دعوت کرنے اور راجہ کے اسلام قبول کرنے کے اصل واقعات کو تسلیم نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے جبکہ مقامی روایتوں سے اسکی پوری شہادت ملتی ہے مثلاً سنکلر (جسکی تاریخ مدراس یونیورسٹی کے کورس میں داخل ہے) گویا انہی مقامی روایتوں کی بناء پر لکھتا ہے کہ ملیبار نویں صدی (مطابق تیسری صدی ہجری) تک کرپلا کے ماتحت رہا لیکن وہاں کا راجہ دین محمدی قبول کرنے کی وجہ سے لوگوں نے بغاوت کی سلطنت متفرق حصوں میں جدا ہوگئی لیکن اسکا جزو اعظم کلی کوٹ کے راجہ زامورن (سامری) کے ماتحت تھا۔ط

ملیبار کوارٹرلی ریویو کے اس مضمون میں جس کا ہم نے اوپر حوالہ دیا ہے لکھا ہے کہ چیرامن پیرول نو مسلم راجہ ملیبار (جس کی قبر شحر یا ظفار میں ہونا تحفۃ المجاہدین میں منقول ہے) کے متعلق مسٹر لوگن نے ایک عرب سے سُنا ہے کہ اسی راجہ کی قبر ظفار میں ہے اور اس کے سنگ مزار پر کندہ ہے تاریخ ورود ظفار (۹) سنہ ۲۱۲ھ وفات سنہ ۲۱۶ھ نام عبدالرحمن سامری۔ ان سماعی شہادتوں سے قطع نظر سب سے زبردست شہادت وہ مسجدیں دے رہی ہیں: جن کی تعمیر حسب بیان تحفۃ المجاہدین مالک بن دینار نے کی تھی اور جو آج کے دن بھی دعوت اسلام کی اس قدیم روایت کی تصدیق اپنے زبان حال سے کر رہی ہیں۔ جن جن مقامات میں یہ مسجدیں بنائی گئیں انکی فہرست یہ ہے

نشان شمار	نام مندرجہ تحفۃ المجاہدین	نام موجودہ حسب تحقیق عجائب الاسفار
(۱)	کدنگلور	کرانکانور
(۲)	کولم یا کولن	کولن صفحہ ۲۹۹ عجائب الاسفار یہ گویا ملیبار کا آخری شہر ہے (جو مدراس کے قریب کولم سے علیحدہ ہے) باقی (۸) مقام اسی ساحل پر ہنور اور کوچن کے مابین واقع ہیں
(۳)	ہیلی	اب آباد نہیں۔ ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ ہیلی کے شہر کو ہندو مسلمان متبرک سمجھتے ہیں۔ کیونکہ یہیں ایک جامع مسجد ہے جو برکت والی مشہور ہے صفحہ ۲۸۸ عجائب الاسفار
(۴)	جرفتن (پٹن)	سری کنداپورم مسجد اب بھی موجود ہے عجائب الاسفار صفحہ ۲۸۹

ط۔ ترجمہ تاریخ سنکلر مترجمہ ریورنڈ سیل موجود بہ کتب خانہ شرف الدولہ مرحوم۔

(۵)	درفتن	درمہ پٹن - یہاں بھی مسجد تھی - یہاں کے راجہ کے مسلمان ہونے کا ذکر ابن بطوطہ نے کیا ہے عجائب الاسفار صفحہ ۲۸۹
(۶)	فندرنیہ	میندارانی صفحہ ۲۹۱
(۷)	جالیات	پیرزادہ مولوی محمد حسین صاحب ایم اے کا قیاس ہے کہ بدٹین جسکا ابن بطوطہ نے ذکر کیا ہے چالیام ہوگا کیونکہ وہاں بھی مالک بن دینار کی مسجدوں میں سے ایک مسجد تھی مگر چالیام کا نام تحفۃ المجاہدین میں نہیں ہے اور جالیات (۱۰) الگ وہ مقام ہے جسکا ذکر ابن بطوطہ نے کلی کوٹ کے بعد کیا ہے اور جسکو خود انہوں نے بھی تسلیم کیا ہے صفحہ ۳۰۲
(۸)	فاکنور	برکور صفحہ ۲۸۶
(۹)	منگلور	منگلور صفحہ ۲۸۷
(۱۰)	کنجرکوٹ	مولوی محمد حسین صاحب نے شاید اسکا نام سہواً چھوڑدیا ہے

مالک بن دینار کے زمانہ کے متعلق تحفۃ المجاہدین میں اسطرح درج ہے کہ ان کے زمانہ کی تحقیق نہ ہوسکی۔ لیکن ظن غالب یہ ہے کہ ان کا زمانہ دوسری صدی ہجری کے بعد ہے۔ مسلمانان ملیبار کے شافعی مذہب ہونے سے فرشتہ نے یہ قیاس قائم کیا ہے کہ مالک بن دینار وغیرہ بھی شافعی ہونگے جس سے یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ وہ تیسری صدی کا ہی واقعہ ہے کیونکہ امام شافعی خود دوسری صدی کے آخر اور تیسری صدی کے شروع میں ہوئے ہیں۔ کتبۂ قبر سے تو چوتھی صدی کا واقعہ معلوم ہوتا ہے۔ تحفۃ المجاہدین میں مالک بن دینار کے خراسان واپس جانے کا ذکر ہے۔ مالک بن حبیب کرنگانور میں پیوند زمین ہوئے اور ان کی اولاد کولم میں بسی اسکے بعد تحفۃ المجاہدین میں مختصراً بتایا ہے کہ ملیباری بتدریج دین اسلام میں داخل ہونے لگے۔ ہر طرف سے عرب تاجر وہاں پہونچنے لگے اور بہت سے شہر مسلمانوں اور ان کی تجارت کی بدولت آباد ہوئے۔

پھر اس نے کسی قدر تفصیل سے بتایا ہے کہ ہندو راجاؤں اور مسلمانوں کے تعلقات کس قدر اچھی حالت میں تھے۔

ہندو راجاان سے اچھا برتاؤ کرتے تھے۔ نومسلم ملیباریوں کو ان کے ہم وطنوں کی طرف سے کوئی اذیت نہیں پہنچائی جاتی تھی بلکہ خود اصل مسلمانوں کی طرح انکا بھی احترام کیا جاتا تھا گو وہ اسلام لانے کے پہلے پنچ ذاتوں کے کیوں نہ ہوتے، مسلمان تاجر گویا چندہ کرکے اپنے نومسلم بھائیوں کی مدد کرتے تھے۔ کتاب کی قسم ثالث میں مولف نے ملیباریوں کی سوشل حالت پر نہایت عمدہ طور سے روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ اسلام کی کامیابی کا ایک سبب ملیباریوں کی وہ فرقہ بندی تھی جسکی بدولت ان کی سوشل حالت میں رخنہ پیدا ہوگیا تھا دو تین جگہ اس نے تصریح کی ہے کہ افراد ملک سے کوئی امر مخالف فرقہ بندی سرزد ہوتا تو ان صورتوں میں خود بخود ان کو اسلام کے سایہ میں پناہ لینے کی ترغیب ہوتی تھی۔ اس ضمن میں یہ بھی بتایا ہے کہ ملیباریوں کے بعض رسوم و رواج کا اثر مسلمانوں میں بھی ہوگیا ہے۔

غرضکہ داعیان اسلام کی کوششوں سے ملیبار میں وہ اسلامی زبردست نوآبادیاں قائم ہوگئیں جسکی عظمت و شان کا اندازہ کسی قدر ابن بطوطہ کے بیانات سے ہوتا ہے اور جن کی یادگار میں آج بھی ماپلے مسلمان موجود ہیں۔

کتاب کی قسم رابع میں جو اس رسالہ (تحفۃ المجاہدین) کا اصل مقصد ہے پرتگالیوں کے سواحل ہند پر آنے اور رفتہ رفتہ یہاں ان کی حکومت قائم ہونے کے حالات نہایت تفصیل سے بتائے ہیں اور کل مورخین ہند میں یہی فقیہ مورخ ہے جو اس حصۂ تاریخ کا پہلا جامع ہے اور میرے خیال میں خود پرتگالی مورخین نے اس سے زیادہ نہیں لکھا ہوگا جسقدر اس رسالہ میں لکھا گیا ہے۔ فرشتہ نے اس کو مناسب اختصار کے ساتھ اپنی تاریخ میں درج کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہوسکتا ہے کہ اندلس میں مسلمانوں پر جو ظلم وحشی پرتگالیوں کے ہاتھوں برپا ہوا تھا مثلاً جبراً عیسائی بنانا مسجدوں کی اہانت عورتوں کی بے حرمتی حج کی ممانعت وغیرہ ان سب کا پورا نمونہ ساحل ہندوستان نے بھی دیکھ لیا۔

(اسکی تصدیق انگریز مورخوں نے بھی کی ہے جو پرتگالیوں کے عیوب اچھے طرح ظاہر کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو تاریخ ہند مولفہ ذکاءاللہ)

اس حصۂ کتاب میں جو بات سب سے زیادہ قابل تعجب و ستایش ہے وہ واقعات کے علل و اسباب پر غور کرنا ہے پرتگالیوں کی ترقی کے اسباب عالم مصنف اس طرح بیان کرتا ہے۔ وہ اہل مکر و دھوکا والے ہیں اپنے معاملات کی مصلحتوں سے باخبر وقت ضرورت اپنے دشمنوں سے عاجزی کرنے لگتے ہیں اور جب ضرورت نکل جاتی ہے تو پھر ہر ممکن طور سے ان پر اپنا اثر ڈالتے ہیں اسی کے سبب نہایت اتفاق رکھتے ہیں اپنے افسرون کے

حکم کی مخالفت نہیں کرتے۔ باوجودیکہ وہ اپنے بادشاہوں سے نہایت دور مسافت پر ہیں بایں ہمہ ان میں بہت کم اختلاف ہے اور یہ کبھی نہیں سنا گیا کہ ان میں سے کسی نے اپنے افسر کو حکومت حاصل کرنیکی غرض سے مار ڈالا ہو اس لئے باوجود ان کی اقلیت کے ملیبار کے راجہ ان کے مطیع ہو گئے۔ اس کے برعکس مسلمان بادشاہوں میں باہمی نااتفاقی ایک دوسرے سے بدگمانی اپنی ذات کے خلاف سازش کا خوف وغیرہ اسباب تنزل نہایت وضاحت سے آئینہ کرکے بتاتا ہے۔

غرضکہ اس قابلِ قدر عالم مصنف نے دسویں صدی ہجری میں قوموں کی ترقی و تنزل پر جو فلسفیانہ نظر ڈالی ہے اور ساحل ہند کی جیسی مکمل تاریخ مرتب کی ہے اس پر اب چودھویں صدی میں بھی کوئی اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔ پرتگالیوں کی تاریخ کے ضمن میں اس نے یہ بھی بتایا ہے کہ مسلمان تاجروں کی تجارت کس طرح گھٹ گئی اور کس طرح پرتگالی بتدریج تمام تجارت پر قابض ہو گئے اور کسطرح مسلمانوں کی عظیم الشان جہاز رانی کا صرف نام باقی رہ گیا۔

ساحل کارومنڈل

تحفۃ المجاہدین میں ان داعیانِ اسلام کے صرف ملیبار میں توطن اور ساحل ملیبار پر ہی مسجدیں بنانے کا ذکر ہے لیکن مغربی ساحل ملیبار کی طرح مشرقی ساحل کارومنڈل میں بھی ان داعیان اسلام کے آثار اولین ملتے ہیں اور ان کا ذکر تحفۃ المجاہدین میں نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ تحفۃ المجاہدین چونکہ صرف ملیبار کی تاریخ ہے لہذا اس میں ساحل کارومنڈل کے متعلق ذکر نہیں کیا گیا۔ لیکن تحفۃ المجاہدین میں انکا ذکر نہ ہونے سے کسی طرح ان کی نفی نہیں کی جا سکتی۔ جبکہ تواتر سے اور صحیح قرائن سے انکا ثبوت مل رہا ہے۔ چنانچہ اسی کولم میں جو مدراس کے قریب واقع ہے اور جہاں حضرت تمیم انصاری رضی اللہ عنہ کا مزار واقع ہے ایک قدیم مسجد اسی زمانہ کی موجود ہے جسکو اسلامی تعمیر ہند کا سب سے پہلا دور کہا جا سکتا ہے۔ یہ مسجد بھی مالک بن دینار کی مسجد کے نام سے مشہور ہے اگر کوئی شخص جس نے ملیبار کی قدیم مسجدوں (۱) کو دیکھا ہو ان کا اس مسجد سے مقابلہ کرے تو اس کا قطعی فیصلہ ہو جائیگا کہ یہ مسجد بھی انہی کے ساتھ بنی ہوئی ہے۔

مولوی نجم الدین صاحب مرحوم تحصیلدار کولم نے جن کا نام ان کے عمدہ خیر کے کاموں کی وجہ سے

وہاں مشہور ہے، اپنے خاندان کی ایک تاریخ لکھی ہے اس میں ضمناً کولم کے حالات آگئے ہیں۔ بہرحال جس قدر تاریخی واقعات اس کتاب سے معلوم ہوئے ان کی نقل یہاں درج کی جاتی ہے نواب سعادت اللہ خاں مرحوم (جو کرناٹک کے مشہور اور سب سے پہلے نواب ہیں) ۱۱۱۱ھ میں حضرت سیدنا تمیم انصاری رضی اللہ عنہ کے مزار مقدس کی زیارت کے واسطے فائز کولم ہوئے اسوقت مسجد مالک بن دینار کے منبر پر خطبہ خواجہ احمد مرحوم نے (تحصیلدار صاحب مولف تاریخ کے جد اعلیٰ) جو نواب صاحب مرحوم کے ساتھ آئے تھے زبانی پڑھا ۱۱۵۹ھ میں اس مسجد کی خطابت و موذنی کا پروانہ اور اخراجات مسجد کیلئے جاگیر کدمباری ان کو نواب مزبور کی طرف سے عطا ہوئی جسکو انہوں نے اپنے بڑے بھائی شیخ محمد مرحوم کے نام سے کرادیا۔ ۱۱۶۷ھ میں درگاہ حضرت تمیم انصاری رضی اللہ عنہ کے عرس وغیرہ خدمات کیلئے موضع پر مالٹری کا پروانہ ان کے نام عطا ہوا یہ دونوں پروانے اور جاگیریں ان کے خاندان میں اب بھی بحال ہیں۔ نواب سعادت اللہ خاں کے زمانہ سے کولم کی تاریخ روشنی میں آئی ہے جب سے اس کا نام سعادت بندر رکھا گیا۔ محمد حسین حاکم شرع بھی جو نواب سعادت اللہ خاں کے ساتھ ۱۱۱۱ھ میں کولم میں آئے تھے یہیں بس گئے اور ان کے مشہور عمارتی آثار اب بھی موجود ہیں ۱۱۴۷ھ میں ان کا انتقال ہوا اور مزار مقدس کے بائیں مدفون ہوئے جہاں اب بھی ایک چوکھنڈی ہے اور ان کی تاریخ وفات کا کتبہ تین شعروں میں کندہ ہے۔

غرضکہ جب سے کرناٹک میں اسلامی نوابوں کا دور شروع ہوا کولم کی تاریخ روشن ہوئی ہے لیکن یہ سوال کہ حضرت تمیم انصاری کس طرح یہاں تشریف لائے ابھی تک تاریخی روشنی میں صاف نظر نہیں آتا۔ عام طور پر جو روایت مشہور ہے وہ شاید تاریخی طور سے تسلیم نہ کی جا سکے۔ بہرحال جبکہ چین کے بندر کیانٹن میں ایک صحابی کا مزار تواتر سے ثابت ہے تو ساحل کارومنڈل پر اسکی نفی نہیں کی جا سکتی۔ کولم کے قریب جو ساملی راس منجا کوپم کے مشہور دیول ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں بھی بڑی آبادی اور راجاؤں کا مستقر ہوگا جسکی تاریخ بہت کچھ غور طلب ہے حضرت تمیم انصاری رضی اللہ عنہ کے مزار مقدس کے آگے مسجد مالک بن دینار کے محاذی ایک چوکھنڈی ہے اور اس میں عام مروجہ قدوقامت کی قبروں سے کلاں قدوقامت کی قبر ہے۔ انکا نام مولوی نجم الدین صاحب کے فرزند مولوی عبدالرحیم صاحب کے زبانی سید سلیمان معلوم ہوا۔ مسجد مالک بن دینار کے پشت پر اطراف میں ایک قدیم قبرستان ہے جسکی قدامت ان کتبوں کے خطوط سے ثابت ہوتی ہے جو بعض قبروں کے پاس

پتھروں پر کندہ ہیں۔ بعض کتبے نہایت قدیم طرز کے عربی خط میں ہیں۔ ایک کتبہ جو نہایت قدیم عربی خط میں ہے افسوس ہے کہ باوجود کئی احباب کی کوشش کے پوری طور سے پڑھا نہیں گیا۔ زیادہ سے زیادہ اسمعیل بن عبداللہ بن علیؒ (۱۲) پڑھا جاتا ہے لیکن یہ بھی یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا۔ اور اس کے بعد آخری سطریں تو بالکل پڑھی نہیں جاتیں۔ یہ کتبے اس کے مضبوط گواہ ہیں کہ نواب سعادت اللہ خاں کے بہت زمانہ پیشتر کے ہیں، اور بلحاظ ان کے طرز خط اور بلحاظ اس تاریخ دعوت اسلام کے جو اسوقت تک قلم بند کی گئی ہے تیسری یا چوتھی صدی میں انکا لکھا جانا قرین قیاس ہے یہ عربی آثار قدیمہ ہیں جن کی طرف اب تک کسی متجسس آثار قدیمہ نے کوئی نگاہ لطف نہیں ڈالی ہے۔ اور جو اس وقت کے منتظر ہیں جبکہ عربی آثار قدیمہ کے متجسس ان کا پتہ لگانے کی کوشش کریں۔ نہ معلوم ہماری عربی سے محبّت رکھنے والے طلبائے علم میں کب یہ ذوق پیدا ہو کہ وہ اپنے اسلاف کی بالکل بھولی ہوئی تاریخ کا ان کتبوں کے ذریعہ سے پتہ لگائیں اور تاریخ ہند میں ایک ایسا اضافہ کریں جس کی طرف اسوقت تک بہت کم توجہ کی گئی ہے۔

ساحل کارومنڈل پر کولم کے علاوہ محمود بندر میں حضرت عکاشہؓ کا مزار بیان کیا جاتا ہے۔ اس بات کا باوجود دریافت کوئی پتہ نہ لگا کہ محمود جسکے نام پر یہ بندرگاہ آباد ہے کون تھا۔ حضرت عکاشہؓ کی نسبت بھی بیان کیا جاتا ہے کہ نواب والاجاہ مرحوم کے پروانہ میں عکاشہ صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم درج ہے (مجھے جناب مولوی محمود صاحب نے جناب طرازش خاں مرحوم سے سُنی ہوئی یہ بات کہی ہے)

بہرحال ملیبار کی طرح کارومنڈل میں بھی عرب مسلمانوں کا زبردست اثر موجود ہے۔ ابن بطوطہ معبر (کارومنڈل) کے حصۂ زیریں مشہور مدرہ اور کاویری پٹن تک آیا تھا جہاں اسوقت اسلامی شاہان معبر کی حکومت تھی (اسلامی شاہان معبر کی تاریخ مولوی محمد حسین صاحب نے نہایت تلاش سے لکھی ہے عجائب الاسفار) علاء الدین خلجی و محمد تغلق نے جب دکن سے راس کماری تک فتح کیا ہے تو اسوقت ساحل پر مسلمان تاجر پہلے سے موجود تھے۔ اس ساحل پر کولم کے قریب سدرن پٹن کے حالات بھی قابل لحاظ ہیں۔ میرے مہربان سید شاہ محمد حبیب اللہ صاحب نے سدرن پٹن کے متعلق قابل لحاظ حالات قلم بند کیے ہیں (جو صحیفہ ماہواری میں

تھے)۔ یہ صاحب اب صدر محاسبی سرکار عالی میں منتظم ہیں۔

شائع ہوئے، جن سے اس قیاس کی تصدیق ہوتی ہے کہ مالک بن دینار کی کوششیں ملیبار میں محدود نہ رہیں بلکہ کل ساحل کارومنڈل میں اس عظیم الشان حقیقی مجاہد و داعی اسلام نے دورہ کیا تھا۔ صاحب موصوف نے جو حالات لکھے ہیں یہاں نقل کیے جاتے ہیں" سدراس کولم سے ۹ امیل کے فاصلہ پر زمانۂ قدیم کا ایک مشہور و آباد شہر سمجھا جاتا ہے مسلمانوں کی آبادی تخمیناً ۸۰۰-۹۰۰ افراد کے مابین ہوگی۔ ڈچ لوگوں کا ایک پرانا قلعہ فی الحال شکستہ حالت میں ہے۔ یہ قلعہ بھی انہی قلعوں میں سے ہے جن کو انگریزوں سے ڈچ نے بروقت معاہدہ توڑ دینے کا اقرار کیا تھا۔ یہاں دو مسجدیں ہیں ایک فتح خاں کی مسجد کہلاتی ہے جو چھوٹی سی پتھر چونے کی مسجد ہے مسجد کے سامنے ایک گنبد میں فتح خاں کی قبر ہے - اور مسجد کے داہنے جانب گنبد نما رواق میں فتح خاں کے بھائی کی قبر ہے۔ اسی دوسری گنبد کے بلند حصہ پر کچھ عبارت فارسی خط میں کندہ ہے۔ جو بلندی اور خود رو بیلوں کے ڈھک جانے سے سمجھ میں نہیں آئی - یہ گنبد اور مسجد اس قدر تباہ و شکستہ حالت میں ہیں کہ اندر قدم رکھتے ہوئے خوف ہوتا ہے۔ مسجد کے ہر ایک حصہ میں جنگلی خاردار درخت ایستادہ ہیں۔ دوسری مسجد جو زیادہ قدیم اور تاریخی طور سے قابل لحاظ ہے کسی قدر اچھی حالت میں ہے مسجد میں ایک بوریہ بچھا ہوا ہے جہاں ایک یا دو آدمی یا کوئی مسافر نماز پڑھتے ہوئے نظر آجاتا ہے۔ اس مسجد کی وضع تعمیر ویسی ہی ہے جیسے کولم میں مسجد مالک بن دینار کی ہے اور اس مسجد کے متصل بھی ایک قبرستان ہے جس کی الواحِ مزار کی وضع تحریر و تراش بھی ویسی ہی ہے جیسی کولم میں مالک بن دینار کی مسجد کے متصل قبرستان میں اس مسجد کے متولی مولوی نجم الدین صاحب مرحوم تحصیلدار کے برادر زادے ہیں اور ان کی سکونت سدرن پٹن سے چند میل کے فاصلہ پر کسی قریہ میں ہے۔ کولم میں ان سے ملاقات ہوئی تھی انہوں نے بیان کیا کہ ان کے والد کہتے تھے کہ سدرن پٹن کی مسجد بھی مالک بن دینار کی تعمیر کی ہوئی ہے۔ سدرن پٹن سے دو میل جانب شمال ایک موضع موسوم بہ کل پاک ہے جہاں آبادی سے دور لب ساحل دو کچی قبریں ہیں عام طور سے ایک قبر کے مدفون کا نام نوربی مشہور ہے اور ان کے پہلو میں ان کے فرزند کی قبر بیان کیجاتی ہے۔ نوربی صاحب کرامت مشہور ہیں۔ ہر سال ان کا عرس بتاریخ ۲۱ ذی الحجہ ہوتا ہے یہ دونوں قبریں باوجود اس کے کہ ساحل پر ہیں اور بجز ایک تودۂ ریت کے اور کچھ نہیں باایں اپنی اصلی حالت پر قائم ہیں۔ ان دو قبروں کے متعلق کوئی زیادہ تحقیقات نہ ہو سکی۔ نوربی کی قبر پر سرہانے اور پائیں دو پتھر نصب ہیں سرہانے کے پتھر پر شمال کی جانب کچھ عبارت کندہ ہے۔

جو قدامت نیز لوحِ مزار کے روغن آلود ہونے کی وجہ سے کچھ سمجھ میں نہیں آتی۔ شاید آیت "کل من علیھا فان"
ہوگی۔ اس پتھر کی وضع تراش بھی ویسی ہی ہے جیسے کولم میں مالک بن دینار کے قبرستان میں یہاں تک مدراس کے
جانبِ جنوب کی تاریخ قلمبند کی گئی۔ مدراس کے جانبِ شمال ساحل پر پلیا گھاٹ میں بھی قدیم وضع کی مسجدیں ہیں
اور عربی آبادی کا زبردست اثر ہے جو ملیبار اور دوسری جگہ کے مسلمانوں کی طرح اب زمانہ کی رفتار سے تنزل میں ہے
ظاہر ہے کہ ان کی عظمت تجارت کی وجہ سے تھی جو اب یورپ کے بخار و برق کی طاقتوں کے روبرو ٹھہر نہیں سکتی
تھی۔ پلیا گھاٹ کے رومال پائیداری میں مشہور تھے۔

پلیا گھاٹ کے آگے عربوں کا نشان نہیں ملتا۔ بظاہر یہ امر قابل تعجب معلوم ہوگا کہ مدراس سے
نیچے تک تو عربی تین آثار موجود ہوں لیکن جب اس سے اوپر بنگالہ کی طرف بڑھیں تو یہ آثار معدوم ہو جائیں۔
لیکن اس میں دراصل عرب داعیان اسلام کا کوئی قصور نہیں ہے۔ اصل یہ ہے کہ قدرتی طور سے یہ حصہ بالکل غیر آباد
دشوار گذار واقع ہوا ہے۔ سمندر رو ساحل میں بہت نشیب و فراز ہیں چنانچہ عربوں سے پہلے آرین متمدن حکومتوں کا
اثر بھی یہاں بہت کم پہونچا تھا۔ جغرافیۂ مدراس مرتبہ محمد ابوالحسن (موجودہ کتب خانہ شرف الدولہ) میں لکھا ہے کہ
"ان تمام شمالی و ساحلی ضلعوں میں جنوبی اضلاع ساحلی کے جیسے بڑے بڑے خوبصورت مندر بالکل کم نظر آتے ہیں"
یہ اس لحاظ سے کہ مشرقی ساحل کا شمالی بالائی حصہ تجارتی و تمدنی لحاظ سے اس کے جنوبی حصہ زیرین کا مقابل
نہیں تھا بلکہ غیر آباد ملک تھا لہذا عرب تاجروں اور داعیان اسلام کا بھی یہاں زیادہ اثر نظر نہیں آتا۔ شمالی اضلاع
نیلور۔ گنٹور۔ مچھلی بندر۔ راجمندری میں عربی قدیم آثار ملیبار و کرناٹک جنوب کی طرح بالکل نہیں پائے جاتے۔ ان
اضلاع میں جو کچھ اسلامی آثار ہیں بھی تو وہ مابعد اسلامی دور علی الخصوص ہماری سلطنت آصفیہ کی یادگاریں ہیں
مثلاً ضلع گنٹور میں نظام پٹنم جو سرکار آصفیہ کی مبارک کوششوں کی نشانی ابھی اپنے نام سے ظاہر کر رہا ہے۔
راجمندری کی مسجد حال میں از روئے قانون آثار قدیمہ قابل حفاظت قرار دی گئی ہے اسکے حالات بھی دریافت
طلب ہیں۔ اس ساحل میں سب سے آخری ضلع اسحق پٹن چیکم کو یاد دلاتا ہے کہ عربی قدیم اثر یہاں بھی موجود ہے۔ اسحق کا
نشان مابعد اسلامی دور میں نہیں ہے اور اسلئے یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ بلحاظ اپنے نام کی وضع کے پرانے عربوں ہی سے ہوگا۔

غلام دستگیر صاحب دانا و عبدالرحیم صاحب پانوچھے نے بیان کیا کہ یہ وہاں اسحق مدینہ کے نام سے مشہور ہیں۔

اور قدیم زمانہ میں یہاں آئے تھے۔ کل اس ساحل میں آسحق پٹن ہی ایسا بندرگاہ ہے جو جہازوں کے لنگر انداز ہونے کیلئے بہت ہی ٹھیک طور سے واقع ہوا ہے اور اسلئے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ عرب جہازران اس ساحل کو پوری طرح چھانتے ہوئے آخر ایک ایسے انتہائی مرکز پر پہنچ گئے جہاں اس ساحل کا خاتمہ ہوتا ہے اور جس کے بعد صرف ضلع گنجام ایسا ہے جہاں ہندوستان کی قدیم ترین بھیل اور گونڈ بستیاں ہیں۔ ساحل ہند کو چھانتے ہوئے عرب تاجروں نے جو عظیم الشان اسلامی آثار چھوڑے ہیں اسکی تاریخ اس نقطہ پر ختم ہوتی ہے۔

مغربی ساحل

واضح رہے کہ مشرقی ساحل کی طرح مغربی ساحل بھی ابتدا ہی سے مسلمان عرب تاجروں کی کوشش سے معمور رہا فرشتہ لکھتا ہے:۔

"بعد ازانکہ رفتہ رفتہ تردد مسلمانان در آں ملک بسیار شد و بسیاری از ملوک ملیبار بحلقۂ اسلام در آمدند راجہائے بندر گوداک دابل وجیول وغیرہ بطریق حکام ملیبار مسلمانانے راکہ از عربستان آمدند در سواحل دریا مسکن دادہ ایشان را مخاطب بہ نوایت گردانیدند"

بلحاظ تقدم مکانی میرے خیال میں ملیبار و ساحل کارومنڈل سے پہلے یہاں اسلام کا اثر مستحکم ہو گیا تھا جیسا کہ عجائب الہند سے معلوم ہوتا ہے، اور اس کی بڑی تصدیق ابن بطوطہ سے ہوتی ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حملے کے بعد سے ہی یہاں مسلمانوں کے آثار ملتے ہیں۔ بمبئی کے قریب تھانہ میں صحابۂ کرام کا مدفون ہونا بیان کیا جاتا ہے عرس وغیرہ بھی ہوتا ہے۔

یہ تاریخ جس پر درا صل سرسری نظر ڈالی گئی ہے اس قابل ہے کہ اس کی پوری تحقیقات کیجائے۔

ک۔ دابھول اور جیول مغربی ساحل پر دو بڑے بندرگاہ تھے۔ سلطنت بہمنیہ کے زمانہ میں بھی ان کی شہرت قائم تھی۔ بقول فرشتہ محمود شاہ بہمنی کے وقت میں بڑے شہروں میں ان کا شمار تھا فیروز شاہ کے زمانہ میں جب بحری ترقی ہوئی تو یہ بندر بھی بحری کارناموں کے مرکز تھے۔ دابھول کوکن میں اب ضلع رتن گری میں واقع ہے سیرۃ المحمود صفحہ ۶ مولفہ مولوی عزیز مرزا صاحب۔

بے شبہ عرب زندگی کی ضرورتوں کے لحاظ سے آئے لیکن کشت وخون اور رجوع البقر کی طرح نہیں بلکہ تہذیب وتمدن فاضلہ کے اس جائز اور لازمی طریقہ کے موافق جس کا بقول محققین یورپ یوروپین تہذیب وتمدن میں صرف نام باقی ہے۔ ان اسلامی مشنوں کے بے ضرر ہونے کا اس سے زیادہ کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ یہاں کے ہندوؤں نے بلامزاحمت اُن کو "خوش آمدید" کہا اور کئی صدیوں تک مسلسل ایسے میل جول کے ساتھ بسر کرتے آئے[ل] جس کی ایک جھلک اب بھی ساحلی مقامات پر نظر آتی ہے۔ (۱۴)

تقسیم قومی

اس طرح بغیر کشت وخون یا مکر وفریب کے محض پُرامن طریقہ سے جس عمارت کی بنا ڈالی گئی تھی اُس کی بنیادیں اب بھی علی حالہ مستحکم ہیں، نوایتہ، ماپلے، لبے، چولئے کیلان وغیرہ مختلف کثیر التعداد قبائل اسی عمارت کا مختلف قسم کا مسالہ ہیں جن کی باہمی تفریق ایک دشوار کام ہے اور علمی تحقیقات کی شعاعیں اس کی مانند پڑتی ہیں صرف دو کتابیں میری نظر سے ایسی گزری ہیں جن میں اس کے متعلق کسی قدر لکھا گیا ہے۔ ایک سراج التواریخ جو نواب غلام غوث خاں مرحوم کے حسب الحکم مرتب ہوئی لیکن افسوس ہے کہ اس کا مکمل نسخہ دستیاب نہیں ہوتا صرف ایک خام مسودہ نظر سے گذرا ہے (موجود نزد جناب مفتی محمد سعید خاں صاحب مرحوم) دوسرے مولوی نجم الدین صاحب مرحوم کی خاندانی تاریخ جس کا پہلے ذکر ہوچکا ہے۔ ان دونوں کتابوں سے جس قدر سوا ول سکا وہ قلم بند کیا جاتا ہے ساپلے ملیبار کے مسلمان ہیں وجہ تسمیہ میں مختلف اقوال ہیں لیکن کوئی صحیح قول معلوم نہیں ہوا چولئے بقول سراج التواریخ وہ مسلمان ہیں جو چولامنڈل میں بسے۔ چولامنڈل چولا راج کی عملداری ہے جس میں ترناولی، مدصرہ، تنجاور شامل ہیں جو کایل میں بسے وہ کایلان کے نام سے مشہور ہوئے۔ لبے جن کی شہرت کل تجارتی دنیا میں چھپی ہوئی نہیں ہے ان کی وجہ تسمیہ سراج التواریخ میں یہ بیان کی گئی ہے کہ چونکہ یہ لوگ

ل۔ تحفۃ المجاہدین میں صراحتاً مذکور ہے کہ ہندو راجہ مسلمانوں کے ساتھ نہایت عمدہ برتاؤ کرتے تھے۔ اور مسلمان بھی ہندوؤں کے ساتھ کسی قسم کی برائی نہ کرتے تھے مسلمانوں کی وجہ سے ملک میں تجارت اور تمول کو ترقی ہوئی دعوت اسلام بین الطوائف و عجائب الہند سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے جیسا اوپر درج کیا گیا ہے۔

لبیک لبیک بکثرت استعمال کرتے تھے لہذا اسی لفظ سے ان کی شہرت ہوگئی جو کثرت استعمال سے لبّہ ہوگیا۔ جبکہ اس امر پر غور کیا جائے کہ اب بھی ان قابل عزت سلمانوں میں لبیک کا لفظ بکثرت استعمال کیا جاتا ہے تو بلحاظ اصول علم الالسنہ یہ وجہ تسمیہ بعید نہیں بلکہ قرین قیاس ہے۔ یہ قبائل ان مسلمانان ہند سے جو ما بعد زمانہ میں براہ خشکی ہندوستان میں داخل ہوئے بالکل متمائز ہیں۔ عموماً شافعی ہیں۔ ان کی تجارت مشہور عالم ہے سرسری نظر سے بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ ان قبائل کی زبان (عرب نائل وغیرہ) پیشہ، عادات، لباس۔ وضع قطع چال ڈھال وغیرہ میں کسی قدر بین عربی اثر ہے۔ یورپ کے بخار اور بجلی کی طاقتوں نے ان کی تجارت پر بھی اپنا مہیب اثر ڈالا اور ان کی پہلی عظمت باقی نہ رہی۔

نوائتیہ

نوائتیہ کے متعلق بہ نسبت دوسرے قبائل کے زیادہ مواد دستیاب ہوتا ہے اور تاریخی مذاق رکھنے والوں کے پاس یہ امر نہایت قابل قدر ہے کہ عزیز جنگ بہادر نے اُردو زبان میں سب سے پہلے تاریخ النوایط لکھ کر اس قبیلہ کی تاریخ روشنی میں لانے کی کوشش کی ہے۔ یہاں ہم کو ان کی قومی تاریخ سے قطع نظر صرف عام تاریخ سے بحث ہے سب سے اوّل غور طلب یہ ہے کہ صحیح املا ط سے ہے یا ت سے۔ ط کا املا لکھنے والوں کی بنیاد قبیلہ کے جدا علیٰ کے لقب پر بیان کی جاتی ہے۔ یہ املا جہانتک تحقیقات سے پتہ چلتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ بارھویں صدی ہجری سے رائج ہوا ہے (مثلاً مولوی محمد باقر آگاہ کی تحریر النفحۃ العنبریہ میں) اور جویائے حقیقت کو یہ تسلیم کرنے کے بغیر چارہ نہیں کہ جن روایتوں پر اسکی بناء قرار دی گئی ہے وہ بالکل معرض تزلزل میں ہیں۔ اور ایسی متزلزل روایات کی بناء پر مختلف تفرعین (جیسی کہ تاریخ النوایط میں کی گئی ہیں) صحیح نہیں قرار دیجاسکتیں۔ پس اس حالت میں اسکے سوا چارہ نہیں کہ ت کا املا ہی درست قرار دیا جائے۔ سب سے پُرانی کتاب جس میں اس قوم کا ذکر آیا ہے یعنے فرشتہ اس میں ت سے ہی لکھا گیا ہے۔ فرشتہ نے ہر جگہ یہی املا لکھا ہے۔ قاضی عبدالنبی احمد نگری (کتاب جامع العلوم) اور آزاد بلگرامی وغیرہ کی تحریروں میں بھی یہی املا درج ہے لیکن فرشتہ نے نوایتہ کا معنی جو خداوند بیان کئے ہیں وہ حقیقی نہیں سمجھے جاسکتے بلکہ میرے خیال میں اسکے اصل معنی وہی ہیں جو عموماً لغت کی کتابوں میں بیان کئے گئے ہیں طلاح و جہاز ران کو نوتی کہتے ہیں اسی کی

جمع نوتی (۱۴) ۔ نوتیہ ہے اور نوائتیہ بھی غلطی سے زبان زد ہے ۔ بلحاظ اس قدر مستند تحقیقات تاریخی کے جو ساحل ہندوستان پر مسلمانوں کے ورود و توطن کے متعلق اسوقت تک قلم بند کی گئی ہے ۔ یہ صاف نظر آتا ہے کہ نو وارد جہازوں پر آنے والے معزز عربوں کا بھی نوتیہ کے لقب سے مشہور ہونا ناقابل تعجب نہ تھا جو آخر چلکر کثرت استعمال اور ہندی لہجہ میں نوائتیہ ہوگیا ۔ یہ ایک جداگانہ نسبی بحث ہے کہ ان نوائتیہ میں بعض سادات بعض بنی ہاشم بعض قریشی سے ہوں ۔ فرشتہ نے علاء الدین خلجی کے عہد کے ناموروں کے بیان میں تصریح کی ہے کہ " دیگر از سادات کہتیل سید مغیث الدین و برادراو سید نجیب الدین کہ ایشاں سادات نوائتیہ می گفتند "
لیکن اصل کتاب تاریخ فیروز شاہی ضیاء برنی جس سے فرشتہ نے یہ اخذ کیا ہے اس میں نوحتہ لکھا ہے
(تاریخ فیروز شاہی طبع کلکتہ مصححہ سید احمد خاں)

تعلیقات

از جناب ڈاکٹر حمید اللہ صاحب
استاذ قانون جامعہ عثمانیہ

(۱) مضمون کا آغاز لبوں کے ایک اقتباس سے ہوا ہے جو اصل فرانسیسی کتاب کے صفحہ ۵۹۹ تا ۶۰۰ پر موجود ہے ۔ اس میں کوئی حوالہ نہیں ہے کہ قدیم تر زمانے میں ہندیوں کا عرب جانا قابل قبول ہے اور کیوں عربوں کا ہند آنا نہیں ۔ مسقط و عمان اور سندھ و بلوچستان میں اتنی جغرافی قربت ہے کہ عربوں کا وہاں نہ جانا حیرت کی بات ہوگی ۔ عربوں کا اپنے مرز بوم کی صحرائی اور غیر زرخیز حالت کے باعث کچھ نہیں تو چار ہزار سال قبل مسیح سے ترک وطن کے سیلاب برپا کیا کرنا مسلم ہے (عنایت اللہ جیوگرافکل فیاکٹرس ان عربین لائف ۱۹۴۲ء صفحہ ۲۶) زمانہ قدیم کی سب سے بڑی سمندری قوم فینیقی یا کنعانی، انہیں مہاجر عربوں پر مشتمل تھی ۔ عرب اپنے روزگار کے لئے زراعت و حرفت سے محروم ہونے کے باعث محض تجارت پر تکیہ کرنے پر مجبور تھے ۔ محنت اور پیٹ بھرے ہندی کو کیا پڑی تھی کہ تجارت کے لئے عرب جیسے خشک اور مفلس ملک ہی کو جائے ۔ ہندیوں کو تجارتی بحری سفر کا شوق رہا ہو یہ علمی حلقوں میں ابھی تک درخور التفات نہیں سمجھا گیا ہے ۔ عہد نبوی میں یمن و عمان ہی نہیں حجاز کی عربی زبان بھی

م ۔ مختار من تاج العروس للسید المرتضیٰ جلد ۱۰ طبع بیروت ۔ ن ۔ شفاء الغلیل ۔ الشہاب الخفاجی صفحہ ۲۲۹ طبع مصر

بحریات کی اصطلاحوں سے اتنی مالا مال ہے کہ وہ کسی طویل بحری روایات کے پس منظر کے بغیر سمجھ میں نہیں آسکتی قرآن مجید میں سمندری سفر اور بحری تجارت کا جو کثیر اور دقیقہ رس ذکر ہے، اس کے اوّلین مخاطب حجازی عرب ہی تھے۔ اگر "رحلۃ الشتاء والصیف" پر دارومدار معشیت رکھنے والے بحری تجارت سے ناآشنا محض رہے ہوتے تو قرآن مجید کا شد و مد سے اور بار بار بحری سفر کی نعمتیں یاد دلا کر خالق بحر کی طرف بلانا بے اثر ہوتا۔ عہد نبوی کی اور خود زمانۂ جاہلیت کی تکی دستاویزوں میں مابلّ بحرٌ صوفۃً کا بحری محاورہ تقریباً تکیہ کلام کے طور پر برتا جاتا نظر آتا ہے۔ قرآن مجید کی مزید اصطلاح "لتذھبا بحکم" بھی بادبانوں سے متعلق اصطلاح سمجھی جاتی ہے۔ (ان دونوں محاروں کی تشریح کے لئے دیکھئے میری الوثائق السیاسیۃ حصۂ غریب اللغات)

"عرب و ہند کے تعلقات" کے صـ۶ پر مولانا سلیمان ندوی نے لکھا ہے "عرب تاجر ہزاروں برس پہلے سے ہندوستان کے ساحل تک آتے تھے اور یہاں کے بیوپار اور پیداوار کو مصر اور شام کے ذریعہ یورپ تک پہنچاتے تھے اور وہاں کے سامان کو ہندوستان، جزائر ہند، چین اور جاپان تک لے جاتے تھے"۔ مگر کوئی حوالہ نہیں دیا گیا ہے۔ اسی کے صـ ۱۱۱ کا یہ اقتباس بھی دلچسپی سے پڑھا جائیگا کہ "ستیارتھ پرکاش کے مصنف سوامی دیانند جی نے گیارہویں سمولاس (مہابھارت، ادھیایہ ۱۴۷) میں لکھا ہے کہ: مہابھارت میں جب کوروں نے لاکھ کا گھر بنا کر پانڈوؤں کو اس کے اندر جلا کر پھونک دینا چاہا تو ودر جی نے یدھشٹر کو عربی زبان میں بتایا اور یدھشٹر جی نے اسی عربی زبان میں ان کو جواب دیا"

سردار کے ام پانکر کی تالیف "ملیبار اینڈ دی پورچگیز" (۱۹۲۹ء) صـ۲ و مابعد میں تفصیل سے بتلایا گیا ہے کہ ہندوستان کی بحری تجارت "زیادہ تر مصریوں اور ایشیائی یونانیوں" کے ہاتھوں میں تھی۔ ملیبار میں قدیم رومی سکے بڑی کثرت سے دستیاب ہوئے ہیں اور جیسا کہ بلاذری نے لکھا ہے عرب چونکہ خود اپنے سکے نہیں رکھتے تھے اس لئے وہ رومی اور ایرانی سکوں ہی سے کاروبار چلاتے تھے۔ صـ۷ پر پانکر نے یہ بھی لکھا ہے کہ "عرب، مصر اور مغرب سے اس قریبی تعلق ہی کے باعث ملیبار میں یہودی اور سینٹ ٹامس کے فرقے کے عیسائی آئے"۔ یونانی اور رومی جغرافیہ نویسوں وغیرہ کے بیان سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کو جہاز جاتے تھے اور ہندوستان سے جہاز آتے [illegible]

سے ورثہ کی فرانسیسی تالیف "عرب" صفحہ ۹ میں بھی یہ لکھا گیا ہے [illegible] کی صحرائی کیفیت کے باعث

غلہ وغیرہ حاصل کرنے ہند اور دیگر ممالک کو جایا کرتے تھے اور اس بارے میں توریت سے بھی استدلال کیا ہے (حزقیل ۲۷)

غرض بحر احمر اور خلیج فارس اور بحر عرب کی بندرگاہوں سے جہازوں کا جانا بعثت نبوی سے بہت قریب نہیں بلکہ سینکڑوں ہزاروں برس سے جاری معلوم ہوتا ہے۔

(۲) تحفۃ المجاہدین مطبوعہ لزبن صفحہ ۲۱ کی اصل عربی عبارت کا ترجمہ یہ ہے :-

"حصہ دوم اسلام کا ملیبار میں شروع ہونا۔ وہ یہ کہ یہودیوں اور عیسائیوں کی ایک جماعت ملیبار کے ایک شہر میں آئی جسے کرنگلور کہتے ہیں۔ یہ وہاں کے بادشاہ کے رہنے کی جگہ ہے۔ یہ لوگ ایک بڑے جہاز میں اپنے عیال و اطفال کے ساتھ آئے اور اس (بادشاہ) سے زمینیں اور باغ اور گھر مانگے اور وہیں بس گئے۔ اس کے برسوں بعد وہاں مسلمان فقیروں کی ایک جماعت آئی جن کے ساتھ ایک شیخ بھی تھا۔ یہ لوگ ہمارے باپ آدم علیہ السلام کے قدم کی زیارت کے قصد سے نکلے تھے"

پانکر نے (ملیبار اور پرتگالی صفحہ ۷) لکھا ہے کہ "یہودیوں اور عیسائیوں کی آمد کا ٹھیک وقت ہمیں معین طور سے معلوم نہیں۔ اس کی شہادت موجود ہے کہ وہ ساتویں صدی عیسوی میں ملیبار میں پھل پھول رہے تھے"۔ بظاہر یہ اسلام کی آمد سے ایک آدھ نسل سے زیادہ قدیم نہیں۔

(۳) کولم (Coulong) مدراس کے جنوب میں ساحل پر کوئی چالیس میل پر ایک چھوٹی سی بستی ہے جہاں ایک پرتگالی قلعے کے کھنڈر بھی تا حال پائے جاتے ہیں۔ محمود بندر ایس آئی ریلوے پر ایک اسٹیشن ہے جو پونڈی چری اور کڈلور جنکشن کے جنوب میں چنگل پیٹ جنکشن سے ریل پر پورے (۱۱۰) میل پر واقع ہے۔ انگریزی میں اسے پرتگالی نام سے پورٹو نووو (نئی بندرگاہ) (Porto Novo) کہتے ہیں اور تامل زبان میں اسے پھرنگی پیٹ (فرنگی پیٹ) جیسا کہ اسٹیشن پر نام کا تختہ بتاتا ہے۔ حضرت عکاشہ رضؓ کو مقامی مسلمان ہنکاس کہتے ہیں۔ مگر وہاں کتبے نہیں ہیں اور موجودہ مقبرہ سو پچاس سال سے زیادہ پرانا نہیں معلوم ہوتا۔ اسی محمود بندر میں علاوہ حضرت عکاشہ رضؓ کے مزار کے میں نے منصور حلاج کا مزار بھی سنہ ۱۹۳۶ء میں دیکھا تھا حالانکہ منصور حلاج کی لاش کو جلا کر بغداد میں دریائے دجلہ میں پھینک دیا گیا تھا۔ نواب بہادر یار جنگ کے سفرنامے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں ناموں کے صحابہ کے مزار انہوں نے افغانستان میں بھی دیکھے تھے۔

(۴) بروم ہال نے انگریزی میں "اسلام چین میں" کے نام سے جو تاریخ لکھی ہے، اس کے صفحہ ۶۶ پر چین کی ایک مقامی روایت کا ذکر ہے کہ شہنشاہ چین نے اپنے اسلام کے اظہار کے لئے ایک سفیر مدینہ روانہ کیا تھا اور اسی کتاب میں صفحہ ۱۰۳ تا ۱۲۰ پر تفصیل سے اس مسئلے پر بحث ہے کہ جناب رسالت مآب نے اپنے ایک قریبی رشتہ دار نیز حضرت سعد بن ابی وقاص رضی کو چین روانہ کیا تاکہ سنگان تو میں ایک مسجد تعمیر کریں۔ یہ مسجد اب بھی موجود ہے اور کینٹن میں مقبرہ بھی ہے۔ اُن کے کتبوں کے حالات غالباً اردو دانوں کے لئے نئے ہونگے اس لئے کسی قدر تفصیل سے خلاصہ بیان کیا جاتا ہے۔

چین کی اسلامی یادگاروں میں سنہ ۱۲۵ھ / ۷۴۲ء کا کتبہ جو شہر سیان فو میں ہے سب سے پرانی چیز ہے۔ اس کا ذکر خانوادہ منگ کے سرکاری "عظیم الشان جغرافیا" میں بھی ہے اور کینٹن کے اسلامی کتبوں میں بھی لیکن یہ دونوں قسم کے بیانات سیان فو کے خود اصل کتبے پر مبنی ہیں اس لئے کوئی تائیدی شہادت کی حیثیت نہیں رکھتے۔ یہ کتبہ چینی زبان میں سیان فو شنسی کی سب سے قدیم مسجد میں ہے۔ اس کا چربہ چار فٹ آٹھ انچ لمبا اور دو فٹ ساڑھے تین انچ چوڑا ہے اور اس پر جو چینی تاریخ ہے وہ سنہ ۷۴۲ء کے مطابق ہے۔ علاوہ عنوان کے اس میں اکیس کھڑی سطریں اور ہر سطر میں کوئی تیس لفظ ہیں۔ اس کا ترجمہ یہ ہے:-

پہلی مسجد بنانے کی یادگار

"یادگاری کتبہ جو پہلی مسجد بنائی جانے کے متعلق ہے
اسے حکیم القانون وانگ کنگ معتمد مجلس مال و حساب نے لکھا ہے"

"جو چیز شک شبہ کئے بغیر سو نسلوں تک مانی جاتی رہی ہے اور وہی صداقت ہے۔

(انسان کو) جس ذریعے سے یقین حاصل ہوتا ہے وہ دل ہے۔ تمام عقلمندوں کا دل ایک ہوتا ہے اور صداقت بھی ایک ہی ہوتی ہے۔ اسی لئے ان میں سے ایک کی بات سے دوسرے کو یقین حاصل ہو جاتا ہے اور شبہے کی گنجائش نہیں رہتی چاہے (دونوں میں) سو نسلوں کا فصل ہی کیوں نہ ہو۔

"دنیا کے تمام حصوں میں عقلمند پیدا ہوتے ہیں جو (ہی) وحدت دل اور صداقت کے حامل ہوتے ہیں۔ مغرب کے بڑے عقلمند (حضرت) محمدؐ نے عرب میں، چین کے عقلمند کنفوشس کے بعد دو ہزار سال گزری

اگرچہ ان میں باہم نسلوں اور صدیوں کا فصل تھا لیکن ان دونوں کی تعلیمات یکساں ہیں کیوں؟ اس لئے کہ وہ ایک ہی دل اور صداقت کے مالک تھے۔ مثل مشہور ہے کہ ہزاروں عقلاء ہوں بھی تو ان کا دل ایک ہوتا ہے اور دس ہزار قرن بھی گزر جائیں تو ایک ہی صداقت براجتی ہے۔

" اگرچہ اس بڑے مغربی عقلمند (یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) کو گزرے ہوئے نسلیں ہو گئیں لیکن قرآن اور حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ مافوق الفطرت حکمت لے کر پیدا ہوئے تھے۔ آپ پیدائش اور ترقی عالم کے قوانین سے واقف تھے۔ آپ نے زندگی اور موت کا ذکر کیا ہے۔ آپ کی تعلیم میں یہ امور بھی تھے کہ نہا کر پاکی حاصل کرو، روزے رکھ کر جذبات پر قابو حاصل کرو، تربیت نفس کے لئے ضروری ہے کہ اپنی خامیوں کو دور کرو، دوسروں کو یقین دلانے کیلئے صداقت اور دیانت کے حامل بنو، شادیوں اور جنازوں میں شرکت کرو۔ اہم ترین اخلاقیاتی مسائل سے لے کر روز مرہ زندگی کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیل تک میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو معقولیت کی حامل نہ ہو یا جس کے متعلق آپ نے احکام نہ دیئے ہوں اور ان میں ہمیشہ خدا کے احترام کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ اگرچہ آپ کی تعلیمات کی تفصیل دراز ہے لیکن ان سب کا منشا صرف ایک چیز کو حاصل کرنا ہے یعنی خلاق عالم خدا کی عزت کی جائے۔

" شہنشاہ یاؤ نے کہا تھا کہ آسمان کی عزت کرو۔ شہنشاہ ٹینگ نے کہا تھا کہ "عزت ملحوظ رکھنے سے روز اپنی اصلاح ہو سکتی ہے۔" شہنشاہ وین وانگ نے کہا تھا کہ "خدا کی عبادت کرو"۔ کنفوشس نے کہا تھا کہ "جو آسمان کے خلاف گناہ کا ارتکاب کرے اسے عبادت کام نہیں دیتی"۔ یہ تمام کہاوتیں عملاً ایک ہی چیز ہیں۔ ظاہر ہوتا ہے کہ ان سب کو ایک ہی چیز پر یقین اور ایمان تھا۔

" تعلیمات مقدسہ (محمدیہ) صرف مغرب میں پھیلیں اور چین میں خاندانِ سوی کے حکمران کائی ہوانگ (۵۸۱ تا ۶۱۰ء)[۱] کے زمانے تک پہنچ نہ سکی۔ لیکن تب سے وہ برابر چین میں رفتہ رفتہ ہر طرف پھیل رہی ہے۔

" جلالت مآب شہنشاہ تیئن پاؤ نے یہ دیکھا کہ اس بڑے عقلمند کی تعلیم خود ہمارے یہاں کے عقلاء کی

سلہ یہ نہ بھلایا جائے کہ جناب رسالت کی ولادت سنہ ۵۷۰ء میں ہوئی تھی اور نبوت سنہ ۶۱۰ء میں حاصل ہوئی۔

تعلیم کے مطابق ہے کیونکہ وہ سب ہی راہ راست میں ہیں۔ اسی لئے اس (شہنشاہ) نے تو ئیس جو کو جو تعمیرات عامہ کا مہتمم تھا، حکم دیا کہ اس مسجد کی تعمیر کا بیڑا اٹھائے تاکہ اس مذہب کے پیروؤں اور ان کے سرگروہ پاتا ایرتی کے لئے سہولت حاصل ہو۔ یہ سرگروہ اپنے مذہب کے امہات کتب کا خوب واقف ہے اور بطور سرگروہ کے اس میں یہ صلاحیت ہے کہ مقدس مذہب کی باقاعدہ عبادت کی امامت کرے اور شہنشاہ کی درازی عمر کے لئے دعا کرتا رہے۔

"اس عمارت کی تعمیر تیئن پاؤ کے سنہ جلوس کے پہلے سال کے تیسرے چاند (مہینے) (۷۴۲ء) میں شروع ہوئی اور اسی سال آٹھویں چاند کی بیسویں کو مکمل ہو گئی۔

"یہ واقعہ آئندہ نسلوں میں بھلایا نہ جانے کے لئے یہ یادداشت ایک کتبے میں کندہ کرائی گئی ہے۔

"المرقوم: موسم خزاں کا خوش نصیب دن، تیئن پاؤ کا پہلا سنہ جلوس۔

"یہ پتھر: وینیؤ منین میں بمقام کوان چنگ[۵] تراشا گیا۔"

جیسا کہ کتبے سے ادعا ہوتا ہے، اسلام چین میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی بننے سے بھی پہلے آگیا تھا۔ مزید یہ کہ "مسجد" کے لئے اور "عرب" کے لئے جو الفاظ اس کتبے میں برتے گئے ہیں وہ کتبے کی تاریخ سے چھ سو سال بعد مروج ہوئے۔ کتبے کے عہد میں دوسرے الفاظ پائے جاتے تھے۔ اس میں کسی کے عرب سے بطور سفیر و مبلغ آنے کا بھی کوئی ذکر نہیں ہے۔ چین کے مورخ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس مسجد کا نام تین وقت بدلا اور کتبہ پر جو نام ہے وہ پہلا نہیں بلکہ تیسرا یعنی اس وقت کا ہے جب ۷۱۵ھ (۱۳۱۵ء) میں اس مسجد کی مرمت عمل میں لائی گئی تھی۔

رسول کریم کی ولادت ۵۷۰ء میں، بعثت ۶۱۰ء میں اور ہجرت ۶۲۲ء میں ہوئی تھی لیکن چینی مورخ اپنے حکمرانوں کے سنہ ہائے جلوس کے حوالے سے ان امور کی تاریخ بیان کرتے ہیں، اس کے مطابق ولادت ۵۴۶ء میں، بعثت ۵۸۶ء میں اور ہجرت ۵۹۹ء میں ہو جاتی ہے۔ گویا پورے چوبیس سال کا فرق پڑ کر واقعات قبل از ہو جاتے ہیں۔

بے شبہ اگر ولادت باسعادت واقعی چوبیس سال پہلے ہوئی ہوتی تو کتبے میں اسلام کی آمد جو ۶۵۱ء سے

۵۔ یہ شہر سیان فو کا نام ہے جو تسی این فالخیر کی روایت میں مروج تھا اور تاریخ کتبہ سے ... سال بعد بدلا گیا تھا۔

کچھ پہلے ہوئی بیان کی گئی ہے وہ کم و بیش قیصر و کسریٰ کے نام تبلیغی خطوط کی ترسیل یعنی سنہ ۶ھ کے مطابق ہو جاتی ہے۔
اس کی وجہ سمجھنی کچھ زیادہ دشوار نہیں اور اتفاق سے ہمارا ماخذ یعنی بروم ہال بھی اسی نتیجے پر پہنچا ہے۔ اصل میں چین میں بھی قمری کبیسہ سال کا رواج ہے اور عموماً ہر تیسرے سال ایک مہینے کا اسی طرح اضافہ کر لیا جاتا ہے جس طرح عرب میں زمانۂ جاہلیت میں رواج تھا۔ (اس کے متعلق تفصیلی معلومات اور سیرت نبویہ پر اس کے اثرات کے لئے جولائی سنہ ۱۹۴۲ء کے رسالہ معارف اعظم گڈھ میں مضمون "عہد نبوی کے عربی ایرانی تعلقات" ملاحظہ ہو سکتا ہے) اگر کوئی شخص خالص قمری اور کبیسہ قمری سال کا فرق جانتا ہو جیسا کہ خود بعض عربی مولفوں مثل واقدی وغیرہ کے ہاں نظر آتا ہے تو چوبیس سال کا فرق آٹھ سو سال کے عرصہ میں پیدا ہو جاتا ہے۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ سیان فو کے کتبے پر جو تاریخ ہے وہ آٹھ سو سال بعد کندہ ہوئی اس زمانے کے مورخوں نے دیکھا کہ سنہ ۶ھ پر اب چونکہ آٹھ نو سو قمری سال گزر چکے ہیں اسلئے چین کے قمری کبیسہ آٹھ نو سو سال پہلے کے حکمران کا نام معلوم کیا اور اپنے زمانے میں جو روایات مروج تھے کہ اسلام سنہ ۶ھ میں چین میں آیا اور اس مسجد کی تعمیر سنہ ۱۲۵ھ میں ہوئی تو اس کا کتبہ حقیقت میں سنہ ۱۲۵ھ میں کندہ نہیں کرایا گیا بلکہ اس کے پورے آٹھ سو سال بعد۔

اگر اسلام کی سنہ ۶ھ میں چین پہنچنے کی کوئی اور تائیدی شہادت حاصل ہو جائے۔ جو تا حال حاصل نہیں ہوئی ہے۔ تو تقویمیات سے نابلد چینی مسلمان مورخوں کی اس غلطی کو ہم آسانی سے نظر انداز کر سکتے ہیں۔[۱] لیکن مشکل یہ ہے کہ چین میں اسلام کی سنہ ۶ھ میں آمد کا ذکر عرب کے سیرت نگاران نبوی کے ہاں

---

[۱] خاص کر اس لئے کہ بروم ہال (ص ۸) میں شہر کینٹن کے ایک کتبے کا ذکر ہے کہ:۔
"چند لوگ ادعا کرتے ہیں کہ قدیم عقلمند (یعنی آنحضرت کا سفیر) سمندری راستے سے شہنشاہ کائی ہوانگ کے دور حکومت (یعنی سنہ ۵۸۱م تا سنہ ۶۰۰م) میں تجارت کے لئے آیا لیکن یہ غلط ہے۔ وہ حقیقتاً چین کو سوئی خاندان کے زمانے میں (یعنی سنہ ۱۱ ولادت نبوی تا سنہ ۶۱۸م) آیا تھا"
جس چیز کو جھٹلایا گیا ہے وہ کبیسہ سال کے فرق سے چند واقفوں کا معلوم ہوتا ہے جسے بھولے بھالے لوگ سمجھ نہ سکے اور خیال کیا کہ اسی طرح سفیر کی آمد بجائے ... حضرت ... ہو جائے گی۔

بالکل نہیں اور ہمارے معلومات کا واحد ماخذ یہی چینی دعوے ہیں اور ان کے دعوے کا واحد ثبوت مذکورۂ بالا کتبہ ہے جس کی ماہیت ہم دیکھ چکے ہیں کہ وہ گیارھویں صدی ہجری کا ہے۔

اب ہم رسول کریم کے ماموں کی چین میں آمد اور وہیں ان کی وفات و مزار کا ذکر کرینگے۔ شہر کینٹن کی ایک نہایت قدیم مسجد کے متعلق روایت چلی آرہی ہے کہ ابتداءً اسے سعد وقاص یعنی حضرت سعد بن ابی وقاص نے تعمیر کیا اور قریب ہی ان کا مزار بھی تاحال موجود ہے۔

چینی مسلمانوں میں سب سے مستند سیرت النبی نان کنگ کے ایک عالم لیوچی کی ہے۔ ان مولف کا نام کیٹی لینن بھی ہوتا ہے۔ یہ سنہ ۱۱۳۴ھ (۱۷۲۱ء) میں لکھی گئی اور بعد میں دس جلدوں میں شائع ہوئی۔ اس میں آغاز اسلام کے متعلق لکھا ہے کہ چین کے بادشاہ نے ایک ڈراونا خواب دیکھا کہ اس کے محل میں بھوت گھس آئے ہیں پھر ایک عمامہ پوش شخص آکر اپنے ہاتھ میں کی ایک کتاب تلاوت کرنے لگا تو بھوت گڑگڑانے لگے مگر تلاوت جاری رہی تو تھوڑی دیر میں وہ خاک کا تودہ ہوگئے۔ تعبیر یہ کی گئی کہ چین پر مصیبت آنیوالی ہے اور اس کا علاج یہی ہے کہ اس عمامہ پوش سے مدد لی جائے۔ مشورے پر یہ طے ہوا کہ ایک چینی سفیر مکہ معظمہ بھیجا جائے۔ جواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے "سعد وقاص" کو تین دیگر ہمراہیوں کے ساتھ بھیجا۔ سعد نے شہنشاہ کی اجازت سے کینٹن میں وہ مسجد تعمیر کی جو اب تک مسجد ذکری کے نام سے موجود ہے۔ چند دن کے بعد وہ حجاز واپس ہوئے اور کوئی بیس سال بعد تا آن دم نازل شدہ قرآن کی نقل ساتھ لے کر مکرر چین آئے اور آنحضرتؐ کے حکم سے چین ہی میں متوطن ہوگئے اور اسی سال جناب رسالت کی مدینۂ منورہ میں وفات ہوگئی۔

قبل اس کے کہ اس روایت کی تنقید کی جائے، دو امور قابلِ ذکر ہیں۔ ایک تو یہ کہ لیوچی کا تذکرہ "سعد وقاص" چین کی جس قدیم ترین تالیف میں ملتا ہے وہ خانوادۂ مِنگ کا عظیم الشان جغرافیہ ہے جو سنہ ۷۷۲ھ (۱۳۷۰ء) میں مرتب ہونا شروع ہوا اور سنہ ۸۶۶ھ (۱۴۶۱ء) میں شائع ہوا۔ اس میں شہر مدینہ کے حالات پر بھی ایک باب ہے اور اس میں لکھا ہے کہ "سعد وقاص صحابی کی چین میں آمد خانوادۂ سوی کے حکمران کائی ہوانگ کے زمانے میں (یعنی [illegible] ۶۰۰ء) چین میں [illegible] ہوئی" دوسری

قابلِ ذکر چیز یہ ہے کہ چینی رسم الخط کے باعث جن شخص کے بطور سفیر و مبلغ چین آنے کا ذکر کیا گیا ہے ان کا نام مختلف کتبوں اور کتابوں میں بدلا ہوا ہے اور وہب ابی کبشہ، وکاسہ (وقاص) وانگ کا سے، سعد ابو وقاص وانگ کے چی، وانگ کوسی، کوسن، سہاپہ (صحابی)، ساہوتی سرتی سرتا وغیرہ وغیرہ پڑھے جاتے ہیں۔

سنہ کی پیچیدگی کو ہم اوپر حل کر چکے ہیں۔ محض وہ اس روایت کے بنیادی امور کو غلط قرار دینے کے لئے کافی نہیں۔ اب رہا نام، سعد بن ابی وقاص اور وہب ابو کبشہ دو قابلِ غور ہیں۔ چینی مسلمان اسے عام طور پر حضرت سعد کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ ابن عبد البر کی الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب ۲۳۱ میں لکھا ہے کہ آنحضرت ان کو اپنا ماموں کہا کرتے تھے۔ یہ فاتحِ ایران تھے۔ ان کی وفات ۵۵ھ میں مدینۂ منورہ میں ہوئی اور وہیں دفن کئے گئے۔ ان کا چین جانا ثابت نہیں۔

ابو کبشہ جن لوگوں کی کنیت تھی ان میں آنحضرت کے نانا وہب بھی شامل ہیں اور استیعاب ۲۰۱ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہب بن الاسود نامی ایک صحابی آنحضرت کے ماموں زاد بھائی گذرے ہیں جن کے مزید حالات معلوم نہیں۔ وہب ابو کبشہ نامی کسی صحابی سے — جو چینی روایت کے مطابق آنحضرت کے ماموں تھے — میں باوجود تلاش واقف نہ ہو سکا۔

حضرت صحابی مذکور کا جو مقبرہ کینٹن میں ہے اس کا فوٹو بھی بروم ہال کی کتاب میں ہے اسے چینی طرز تعمیر سے دور کا بھی تعلق نہیں وہ خالص عربی یا کم از کم عراقی ایرانی وضع کا گنبد ہے کینٹن کی مسجد ذکری میں ایک منارہ بھی اذان کیلئے ہے جو خالص غیر چینی ہونے کا ہے۔ میری حقیر، ناچیز رائے میں یہ خلافت عباسیہ کے زمانے کی چیزیں ہیں۔ اس مقبرے میں کوئی پرانا کتبہ نہیں ہے۔

(۵) یہ عبارت لیون کی اصل فرانسیسی کتاب میں صفحہ پر ہے اور وہ وہاں یوں ہے "اپنی سلطنت کے اچھی طرح مستحکم ہوتے ہی انہوں نے اپنے تجارتی تعلقات کو قابلِ لحاظ وسعت دی اور ہم انہیں دیکھتے ہیں کہ وہ جلد ہی ..." خط کشیدہ لفظ اصل اور ترجمے کے فرق کو ظاہر کریگا۔

(۶) بزرگ بن شہریار الرامہرمزی نے سنہ ۳۴۲ھ کے کچھ ہی بعد اپنی کتاب تالیف کی۔ یہ ناخداؤں اور ملاحوں کی داستانوں پر مشتمل ہے اور سنہ ۲۸۸ھ تا سنہ ۳۴۲ھ تک کے تذکرے اس میں ملتے ہیں۔ اس میں ص ۲ تا ۴ پر کسی ہندی زبان (غالباً سندھی) میں قرآن مجید کے ترجمے اور تفسیر کا ذکر ہے۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے فارسی ترجمۂ سورۂ فاتحہ کے بعد (جس کا ذکر مبسوط سرخسی جلد ۱ صفحہ ۳۷ میں ہے) غالباً یہ پہلا مکمل ترجمہ تھا۔ اس ذکر کا ترجمہ یہاں بے محل نہ ہوگا۔

"ہندوستانی واقعات کے متعلق ہم سے ابو محمد الحسن بن عمرو بن حمویہ بن حرام بن حمویہ النجیرمی نے بصرے میں بیان کیا کہ میں سنہ ۲۸۸ھ میں منصورہ (سندھ کا اسلامی پایۂ تخت) گیا ہوا تھا۔ وہاں بعض معتبر شیوخ نے مجھ سے کہا کہ علاقہ رآ کے راجا نے جو ہندی راجاؤں میں سب سے طاقتور ہے اور جس کی عملداری بالائی قشمیر (کشمیر) اور نشیبی قشمیر (پنجاب) کے مابین ہے، اور جس کا نام مہروک (؟ مہراج) بن رائق ہے سنہ ۲۷۰ھ میں منصورہ کے حاکم عبداللہ بن عمر بن عبدالعزیز کو ایک خط لکھا کہ شریعت اسلامی کی ہندی زبان میں تشریح کا اس کے لئے انتظام کیا جائے۔ حاکم منصورہ عبداللہ نے منصورہ ہی کے ایک آدمی کو بلا بھیجا جو عراقی الاصل اور تیز فہم اور سمجھ دار اور شاعر تھا اور جس کی پرورش ہندی ممالک میں ہوئی تھی اور وہ وہاں کی مختلف زبانوں سے واقف تھا۔ حاکم مذکور نے اس سے رآ کے راجہ کی استدعا بیان کی۔ اس نے ایک نظم لکھی جس میں تمام مطلوبہ چیزوں کا ذکر تھا اور وہی راجہ کے پاس بھیج دی گئی۔ جب وہ راجہ کو سنائی گئی تو اس نے اسے بہت پسند کیا اور حاکم منصورہ سے مراسلت کی کہ اس نظم نویس کو اس کے پاس بھیج دیا جائے۔ وہ وہاں گیا اور تین سال مقیم رہ کر واپس آیا۔ واپسی پر حاکم منصورہ نے اس سے رآ کے راجہ کے حالات پوچھے جو اس نے تفصیل سے بیان کئے اور کہا کہ جب میں وہاں سے چلا ہوں تو اس نے دل اور زبان دونوں سے اسلام کو قبول کر لیا تھا البتہ حکومت اور ریاست ہاتھ سے چلے جانے کے خوف سے اس کا علانیہ اظہار نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ علاوہ اور واقعات کے

راجانے مجھ سے فرمایش کی کہ اسے قرآن مجید کی تفسیر ہندی زبان میں سناؤں اور میں نے ایسا ہی کیا۔ اور جب سورۂ یٰسین کی اس آیت پر پہنچا کہ: 'اس نے کہا کہ کون ہے جو بوسیدہ ہو چکنے والی ہڈیوں کو زندہ کریگا؟ کہہ کہ ان کو وہی زندہ کریگا جس نے ان کو پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا اور وہ ہر قسم کی پیداکاری سے واقف ہے!' جب میں نے اس آیت کی تفسیر کی تو وہ ایک مرصع زرین جوہر نگار موتیوں سے آراستہ لاقیمت تخت پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے کہا' ذرا پھر دہرانا۔ جب میں نے دہرایا تو وہ اس تخت سے نیچے اتر پڑا اور کھلی زمین پر آیا جہاں چھڑکاؤ ہو کر مٹی گیلی تھی۔ وہاں وہ اپنا گال زمین پر رکھ کر اتنا رویا کہ اس کا چہرا کیچڑ سے لت پت ہو گیا۔ پھر اس نے مجھ سے کہا کہ یہی رب معبود اور اوّلِ قدیم ہے جس جیسا کوئی اور نہیں۔ پھر اس نے اپنے لئے ایک خاص گھر بنایا اور ظاہر کیا کہ وہ اہم معاملات کے لئے اس میں تخلیہ کیا کرنا چاہتا ہے۔ اس میں وہ خفیہ طور سے نماز پڑھا کرتا تھا تاکہ اس سے کوئی واقف ہونے نہ پائے۔ اور یہ کہ اس نے تین دفعہ کر کے مجھے چھ سو سیر سونا انعام دیا۔"

اس کتاب میں بہ کثرت دیگر دلچسپ تمدنی و قانونیاتی وغیرہ واقعات بھی ہندوستان کے متعلق ہیں۔

بزرگ بن شہریار سے بھی پہلے کی بعض عربی تالیفیں جن میں ہند کے حالات ہیں' اب دستیاب ہو رہی ہیں۔[ف] ان میں شاید سب سے قدیم محمدؐ بن حبیب (فوت ۲۴۵ھ) کی کتاب المحبّر ہے جس میں عرب کے بعض میلوں میں اسلام سے بھی پہلے ہندی تاجروں کی آمد کا ذکر ہے۔ دوسرا مولف ابن خرداذبہ تقریباً سنہ ۲۳۰ھ کا ہے جس کی جغرافیہ کتاب المسالک والممالک میں ان معلومات کا ذکر ہے جو بطور افسر ڈاک خانۂ بغداد اسے سندھ وغیرہ کے متعلق حاصل تھے۔ سلیمان تاجر کا ایک گمنام سفرنامۂ ہندوستان و چین "سلسلۃ التواریخ" کے نام سے ۱۸۱۱ء میں پارس میں چھپا۔ اندرونی شہادت سے معلوم ہوتا ہے کہ سلیمان تاجر کا زمانہ تقریباً ۲۳۷ھ کا ہے۔ اس کتاب کا ضمیمہ یا تکملہ ابو زید الحسن السیرافی (زمانہ تقریباً ۳۰۴ھ) نے لکھا ہے۔ ان دونوں کتابوں نیز بزرگ بن شہریار کی کتاب سے ہند کے متعلق معلومات کی خاص تفصیلی تحلیل مولانا سلیمان ندوی کی اردو کتاب

ف اس مضمون کا پہلا حصہ [illegible] ڈاکٹر [illegible] کا انگریزی مقالہ [illegible] جغرافیہ نویسوں کی معلومات" چھپ کر آیا۔

"عرب و ہند کے تعلقات" میں ہے۔ اسی طرح مسعودی، اصطخری، ابن حوقل، بشاری مقدسی، البیرونی، اور ابن بطوطہ کے معلومات بھی، اسی لئے ان کی مزید تفصیل یہاں غیر ضروری ہے۔ ابو دلف مسعر بن المہلہل الینبوعی کا سفرنامۂ ہند چوتھی صدی ہجری کے نصف اول سے تعلق رکھتا ہے اس کا ایک ٹکڑا مولانا سلیمان ندوی کے بیان کے مطابق برلن میں چھپا ہے مگر انہیں کی طرح میں بھی اس کو دیکھنے سے محروم رہا ہوں۔ ایک حالیہ اطلاع ہے کہ مشہد کے کتب خانے میں اس کا مکمل نسخہ دستیاب ہو گیا ہے۔ الہمدانی (فوت ۳۳۴ھ) کی دس جلدوں والی جغرافیا کتاب "الاکلیل" تا حال پوری نہیں چھپی ہے۔ معلوم نہیں اس میں ہند کا کیا کیا ذکر ہے۔

(۷) اس سے غالباً سنہ ۱۹۰۶ء مراد ہے۔ اس کے جون نمبر سے "ملیبار کے ماپلے" کے عنوان سے اے ایس ویدیا ناتھ ایر کا مضمون چھپنا شروع ہوا ہے۔

(۸) یہاں وہ باب ختم ہوتا ہے جو "سواحل ہند پر اسلامی آبادی کا پہلا دور" کہا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں اتنا اور اضافہ کر دینا چاہئیے کہ بلاذری کی فتوح البلدان کے مطابق ہندوستان پر سب سے پہلا عربی حملہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں ۱۵ھ میں تھانہ (بمبئی) اور بھروچ پر پھر دیبل (قریب کراچی) پر ہوا۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے زمانے میں بھی مختلف کارروائیوں کا پتہ چلتا ہے۔ پھر حضرت معاویہ پھر یزید کے دور حکومت میں، آخر حجاج بن یوسف کے زمانے میں لنکا سے آنے والے عربوں کے سندھ کے سمندروں میں لٹنے کے باعث محمدؐ بن قاسم کا حملہ ہوا۔ ان ابتدائی حالات کی خاصی تفصیل قدامہ بن جعفر کی کتاب الخراج کے اس واحد ٹکڑے میں ہے جو استانبول کے کتب خانہ کوپرولو میں مخطوطے کی صورت میں ہے۔ یہاں ان حوالوں سے زیادہ تفصیل شاید غیر ضروری ہوگی۔

(۹) قدیم شہر ظفار کہتے ہیں کہ موجودہ ظفار کے علاوہ کوئی اور جگہ ہے۔ بہرحال ۱۳۷۵ھ میں موجودہ ظفار سے آئے ہوئے متعدد حجاج سے مکہ معظمہ میں دریافت پر پتہ چلا کہ وہاں اب ایسی کوئی قبر نہیں ہے بلکہ وہ سرے سے اس روایت ہی سے بے خبر پائے گئے۔

(۱۰) شالیات اور چالیم ایک ہی چیز ہے اصل میں نام چلیت ہے۔ ملیالم ناموں کے آخر میں

عربی تنوین کے مماثل میم بڑھ جاتا ہے۔ اس کو معرب کرکے شالیات کیا گیا ہے۔ یہ تامال چالیت کہلاتا اور بڑا زرخیز، باغات سے بھرا ہوا مقام ہے اور یہاں کے فاضل شہاب الدین احمد کویا کے ہاں ۱۹۳۷ء میں میں نے ایک نفیس ذخیرہ عربی مخطوطات کا دیکھا ہے۔ یہ دریائے بے پور میں جزیرہ ہے۔[1]

(۱۱) مجھے کولم (واقع کارومنڈل) کی مسجد مالک بن دینار اور ساحل ملیبار کی متعدد مساجد مالک بن دینار کے دیکھنے کا ۱۹۳۷ء میں دوسری مرتبہ موقع ملا۔ میں تعمیریات اور مہندسی سے نابلد ہوں لیکن مجھے یہ سب مساجد ایک ہی نمونے نقشے کی معلوم ہوئیں بلکہ یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ ملیبار کی عام مسجدوں کا نمونہ مساجد مالک بن دینار سے بالکل الگ ہے۔ ملیبار کی ان مسجدوں کے ساتھ جو قبرستان ہیں وہاں بہت سے پرانے کتبے بھی نظر آئے لیکن وقت کی کمی کے باعث ان پر جو صرف چند منٹ صرف کئے جا سکے، وہ ان مٹے گھسے ہوئے الفاظ کو پڑھنے کے لئے قطعاً ناکافی ہیں۔ البتہ مقامی طور پر ان پرانی قبروں میں کسی صحابہ و تابعین کی طرف منسوب کوئی چیز سننے میں نہیں آئی۔ مزید یہ کہ اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا تو بھٹکل میں بھی (جو منگلور اور گوا کے مابین ایک بندرگاہ ہے) ایک مسجد مالک بن دینار ہے۔ یہ بظاہر ایک خالص عربی آبادی ہے کیونکہ شہر میں صرف مسلمان ہیں، غیر مسلم ایک بھی نہیں اور آبادی کے آدابِ مجلس بھی خالص عربی ہیں جو کہیں اور ہند میں دیکھنے میں نہیں آتے۔ ملیبار کی طرح شہر بھٹکل میں (جو شمال کنڑا میں ہے) شافعی مذہب عام ہے۔

(۱۲) مولانا محمد غوث مرحوم مدرس مدرسۂ دینیات سرکار عالی حیدرآباد نے ۲۴ ستمبر ۱۹۳۱ء کے روزنامہ صحیفہ حیدرآباد میں جو مضمون شایع کیا اس میں اس کتبے کی عبارت یوں پڑھی ہے :—

اسمعیل بن
مالک ۱۰۹
بن دینار

اور اسی کا حوالہ جامعۂ پاریس کے کلیۂ علوم اسلامیہ کے رسالے R.E.I. بابتہ ۱۹۳۹ء میں

---

[1] چالیم اصل میں جزیرہ چالیت کے محاذی سابقہ ریلوے اسٹیشن کا نام تھا۔ فی الحال تامل چالیم کہلاتا ہے۔

صفحہ ۱۰ پر آیا ہے اور وہاں مضمون نگار نے "سنہ ۹۱۰ھ (۹۰۲ھ)" لکھا ہے۔ حال میں اس کتبے کی پشت پر محمد غوث صاحب مرحوم کی مذکورہ قرادت ہی کندہ کرادی گئی ہے جو نہایت بدخط ہے۔ خوف ہے کہ چند روز بعد کہیں اسی کو اصل کتبہ نہ سمجھ لیا جانے لگا۔ اصل کتبہ دوسرے رُخ پر بالکل مٹ چکا ہے اور گار کے جیسے کالے پتھر پر ہے۔

(۱۴) NAUTA ایک خاص لاطینی لفظ ہے جس کے معنے ملاح کے ہیں۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے شام میں حضرت معاویہؓ وغیرہ کے زمانے میں جب عربوں نے جہازرانی اور جہاز سازی سے دلچپی لی تو یہ لفظ عربی میں آ گھسا اور خلفا ہی کے زمانے میں بحر ہند تک مسلمانوں نے اسے لا پہنچایا۔

نوایت کے متعلق کچھ بحث عبدالجبار ملکاپوری کی تاریخ دکن میں بھی ہے۔

مگران کے متعلق عبدالجبار ملکاپوری کی تاریخ دکن "محبوب الوطن" صفحہ پر لکھا ہے کہ "باعانت باد موافق و مخالف مختلف بنادر میں پہنچے۔ ہنود اس نئی قوم کو دیکھکر اترتے میں مانع ہوے۔ آخر میں نہایت عاجزی والتجا کرنے کے بعد عہد و پیمان لے کر اترنے کی اجازت ملی۔ اولاً انہیں بنادر میں قول و اقرارنامہ دے کے فروکش ہوئے۔ اقرارنامہ اس بات کا تھا کہ ہنود کی طرزِ روش میں رہیں اور لباس بھی اسی دیس کا اختیار کریں۔ غربائے اسلام نے بامر لاچاری' بمصداق ضرب المثل جیسا دیس ویسا بھیس' ہنود کا لباس اختیار کیا اور اہل اصنام کے ساتھ مل جل کر شیر و شکر کی طرح رہنے لگے اور مقتضائے حال کے موافق ہر ایک نے ایک پیشہ و حرفہ اختیار کیا اور کمال ہوشیاری سے زندگی بسر کرتے تھے اور اسلامی شعار نہایت احتیاط سے ادا کرتے تھے' اذاں و قرارت و قرآن اس طرح پڑھتے تھے کہ کوئی فرد ہنود نہ سُننے۔"

بہتر سلوک بعد کے زمانے کی چیز ہوگی جب مسلمان مفید رعایا اور راجاؤں کے مددگار ثابت ہوئے اور ان کی تجارت سے راجاؤں کی آمدنی بڑھ گئی۔

خاندانِ والاجاہی کی حکومت کا خاتمہ

یہ مقالہ انڈین ہسٹری کانگریس میں جو بمقام بلدہ حیدرآباد منعقد ہوئی تھی سُنایا گیا تھا

از محمد غوث صاحب ام۔اے

"ہندوستان میں ہم نے اپنے ملک کی بھلائی کے واسطے انگلش حکومت قایم کی، ہندوستان میں انگلش حکومت قایم ہونے میں ہم اور وہ مثل قینچی کے دو پلڑوں کے شریک تھے، کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ان دونوں میں کس نے زیادہ کام کیا ہے"

یہ الفاظ سرسید نے ایک مرتبہ اپنی ایک تقریر میں کہے تھے اور ان پُر از حقیقت الفاظ کا اصلی مصداق کسی جگہ نظر آتا ہے تو وہ قطعہ کرناٹک ہے۔ خاندان والا جاہی نے انگلستان کے ایک حلیف اور ایک سچے دوست کی حیثیت میں وہ سب کچھ کیا جو حلیفی اور دوستی کا مقتضیٰ ہے۔

جن اصحاب نے کرناٹک کی تاریخ کی فارسی کتابیں پڑھی ہیں ان پر یہ حقیقت آشکارا ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی مدراس میں ابھی صرف تاجرانہ کاروبار کے نشیب و فراز سے دوچار تھی، کہ فرانسیسی حکمت عملی کے ایک استاد دوپلے نے انگریزی تاجروں کو مدراس سے بے دخل کر دیا، محض کمپنی کی درد بھری التجاؤں پر اس وقت کے حاکم صوبہ کرناٹک نواب انورالدین خان شہید نے جن کا مستقر حکومت ارکاٹ تھا، فرانسیسی کارپردازان کی قرار واقعی تنبیہ کی اور یکے بعد دیگرے اپنے فرزندوں نواب محمد محفوظ خان اور نواب محمد علی خان والاجاہ کو فرانسیسی فوج سے مقابلہ کے لئے روانہ کیا اور بالآخر مدراس کو فرانسیسی اقتدار سے آزاد کرا کے پھر انگریزی کمپنی کے سپرد کر دیا،[1] نواب انورالدین خان کی شہادت کے بعد فرانسیسیوں نے انگریزی کمپنی اور اس کے اثر کا نام و نشان مٹا دینا چاہا، اس نازک وقت میں نواب محمد علی خان والا جاہ نے اپنی قوت کا جو مظاہرہ کیا اس سے فرانسیسی اقتدار کی کمر ٹوٹ گئی، اسی زمانہ میں مدراس کے انگریزی تاجروں کی کمپنی آہستہ آہستہ زینہ

۱؎ تزک والاجاہی، مخطوطہ کتب خانہ سعیدیہ

اجارہ داری اور جاگیرداری کے مراتب طے کرتی جارہی تھی[1]، نواب والا جاہ نے متعدد مواضع الیسٹ انڈیا کمپنی کے سپرد کئے چنانچہ میلاپور کی سپردگی کے وقت جو سند دی گئی اس کا اقتباس یہ ہے۔

"مرقوم غرہ شہر ذی قعدہ ۱۱۶۲ھ آنکہ دیں والا بندر میلاپور تعلقہ کرناٹک پایان گھاٹ صوبہ فرخندہ بنیاد حیدر آباد بشرط رفاقت و فدویت کہ ہرگاہ برائے کارہائے سرکار طلب داشتہ شود باجمعیت وسرانجام خود بحضور رسیدہ شرائط رفاقت بجا آرند سپرد انگریزان چناپٹن و دیونام پٹن حسب الضمن مقرر گشتہ باید کہ بخاطر جمع در فدویت و اطاعت سرکار حاضر و سرگرم باشند[2]۔

جب کونٹ لالی نے دوبارہ مدراس کا محاصرہ کیا تو اس خوف و خطر سے مملو وقت میں خود نواب والا جاہ نے فوج کی کمانڈ کی، رسد اور مال کو بے دریغ مہیا کیا گیا، وندی واش کے تاریخی معرکہ میں اور پھر پانڈی چری کو فتح کرکے فرانسیسی امنگوں کو ہندوستان میں ہمیشہ کے لئے ختم کر دینے میں بھی نواب والا جاہ نے ہی فوج کی قیادت کی، کرناٹک کے مورخوں کا یہ دعویٰ ہے کہ خود بنگالہ میں بھی کلایو کے ساتھ نواب والا جاہ کی نئی تربیت یافتہ فوج نظر آرہی تھی،[3] اس سے قطع نظر سلطنت آصفیہ کے ساتھ مشہور آفاق تاریخی دوستی کی ابتدا کے وقت سفراء انگریزی کے پشت پناہ نواب والا جاہ ہی تھے[4]۔ غرض برطانیہ کے کنگ اور کرناٹک کے ناظم میں بالراست روابط قایم ہوئے جس کی نظیر اس وقت طول و عرض ہندوستان میں کسی اور جگہ موجود نہیں تھی اور توزک والاجاہی کے الفاظ میں

"سررشتہ وداد و اتحاد فی مابین حضرت اعلیٰ (نواب والا جاہ) و ہر دو بادشاہ انگلانڈ یعنی جارج ثانی و ثالث بآن مرتبہ محکم گردید و رابطہ دوستی طرفین بآن حد رسید کہ بہ بیان برادری انجامید۔"

توزک والاجاہی میں ایک دوسرے مقام پر لکھا ہے کہ

---

[1] ملاحظہ ہوں توزک والاجاہی، تعمر والاجاہی، تحفۃ الاخبار۔............ [2] کتب خانہ سعیدیہ میں اسکی نقل موجود ہے۔ [3] توزک والاجاہی و تحفۃ الاخبار [4] تعمر والاجاہی۔

"قوم انگریز مجدداً از وقوع اعانت وقت مشکل ممنون و مشکور و متفق و یکدل با حضرت اعلیٰ گردیدہ چنانچہ تاحال . . . . اتحاد و ارتباط حضرت اعلیٰ قوم انگریز جاریست . . . . . . چنانچہ دو بادشاہ عزیزہ انگلانڈ ملقب بجارج دویم و سیوم . . . . نامہ ہائے موافقت با لقاب برادر بحضرت اعلیٰ باین مضمون فرستادند کہ تا قیام سلطنت انگلانڈ در اولاد خود ریاست کرناٹک بحضرت اعلیٰ بطنا بعد بطن قائم و برقرار و مسند و تخت ہر دو دولت تا سلسلہ اولاد طرفین از محبت و الفت جانبین باقی و پائیدار خواہد بود"

۱۱۶۲ھ سے ۱۱۷۴ھ تک کا زمانہ وہ ہے جب کہ نواب والاجاہ نے ایک طرف چنداصاحب وغیرہ سے نبرد آزمائی کر کے کرناٹک میں اپنی حکمرانی کی بنیاد مضبوط کی تو دوسری طرف انگریزوں کی تائید و اعانت میں حق رفاقت پوری طرح ادا کیا، اس پورے زمانہ کی روئداد سنانے کا اس وقت کوئی موقع نہیں ہے بہرحال نواب والاجاہ اس وقت انگریزی دوستی کا دم بھرتے اور انگریزان سے اپنی کاربراری کا موقع ڈھونڈتے رہتے تھے، اس زمانہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے کارپردازوں کی جانب سے جو عرائض نواب والاجاہ کی خدمت میں گزرانے جاتے تھے اور جو اقرار و عہد کیا جاتا تھا اس کے چند نمونے اس موقع پر پیش کرنا برمحل ہے۔

گورنر سانڈرس نے ربیع الاول ۱۱۶۴ھ کو لکھا کہ:۔

"ما . . . . از سرکار جاگیر یافتیم کہ در کارہائے سرکار معاونت بعمل آریم لہٰذا در ہمہ وقت بہ حتی المقدور مراتب اعانت بعمل خواہیم آورد"

۲۱ رمضان ۱۱۶۴ھ کو گورنر چینا پٹن بہ اجلاس کونسل نے حسب ذیل تحریر روانہ کی:۔

"برادر صاحب نیز روشن خواہد بود کہ کمترین در ہمہ اوقات لوازم اخلاص مندی در کار آن صاحب بہ تقدیم رسانیدہ۔ فی الحقیقت فتح صاحب فتح خودی داند و شکست ہم بدستور فاوانہ یقین تصور فرمایند کہ حتی المقدور استحکام کارہائے قصور نخواہد کرد۔ بعد شہد شدن

نواب ناصر جنگ آن صاحب بخیریت بمکان ترچناپلی رسیده اند۔ ازاین معنی بسیار خوش وقت شده بمجرد رسیدن خط اول . . . . خوبی ہائے آن صاحب و ہم بنا بر اظہار وفاداری انگریزیان . . . . سوارہا ان بمعہ سامان لشکر گی مشرکوپ برائے کمک آن صاحب روانہ ساختیم"

مسٹر سانڈرسن گورنر مدراس نے ۲۴ شعبان ۱۱۶۷ھ مطابق ۲۷ جون ۱۷۵۴ء کو لکھا کہ :—

"در خاطر مبارک آن صاحب ثابت باشد کہ نیاز مند شریک امور سرکار است۔ بغیر از استرضائے آن صاحب ہیچ کار بہ عمل خواہد نہ آورد"

مسٹر پیگٹ گورنر مدراس نے ۱۴ ذی قعدہ ۱۱۶۹ھ مطابق ۵ اگست ۱۷۵۹ء کو لکھا کہ :—

" انگریزان ہمیشہ بہ خبر داری پرداختہ و خواہند پرداخت کہ استحکام حکومت سامی را بہ پایہ قائمے تا بحدیکہ تواند محکم سازند"

مسٹر پیگٹ گورنر مدراس نے ۱۱ ذی حجہ ۱۱۷۲ھ مطابق ۵ اگست ۱۷۵۹ء کو لکھا کہ :—

"آرزو و خوشی این جانب این است کہ آن صاحب بوجہ احسن بر مسند تحکم و تحمل و تفاخر بدستور عمل والد خود قائم شدہ ملک پایان گھاٹ را تمام و کمال متصرف باشند و اہل کمپنی بہ قسمیکہ در سایۂ حکام پیشین پیشہ تجارت با فیئت جاری می داشتند در سایہ عاطفت آن صاحب ہم اجرا دارند"

۴ ذی قعدہ ۱۱۷۳ھ مطابق ۲۴ جون ۱۷۶۰ء کو گورنر مدراس با جلاس کونسل نے لکھا کہ :—

"مرقوم بود کہ اہل کمپنی بہ مستاجران سرکار . . . . . . بہ قلعہ داران و پالیگاران رو ننماید و در جواب آن این است کہ ایں را بخوشی دل قبول دارم و بہ ہیچ وجہ بالعکس منفعت سرکار کسے را روا نہ خواہم داد بہ حمایت نخواہم پرداخت مرقوم بود کہ بتمام سرداران انگریز کہ در قلاع ہستند تاکیدات ابلاغ باید کہ حکام ہائے ملک و قضایائے سکنہ مداخلت نہ کنند در جواب آن این کہ ایں امر بخوشی دل قبول دارم و بموجب ایمائے آن صاحب تاکیدات ابلاغ خواہد یافت

مرقوم بود کہ موافق درخواست نائب سرکار از اہل کمپنی مراتب معاونت مستاجران بطور رسد
و در کمپنی بہ تعلقداران سرکار سرکارے تقرر نہ گردد۔ در جواب آں ایں است کہ اہل کمپنی بہ حسب
اقتضائے کار موافق گفتہ نائب سرکار مدد و معاونت بہ عمل خواہند آورد و متعلقداران سرکار
را در کمپنی کار نخواہد داد۔ مرقوم بود کہ آئندہ سوال و جواب با نواب صلابت جنگ بہادر و نظام علی خاں
و دیگر اعیان بہ تجویز آں صاحب بہ عمل آئند در جواب ایں کہ بہ فضل الٰہی فی مابین آں
صاحب و اہل کمپنی ہیچ جدائی متصور نیست تمامی امورات ملک و سوال جواب با نواب
صلابت جنگ و نظام علی خان بہادر وغیرہ . . . . بصلاح آں صاحب
بہ عمل خواہد کہ صلاح سامی را بہ صلاح دیگراں مقدم می داند "

اقتباس خط گورنر پیکٹ و کونسل بنام نواب بیگم شائستہ وہم ذی قعدہ ۱۱۷۳ھ مطابق غرۂ
جولائی ۱۷۶۰ء

" اہل کمپنی کار ہائے سرکار را موافق دل خواہ نواب صاحب بخوشی تمام قبول نمودند۔
رونق امورات و متابعت بندگان نواب صاحب از دل و جان بخوشی می خواہند۔
اہل کمپنی را در کار ہائے ملکی اصلا و خلی نیست و نخواہند کرد و بہ عنایت ایزدی
ریاست تمام کرناٹک بنام نواب صاحب و اولاد ایشاں مستحکم و مضبوط تا قیام کوٹھی انگریز
در ملک ہند و دکن و بنگالہ صورت قیام خواہد داشت اہل کمپنی در متابعت و امداد
کار ہائے کرناٹک ساعی و سرگرم ہستند و دوست سرکار دوست و دشمنان سرکار را دشمن
تصور نمودہ اند و می نمایند و تمامی اہل کونسل اقرار نامہ ایں معنی نوشتہ دادہ اند " [5]

عہود و مواثیق اور تدبیر فرزانگی کے جو مراتب کرناٹک کی سرزمین میں طے ہوئے وہ یکسر ایک

---

[5] یہ تمام اقتباسات ان کاغذات سے ماخوذ ہیں جو کتب خانۂ سعیدیہ میں افراد نقول فقرات
گورنروں کے نام سے موجود ہیں۔

داستان عبرت خیز ہے، ایک قطعۂ کرناٹک پر کیا موقوف ہے؟ ارض ہندوستان میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک اس زمانہ میں فتنوں نے سر اٹھایا تھا۔ ارباب ہمت کی ہوس اقتدار باہمی جنگ و جدل اور دغا و فریب کی شرمناک صورت اختیار کرلیتی تھی، باہمی نزاعوں کا بول بالا تھا قحط الرجال کی جو شکایت شاہ خلد مکان اورنگ زیب کے زمانہ میں شروع ہوئی تھی وہ اب عالمگیر ہوچکی تھی، پس پردہ جو طوفان قیامت ڈھانا چاہتا تھا اس کا احساس کسی کو نہ تھا، خودسری کے تخیل نے کچھ اس طرح تسلط حاصل کرلیا تھا کہ ہر طرف اس کی کارفرمائی تھی۔ باہم دیگر جھگڑنے والے مدعیان حکومت کو اقوام مغرب سے مدد لینے کا خیال پیدا ہوا، ان مدد لینے والوں نے خیال نہ کیا کہ غیر ملکی اور کرایہ کی فوج مدد دیتے دیتے جب یہ دیکھیگی کہ اب اس کی قوت بادشاہ گری کرسکتی ہے تو فوراً وہ موقع کو اپنے موافق بنا لینے میں کچھ پس و پیش نہ کریگی جیسے کہ عباسی دور خلافت میں غلامان ترک نے مثال قایم کی تھی، کوئی شبہ نہیں کہ اس وقت بھی بعض بقیۃ السلف مشرقی ارباب دانش و بینش حالات کی نزاکت سے سمجھے جاتے تھے۔ لیکن ان کے ہاتھ اس قدر قوی نہیں تھے کہ آنیوالے طوفان کو روک دیتے۔ اسی زمانہ میں یا زمانۂ مابعد میں طول و عرض ہندوستان میں لوگوں نے کئی عبرت انگیز مناظر دیکھے۔ کرناٹک میں جو منظر نظر آیا اس کی روداد یہ ہے۔

۲۲[1] صفر ۱۲۱۶ھ مطابق ۵ جولائی ۱۸۰۱ء کو نواب والاجاہ کے فرزند اور جانشین نواب عمدۃ الامرا حالت نزع میں مبتلا ہوئے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج ہم توپوں ۵۰۰ سے زیادہ جوانان بارکس ۴۰۰ سوار اور ترپ سواروں کے ساتھ نواب صاحب کے سکونتی باغ واقع چیپاک[2] میں کرنل میکلین کی ماتحتی میں داخل ہوئی اور باغ کے دروازوں پر اپنے پہرے قائم کردیئے۔ ۳۰ ربیع الاول ۱۲۱۶ھ کو ٹھیک ۱۰ بجے نواب عمدۃ الامرا نے آخری سانس لی اور ساتھ ہی گورنر مدراس کی جانب سے مسٹر ویب چیف سکریٹری

---

[1] ان واقعات کی تفصیل کیلئے ملاحظہ ہوں تحفۃ الاخبار و سوانح ممتاز جس کا انگریزی ترجمہ ابھی حال میں مدراس یونیورسٹی نے شائع کیا ہے [2] اس مکان اور باغ میں اب گورنمنٹ کا ریونیو بورڈ بارش منٹ قایم ہے۔

اور کرنل کلوس حاضر ہوئے۔ اور محمد تقی علی خان بہادر بہرام جنگ اور محمد نجیب خان بہادر سالار جنگ اور نواب عمدۃ الامرا کے پرتگیزی دیوان کرنل بارڈ سے کہا کہ اگر نواب صاحب نے کچھ وصیت کی ہے تو ظاہر کی جائے نواب صاحب کے عہدہ داروں نے جواب دیا کہ تحریری[۵] وصیت نامہ موجود ہے جس کو نواب صاحب نے اپنے فرزند نواب تاج الامرا ولیعہد کے تفویض کیا ہے بعد ایام غم اس کے مطابق عمل کیا جائے گا۔ دونوں انگریزی عہدہ داروں نے مجبور کیا کہ اسی وقت وصیت نامہ دکھایا جائے۔ ان کے اصرار پر وصیت نامہ دکھایا گیا۔ دونوں انگریزی عہدہ داروں نے مارکوئیس ولزلی گورنر جنرل کے ایک خط کی نقل دکھائی جو انہوں نے نواب عمدۃ الامرا مرحوم کے نام تحریر کیا تھا اور یہ بات ظاہر کی کہ مارکوئیس ولزلی کو اس امر کا علم ہونے کے بعد کہ نواب عمدۃ الامرا نے ٹیپو سلطان کے ساتھ مراسلت کی تھی یہ حکم دیا تھا کہ یہ خط نواب صاحب کو دکھا کر ملک کرناٹک ضبط کرلیا جائے۔ جس وقت مارکوئیس ولزلی کا یہ خط آیا نواب صاحب مرحوم کا مزاج علیل تھا۔ اسلئے ہم نے ان کی صحت یابی کا انتظار کیا اب جب کہ ان کا انتقال ہوچکا ہے وہی صورت حال پرنس تاج الامرا کے ساتھ بھی باقی ہے ٹیپو سلطان کے ساتھ مراسلت ثابت ہوجانے کے بعد ریاست کے تمام حقوق سورنٹی (Sovereignty) اور کمپنی کی پناہ جو نواب والاجاہ اور نواب عمدۃ الامرا کو حاصل تھی ختم ہوگئی اور ۱۷۹۲ء کا معاہدہ ٹوٹ گیا۔ اس وجہ سے اہل حکومت ملک کرناٹک ضبط کرینگے۔ لارڈ صاحب اپنی اس مہربانی کی وجہ سے جو ان کو پرنس تاج الامرا کے ساتھ ہے چاہتے ہیں کہ پرنس کرناٹک کی تمام سرزمین کمپنی کو دے دیں اگر پرنس اس طرح عمل کریں تو لارڈ صاحب (گورنر مدراس) ان کی جانشینی کا اعتراف کریں گے اور کچھ حصہ پرنس اور ان کے خاندان کے لئے مقرر کردینگے بہرام جنگ اور سالار جنگ نے جواب دیا کہ نواب عمدۃ الامرا کو ٹیپو سلطان سے دو پشت کی دشمنی تھی نواب عمدۃ الامرا اور نواب والاجاہ کے ساتھ ٹیپو سلطان اور انکے والد نے جو کچھ لڑائی کی اور نقصان پہنچایا وہ سب پر ظاہر ہے لیکن جس وقت مارکوئیس کارنوالس نے خاندان ٹیپو سلطان کو قلعہ میں لا رکھا تو نواب والاجاہ سے ان کی ملاقات کرائی اور سفارش کی اور چند

---

[۵] اصلی وصیت نامہ کتب خانہ سعیدیہ میں محفوظ ہے۔

کہا کہ ان کے ساتھ جو کچھ مراعات کئے جائیں گے ان کو میں یہہ خیال کرونگا کہ میرے ساتھ عمل میں لائے جارہے ہیں۔ اس پر نواب والاجاہ نے ٹیپو سلطان کے فرزندوں کے ساتھ محبت آمیز برتاؤ کیا اور پھر مارکوئیس کارنوالس نے یہ بھی کہا کہ ٹیپو سلطان کے ساتھ کمپنی نے دوستی اور مصالحت کرلی ہے اس لئے نواب والاجاہ کو بھی اب ٹیپو سلطان کے ساتھ دوستانہ مراسلت کا سلسلہ جاری رکھنا ضرور ہے۔ اس بناء پر نواب والاجاہ اور ان کے بعد نواب عمدۃ الامرا نے ٹیپو سلطان کے ساتھ دوستی کا سلسلہ جاری اور قایم رکھا جو خطوط ٹیپو سلطان کو بھیجے جاتے تھے بروقت ان کے نقول گورنر صاحب مدراس کے پاس بھیجے جاتے تھے۔ وہ تمام خطوط یا تو تعزیت کے ہیں یا تہنیت کے۔ دونوں انگریزی عہدہ داروں نے ایک خط کی نقل دکھائی اس کے دیکھنے کے بعد سالار جنگ اور بہرام جنگ نے کہا کہ یہہ خط شادی کی مبارکباد کا ہے اور ضرور اسکی نقل گورنر کے دفتر میں موجود ہوگی۔ اس خط سے کیا قباحت لازم آتی ہے۔ اس کے بعد دونوں انگریزوں نے ایک فرد کی نقل دکھائی اور کہا کہ اصل فرد ٹیپو سلطان کے دفتر سے برآمد ہوئی جس میں نواب والاجاہ اور نواب عمدۃ الامرا کے رموز درج تھے اور اسکے بموجب کمپنی کی دشمنی میں مراسلت ہوا کرتی تھی۔ سالار جنگ اور بہرام جنگ نے کہا کہ اگر اصل فرد نواب والاجاہ یا نواب عمدۃ الامرا یا ان کے کسی منشی کے ہاتھ کی ہو تو دکھائی جائے۔ یہہ بات قسم کھاکر کہی جاسکتی ہے کہ دونوں نواب صاحبوں نے کمپنی کے خلاف کوئی مراسلت ٹیپو سلطان کے ساتھ نہیں کی۔ ہندوستان کے رئیسوں سے ان کی مراسلت کمپنی کے ذریعہ سے ہوا کرتی تھی۔ اگر یہہ فرد ٹیپو سلطان کے دفتر سے برآمد ہوئی ہے تو ممکن ہے کہ دغابازوں نے کمپنی کی دوستی میں خلل ڈالنے کیلئے کوئی سازش کی ہوگی۔ مسٹر ویب اور کرنل کلوس نے کہا کہ ہم عدالت کے محکمہ میں نہیں آئے اصل کاغذ دکھانے یا قسم لینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس وقت صرف دو باتیں کہنی ہیں، یا تو دوستانہ طریقہ سے تمام ملک کرناٹک کمپنی کو دے دیا جائے، اس وقت لارڈ صاحب اپنی مہربانی سے پرنس کی جانشینی کا اعتراف کرینگے اور ان کے لئے اور ان کے خاندان کیلئے کوئی چیز مقرر کردینگے، اگر اس بات کو قبول نہ کیا جائے تو لارڈ صاحب جو حکم

کے تابع ہیں اس لئے وہ تمام ملک ضبط کرلیں گے اور اس وقت انجام نیک نہ ہوگا، اس کا
جواب اسی وقت دیا جائے، بہرام جنگ اور سالار جنگ نے کہا کہ نواب صاحب کی میت بلا
تجہیز و تکفین پڑی ہوئی ہے اور ہر طرف سے درد و غم کی آواز بلند ہے ہمیں سوال و جواب
کا ہوش و حواس نہیں ہے، اس قدر مہلت مطلوب ہے کہ نواب صاحب کا تابوت روانہ
کردیں اور کل آپ کے سوال کا جواب دیں، بہت بحث و تکرار کے بعد دونوں صاحبوں نے
بات قبول کی اور چلے گئے۔

دوسرے روز دونوں صاحب پھر آئے اور گزشتہ روز کی تقریر کا اعادہ کیا، بہرام جنگ
اور سالار جنگ نے کہا کہ تمام ملک کا کمپنی کو دے دینا ان کے اختیار سے زیادہ ہے، اس بات
کو چھوڑ کر باقی دوستانہ سوال و جواب جس میں کمپنی کے فوائد محفوظ ہوں بیان کئے جائیں حتی المقدور
کمپنی کو خوش کرنے کی کوشش کی جائیگی، اگر تقسیم ملک کا کوئی جدید نقشہ بنایا گیا ہے تو دکھایا جائے۔
دونوں صاحبوں نے کہا کہ جدید نقشہ یہی ہے کہ کرناٹک کی تمام زمین کمپنی کو دے دی جائے،
اس وقت لارڈ صاحب پرنس کی جانشینی کا اعتراف کرینگے، اور ان کے لئے حصہ معین کرینگے۔
بہرام جنگ اور سالار جنگ نے دریافت کیا کہ وہ حصہ کیا چیز ہے، جواب ملا کہ پہلے قبولیت
دی جائے اس کے بعد لارڈ صاحب غور کرینگے، ورنہ ملک ہر طور سے کمپنی ضبط کریگی، پرنس کی جانشینی
کا اعتراف نہ کیا جائیگا اس کے انجام پر نظر ڈالی جائے، اسکے جواب میں یہ بتایا گیا کہ نواب صاحب
گریٹ برٹن کے بادشاہ کمپنی اور قوم انگریز کے قدیم دوست تھے، اور انہوں نے اپنے فرزند
کو اسی دوستی کی پناہ میں چھوڑا ہے، ہم لوگ پوری طرح اس با انصاف قوم سے مطمئن ہیں، لارڈ
صاحب پرنس حال کے لئے ان کے والد کے مقام پر ہیں، ان سے پوری امید ہے کہ پرنس کیساتھ
وہ کسی قسم کی برائی نہ کریں گے، کمپنی کے دونوں عہدہ داروں نے جواب دیا کہ کمپنی کی پناہ، نواب صاحب
کی قدیم دوستی اور ۱۷۹۲ء کا معاہدہ سب ختم ہوگئے، لارڈ صاحب حکم کے مطابق ضرور ملک ضبط
کرلیں گے، اور پرنس کا انجام برا ہوگا، نواب تاج الامرا کے دونوں وکلا نے دریافت کیا کہ کیا

انجام بدیہی ہے کہ ان کا ملک ضبط کر لیا جائیگا اور لارڈ صاحب ان کی جانشینی کا اعتراف نہ کرینگے، دونوں انگریز عہدہ داروں نے کہا کہ اس سے زیادہ بھی ہوگا، ان کا تمام مال ضبط کر لیا جائیگا، پرنس کے وکلاء نے جواب دیا کہ نواب صاحب کے پاس مال کچھ نہیں ہے، مسٹر ڈیبی اور کرنل کلوس نے کہا کہ اس کے سوا برا انجام اور بھی ہے۔

نواب تاج الامرا کے وکلاء نے خود نواب تاج الامرا، ان کے خاندان اور اعلیٰ عہدہ داران ریاست سے رات میں مشورہ کر کے ایک نقشہ اور اپنے حقوق کے متعلق دلائل مرتب کئے تھے، دونوں صاحبان انگریز کو یہ چیزیں دکھائی گئیں۔ ان لوگوں نے دیکھ کر ڈال دیا [illegible] کہا کہ صرف دو باتوں میں ایک بات اختیار کی جائے یا تو کرناٹک کی ساری زمین کمپنی کو دے دی جائے یا خود لارڈ صاحب سارے ملک کو ضبط کر لینگے، اس حالت میں انجام برا ہے، پرنس کے لئے کوئی چیز معین نہ ہوگی، اور نواب صاحب کے سکونتی باغ پر کمپنی کی پناہ باقی نہ رہے گی، قرض خواہان اور عدالت کے لوگ آئینگے اور ان کا جی جو چاہے گا وہ کرینگے، اور پرنس کی حالت اس وقت مثل ایک عام آدمی کے ہو جائیگی، جواب دیا گیا کہ دونوں نوابان سابق اور پرنس جو اپنے والد کے جانشین اور ولی عہد ہیں، بادشاہ معظم گریٹ برٹن اور کمپنی اور وفادار قوم انگریز کے دوست رہے ہیں، ہمیں پرنس کے دوستوں سے خوبی کی امید ہے، تمام ملک کمپنی کو دے کر اگر ہم اپنے آقا کے حقوق برباد کر دیں تو پرنس، ان کے خاندان اور عامۂ خلائق کو ہم کیا جواب دینگے، اگر لارڈ صاحب اپنے اختیار اور حکومت کی بنا پر ملک ضبط کر لیں اور وہ تمام امور جو رحم و انصاف سے دور ہیں عمل میں لائیں تو ہم سے بجز اس کے کہ مثل گدایوں کے انگریزی جھنڈے کے نیچے لڑ کر جب تک کہ ہماری جان ہے جان نثاری کریں اور کیا ہو سکتا ہے، آپ مہربانی فرما کر اس نقشہ کو جو مرتب کیا گیا ہے لارڈ صاحب کو ملاحظہ کرائیں اور ان کی خدمت میں ہماری جانب سے اور صاحب عالم پرنس کی جانب سے ہماری عاجزانہ درخواست پیش کریں، دونوں صاحبوں نے جواب دیا کہ یہ خواہش کبھی منظور نہ ہوگی، سالار جنگ اور بہرام جنگ نے کہا کہ کمپنی کو کوشش کرنے اور اپنی دوستی قائم

رکھنے کے لئے ہم سے جو کچھ ہو سکتا ہے وہ یہی ہے ایک مرتبہ لارڈ صاحب کو اسے دکھلا دیجئے۔ ہم بھی نواب صاحب کے خاندان اور دوسرے عہدہ داروں پر آپ کے بیان کو ظاہر کر کے کل جواب دینگے، بڑی منت سماجت کے بعد دونوں صاحب رخصت ہوئے۔

تیسرے روز دونوں اصحاب پھر آئے اور پھر اپنے مطالبہ پر اصرار کیا، ان سے دریافت کیا گیا کہ جو جدید نقشہ مرتب کیا گیا تھا اسکے دیکھنے کے بعد گورنر صاحب نے کیا کہا، جواب ملا کہ ہم نے پہلے ہی کہدیا ہے کہ یہ نقشہ منظور نہ ہوگا، نواب تاج الامرا کے نائبوں نے اس موقع پر یہ امر واضح کیا کہ ہم نے نواب صاحب کے اہل خاندان اور عہدہ داران ذمہ دار کو جمع کر کے مشورہ کیا اس بات پر اتفاق رائے ہے کہ مرتبہ نقشہ میں جو ملک کمپنی کو دینا تجویز کیا گیا ہے اس سے زیادہ ملک دینا ہمارے اقتدار سے باہر ہے۔ یہ سنکر کمپنی کے دونوں عہدہ داروں نے کہا کہ اب اس صورت میں مزید سوال و جواب کی ضرورت باقی نہیں رہی، ہم پھر نہیں آئینگے، اس کے جواب میں کہا گیا کہ سوال و جواب کو منقطع کرنا منشا نہیں ہے اور مقدور بھر کمپنی کو خوش کرنا پیش نظر ہے، البتہ یہ مطالبہ کہ ملک کرناٹک سارے کا سارا دے دیا جائے یہ مقدور سے زیادہ ہے اور یہ کام ہرگز نہ ہو سکے گا، اس نوبت پر صاحبان انگریز نے اصرار کیا کہ خود نواب تاج الامرا کی خدمت میں ان کو پیش کیا جائے تا کہ ان سے ان کا منشا بالمشافہ دریافت کر لیا جائے، اس خواہش کے جواب میں نواب صاحب کے دونوں وکلا نے بتایا کہ اگر خود پرنس کو سوال و جواب کی طاقت ہوتی تو نواب صاحب مرحوم کی جانب سے ہم لوگ کیوں ایجنٹ اور نائب مقرر ہوتے، اول تو ان کی عمر بالمشافہ ایسے اہم سوال و جواب کی مقتضی نہیں ہے، اسکے علاوہ اپنے شفیق باپ کی جدائی سے وہ بہت ملول ہیں اس لئے راست ان سے گفت و شنید کرنے کو معاف رکھا جائے تو موجب ترحم ہے، دونوں انگریز صاحبوں نے اپنی بات پر اصرار کیا، اور آخر میں کہا کہ بہ لحاظ اس اقتدار کے جو لارڈ صاحب کو حاصل ہے حکم دیا جاتا ہے کہ پرنس کو بلایا جائے، بدقت تمام ایک روز کی مہلت لی گئی، چوتھے روز نواب تاج الامرا کا

مزاج درست نہیں تھا، پانچویں روز سالار جنگ اور بہرام جنگ نے کمپنی کے عہدہ داروں کو طلب کیا اور نواب سے جو غمگین تھے ان کی ملاقات کرائی، دونوں صاحبوں نے اپنے مرکوز خاطر کو ظاہر کیا ترغیب اور تخویف کے دونوں پیرائے اختیار کئے۔ نواب تاج الامراء نے ظاہر کیا کہ میرے نائبوں نے کمپنی کے خوش کرنے کے لئے جو نقشہ میری رضامندی سے طے کیا ہے اس سے زیادہ کے لئے مجھے قدرت نہیں ہے، اس موقع پر دونوں صاحبوں نے گورنر کو ایک چٹھی لکھی، اس کا جواب آنے پر ظاہر کیا کہ لارڈ صاحب اس خیمہ میں جو نواب صاحب کے باغ میں کرنل میکلن کے لئے نصب کیا گیا ہے آگئے ہیں، نواب تاج الامراء کو ان کے پاس چلنا چاہئیے چنانچہ نواب تاج الامراء سالار جنگ اور بہرام جنگ گورنر کے پاس خیمہ میں گئے، تعارف کے بعد گورنر نے دونوں وکلا کو علٰحدہ خیمہ میں بھیجدیا اور خود نواب تاج الامراء سے دیر تک گفتگو کی۔ گورنر کے چلے جانے کے بعد نواب تاج الامراء نے اپنے مشیروں سے بیان کیا کہ وہی حالات پیش آئے جواب تک بہرام جنگ اور ان کے ساتھی سالار جنگ کو پیش آچکے ہیں، گورنر نے کرناٹک کا سارا ملک کمپنی کو دے دینے کی درخواست کی، سوال و جواب سے تنگ آکر میں نے کہا کل تحریر کر کے کہونگا۔

دوسرے روز جو گفتگو کا چھٹا روز تھا مسٹر ویب اور ان کے ساتھی پھر آئے اور نواب صاحب سے ملاقات کی، اور یہ خواہش ظاہر کی کہ گورنر سے ملنا بہتر ہے، نواب تاج الامراء نے ان لوگوں پر واضح کیا کہ میں نے اس معاملہ میں غور و تامل کیا ہے، میری خواہش ہے کہ جہاں تک مجھ سے ممکن ہے کمپنی کو فائدہ پہونچاؤں اور خوش کروں لیکن میرے دونوں مشیروں نے جو نقشہ مرتب کیا ہے اس سے زیادہ ملک دینا میری قدرت سے باہر ہے، اس حالت میں اگر میں لارڈ صاحب کے پاس جاؤں تو اسی امر کو ظاہر کرنے کے سوا کوئی اور صورت نہیں ہے، لارڈ صاحب میرے شفیق باپ کے مقام پر ہیں، مجھے فکر ہے کہ وہ میرے اس جواب سے ناخوش ہوجائینگے اگر مجھے چلنے سے معاف رکھا جائے تو میں ممنون ہونگا، دونوں صاحبان انگریز نے چلنے پر مجبور کیا،

بالآخر نواب تاج الامرا اپنے دونوں مشیروں کے ساتھ خیمہ میں گئے جہاں گورنمنٹ گورنر موجود تھے، انہوں نے نواب صاحب سے تخلیہ میں گفتگو کی ملاقات کے اختتام پر نواب تاج الامرا نے بیان کیا کہ انہوں نے گورنر کو وہی جواب دیا جو دونوں عہدہ داروں کو دیا تھا، گورنر نے نواب صاحب سے کہا کہ آپ اسباب دولت اپنے ہاتھ سے کھو رہے ہیں، آج سے آپ کے ساتھ گفت و شنید منقطع ہو چکی، نواب تاج الامرا نے کہا کہ لارڈ صاحب! آپ میرے بہترین باپ کے مقام پر ہیں، مجھے کوئی خوف نہیں ہے آپ سے شفقت پدری کی توقع ہے۔

نواب عمدۃ الامرا کے انتقال کے ساتویں روز نواب تاج الامرا نے اس مکان کا معائنہ کیا جو نواب والاجاہ کے زمانہ میں دربار کے لئے کام میں لایا جاتا تھا، واپسی کے وقت کرنل میکلین نے کہا کہ سنا ہے کہ آپ لوگوں نے ارادہ کیا ہے کہ پرنس کو مسند پر بٹھائیں اور نذر پیش کریں، جواب میں یہ بات واضح کی گئی کہ مسند نشینی کی رسم خاندان کے دستور کے مطابق نواب عمدۃ الامرا کے انتقال کے تیسرے روز انجام پذیر ہو چکی ہے، نذریں گذر چکی ہیں، البتہ چند ماتحت متصدیوں وغیرہ کی نذریں ہونی ہیں، یہ انتظام کیا گیا ہے کہ کل یا پرسوں یہ لوگ بھی اپنی اپنی نذر دے دیں، کرنل میکلین یہ سنکر گورنر مدراس کے پاس گئے اور یہ کہا کہ اس انتظام پر عمل آوری نہ ہونی چاہیئے۔

اس موقع پر کرنل میکلین نے گورنر مدراس کی جانب سے یہ حکم دیا کہ جہاں جہاں نواب صاحب کے علاقہ کے جوانوں کا پہرہ ہے اس کے بجائے سولجروں کا پہرہ قایم کیا جائے، اس حکم پر نواب صاحب کی جانب سے یہ عذر کیا گیا کہ زنانی ڈیوڑھی پر اور ان مقامات پر جو زنانی ڈیوڑھیوں سے متصل ہیں سولجروں کا پہرہ رکھنا مناسب نہیں ہے، دوسرے مقامات پر اگر گورنر صاحب کا حکم ہے تو مجبوری ہے، کرنل صاحب نے کہا مجھے جو حکم ہے میں ضرور اسکی تعمیل کرونگا اسکے بعد انہوں نے خواہش ظاہر کی کہ سرکاری جوانوں کو جو جا بجا پہرے پر ہیں موقوف کر دیا جائے، نواب صاحب کے عہدہ داروں نے کہا کہ یہ ہو نہیں سکتا۔ باقی زبردستی سے جو چاہے کر لو، کرنل صاحب نے تمام سرکاری جوانوں سے بندوقیں چھین لیں اور ان کو پہرہ سے علحدہ کر کے ہر جگہ سولجروں کے پہرے قایم کر دئے۔

اس انتظام کے بعد کرنل میکلن نواب تاج الامرا کے چچیرے بھائی نواب عبدالعلی خان عظیم اللہ کے پاس گئے اور ان سے سالانہ بارہ لاکھ روپیہ اور پنجم حصہ آمدنی پر معاملات طے کر لئے اور دوسرے روزان کو اپنے خیمہ میں بلوایا اور سٹرویب اور کرنل کلوس سے ان کی ملاقات کرائی۔

بعد ازاں ہر روز ان کی آمد و رفت شروع ہوگئی، نواب تاج الامرا حزن و ملال سے علیل ہو گئے، ان کے یورپین ڈاکٹر کی رائے سے کرنل میکلن نے باغ کے اندر ہوا خوری کی اجازت دی،

نواب عمدۃ الامرا کے انتقال کے دسویں روز کرنل میکلن نے کہا کہ گورنر مدراس کا حکم ہے کہ سولجروں کا گارڈ فتح چوکی پر جو پرنس کی نشست کا مکان ہے مقرر کیا جائے گا، ہر چند عذر کیا گیا لیکن کرنل نے فتح چوکی کے اندر اور باہر سولجروں کا پہرہ بیٹھا دیا، اور دفتر میں جا کر کرنل بارڈ، اور دوسرے عہدہ داروں و متصدیوں کو یہ حکم سنایا کہ تمام لوگ دربار میں آنے سے باز رہیں، سارے دفاتر اور خزانہ پر اپنی مہر کر دی، گویا نواب صاحب تاج الامراء اور ان کے متوسلین پر قیامت قایم ہوگئی، تمام سوال و جواب اور نوشت و خواند موقوف ہوگئی، جو تھوڑا سا روپیہ محلات اور چار پایوں کے اخراجات کے لئے خزانہ میں تھا اس پر بھی مہر توڑا ہوگیا۔

۱۵ ربیع الاول کو کرنل میکلن کے پاس سے ترپ سوار آکے پیام دیا کہ فتح چوکی کا مکان نواب عظیم الدولہ کے لوگوں کو دکھایا جائے، جواب میں نواب تاج الامرا کے عہدہ داروں نے کہا کہ یہ مکان پرنس ولی عہد کا سکونتی ہے اس کو دوسرے کے تفویض کرنے کا خیال نہ کرنا چاہیئے، اس کے بعد پیام آیا کہ ہمایون محل کی کنجی بھیج دی جائے اور یہ مکان عظیم الدولہ کے لوگوں کو دکھایا جائے اسکے جواب میں یہ کہا گیا کہ اس مکان سے نواب والاجاہ کے محلات کے مکانوں میں مد نظر ہوتا ہے اس لئے اس کی کنجی خود ولی عہد کے پاس رہا کرتی ہے، جس مقام پر ناموس کا اندیشہ ہے اس کی کنجی دوسرے کو کس طرح دیجا سکتی ہے، کرنل میکلن نے بہرام جنگ کو طلب کر کے ان سے کہا کہ گورنر مدراس کا حکم ہے کہ اگر کنجی نہ دیجائے تو آپ لوگوں کو بہت تکلیف پہونچیگی، بعد ازاں

بار بار ترپ سوار آکر کنجی کا مطالبہ کرتا رہا، نواب تاج الامراان حالات کو دیکھکر محل میں چلے گئے اوران کے مشیروں نے کرنل میکلن کے اصرار پر ہمایوں محل کی کنجی نواب صاحب سے طلب کرکے بھجوادی، اس کے بعد سرکاری فراشوں پر نگرانی قایم کرکے ہمایون محل اوراسکے بالاخانہ پر بانات کا فرش بچھوایا گیا۔

نواب تاج الامرانے دو کاغذات اپنے حقوق اور کمپنی کے فوائد کے متعلق اپنے یورپین ڈاکٹر کے توسط سے اہل حکومت کے پاس بھیجے لیکن یہ کاغذات واپس کردیئے گئے، ۷ ربیع الاول کو مسٹر ویب وغیرہ کمپنی کے عہدہ دار بڑے دیوان خانہ میں جہاں دربار ہوا کرتا تھا آئے، یہ لوگ جب بالاخانہ پر آئے تو چونکہ زنانہ میں مدنظر ہوتا تھا محل کی ساری خواتین خوف کے مارے کانپنے لگیں۔

۱۸ ربیع الاول کو علمائے مدراس نے فتوٰے دیا کہ نواب عظیم الدولہ جانشین نہیں ہوسکتے اور اہل خاندان نے بھی محضر بھجوایا۔

علمار مدراس کے فتوے[۱] کی نقل حسب ذیل ہے :—

"حکم شرع شریف وعرف قدیم وعادات خلفا، وسلاطین کہ والی شخص پسر وے می شود وچون پدر پسر را والی گرداند، وہمہ اشیا رخود بہ آن پسر دہد آں پسر والی می گردد خواہ آن پسر از بطن بیگم باشد یا غیر، و یا آنکہ والی با وجود بودن پسر غیر را کہ متبنی است یا اجنبی وصی وقایم مقام خود کند، غرض کہ والی ملک اگر احدے را قایم مقام و ولی عہد کند خواہ پسر باشد یا غیر آن ولی عہد والی ملک می گردد واطاعت وے لازم می گردد و بر ہمیں حکم توارث از خلفائے راشدین واقع کہ خلیفہ اول امیر المومنین رضی اللہ عنہ با وجود داشتن پسران امیر المومنین عمرؓ را وصی وجانشین خود فرمودند وامیر المومنین شد۔ وہمہ مومنان در اطاعت وے آمدند، وہم ایں حکم متوارث گشت میان سلاطین کہ بعد خلفاء راشدین بودند واز زمان عبدالملک کہ بادشاہ عرب وعجم بود تا سلطنت بنی عباس ابو منصور وہارون رشید وماموں رشید کہ پسر کنیز بود

---

[۱] اس فتوے کا مسودہ بخط و مہر مولانا عبدالعلی بحرالعلوم فرنگی محل کتب خانہ سعیدیہ میں موجود ہے۔

ہارون بود، از ہمین قبیل سلطنت قایم شد و مستنصر باللہ و متوکل علی اللہ این ہمہ بادشاہان عرب وعجم بودند ہم چنیں سلاطین کہ بعد ایشاں شدند. تا ایں زمان۔ و ہر سلطانے کہ می مرد وصیت می کرد یکے را بہ قیام بہ مقام خود، آن کس خلیفہ وسلطان می شد و ہمہ کسان در اطاعت وے می شدند و کسے کہ از اطاعت وسے خارج می شد حکم بہ حبس وقتل می کردند و بریں بود اتفاق علمائے کرام چنانکہ بر ہمیں دلائل شرعیہ و عادات سلاطین حال وسلاطین سلف وراثت وحقیت جمیع امور حقوق و املاک متعلقہ نواب والاجاہ امیر الہند علیہ الرحمۃ بہ نواب عمدۃ الامرا مغفرت مآب رسید و از مغفرت مآب بہ نواب تاج الامرا بہادر کہ پسر و وارث ووصی و ولی عہد نواب مغفرت مآب است رسید۔ نواب تاج الامرا را ولی عہد خود و جانشین خود ساختند و وارث حقوق مرقوم الصدر نواب تاج الامرا بہادر است مداخلت غیر شرعا و عرفا نمی تواند شد"

اس فتوے پر حسب ذیل علمار کے دستخط تھے۔

مولانا عبدالعلی ملک العلمار بحرالعلوم۔ مولانا غلام حسین خان قاضی العلوی، مولانا سید عبداللہ، مولانا محمود ساوی، مولوی محمد علی، مولوی محمد صادق، مولوی کریم اللہ، مولوی علی الدین احمد، مولوی عبدالرب فرزند ملک العلمار، مولوی محمد باقر

اہل خاندان نے جو محضر[۱] پیش کیا وہ یہ ہے :—

" مایاں کہ مردم نسلی نواب والاجاہ علیہ الرحمہ و نواب عمدۃ الامرا بہادر ایم ظاہر اہل حکومت تجویز جانشین کردن عبدالعلی عرف عظیم الدولہ دارند، از روئے شریعت اہل اسلام بہ ہیچ وجہ حقیت ایں معنی بہ مشارالیہ کہ محروم الارث است نمی رسد۔ امیرالامرا مرحوم ہیچ وصیت در باب فرزندی و وراثت عظیم الدولہ نکردہ بودند۔ بندگان نواب والاجاہ علیہ الرحمۃ نیز ہیچ چیز از متعلقہ امیرالامرا و از حقوق متعلقہ خود بہ مشارالیہ ندادند۔

---

[۱] ۔ اصلی محضر کتب خانہ سعیدیہ میں محفوظ ہے۔

مایان اصلاً از جانشینی مشار الیہ مذکور راضی نیستیم، تحریر فی التاریخ چہاردہم ربیع الاول سنہ ۱۲۱۶ھ اس پر حسب ذیل افراد کے دستخط تھے :-

عبد القادر خان امیر جنگ امیر الدولہ بہادر، اعتماد الملک، محمد عبد اللہ خان اعتماد الدولہ حسام الملک بہادر، انتظام الدولہ نصیر الملک بہادر، افتخار الدولہ بہادر، سلطان النساء بیگم، عمدۃ النساء بیگم رئیس النساء بیگم، عبد الغفار خان بہادر ثابت جنگ، زیب النساء بیگم، اشرف الملک بہادر، اعتضاد الملک بہادر، محمد حسین خان بہادر، رحیم النساء بیگم، خدیجہ بیگم، ہرن بی بی۔

اہل حکومت نے یہ کاغذات واپس کر دیئے۔ انجام کار یہ کہ ۱۹ ربیع الاول کو نواب عظیم اللہ وارث مسند نواب انور الدین خان شہید مقرر کر دیئے گئے اور ان کو نذریں دلوائی گئیں۔ نواب تاج الامراء کے دونوں مشیر سالار جنگ بہادر اور بہرام جنگ بہادر علیحدہ کر دیئے گئے اور ان کو اور دوسرے لوگوں کو باغ سے باہر کر دیا گیا، تا آنکہ نواب تاج الامراء کی ڈیوڑھی پر ایک آدمی بھی باقی نہیں رہا[1] (۹) ماہ کے عرصے کے بعد غرہ ذی حجہ سنہ ۱۲۱۶ھ کو نواب تاج الامراء بہادر نے دنیا ناپائیدار کو وداع کہی، حسب بیان صاحب تذکرہ صبح وطن اعظم بہ عمر ہیجدہ سالگی کاشہ حیاتش پر شد۔ تذکرہ گلزار اعظم میں بیان کیا ہے کہ :-

"الحق شاعرے باین نازک خیالی دریں کم سالی از خاندان انوریہ برنخاستہ بلی احدے دریں ممالک بازار سخن را بایں گرمی نیاراستہ۔" افسوس اس باہمت جوان کی قبر بھی مدراس میں عام لوگوں کو معلوم نہیں ہے۔

مٹے ناموں کے نشاں کیسے کیسے

لہ یہ مواد و تفصیلات ایک پرانی یادداشت سے ماخوذ ہیں جو کتب خانۂ سعیدیہ میں محفوظ ہے [illegible] صاحب کا شکر گزار ہوں۔

حیدرآباد کا دفتر دیوانی و مال

انڈین ہسٹری کانگریس میں۔ جو بمقام بلدہ حیدرآباد منعقد ہوئی تھی سنایا گیا

از جناب نصیرالدین صاحب ہاشمی

میرے مضمون کا عنوان جیسا کہ آپ سب کو معلوم ہے۔ حیدرآباد کا "دفتر دیوانی و مال" ہے۔ بلحاظ عنوان کے لحاظ سے یہ ایسا موضوع نہیں معلوم ہوتا ہے جو آج کی اہم صحبت میں سماعت کے لئے پیش کیا جائے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ حیدرآباد کے دفاتر میں دفتر دیوانی و مال ہی کو قدامت اور اہمیت کے مدنظر دوسرے تمام دفاتر پر تفوق حاصل ہے۔ اس لئے اس کی سرگذشت موجب دلچسپی ہو سکتی ہے۔

دنیا کی ہر متمدن سلطنت کیلئے نظم و نسق۔ آئین اور قوانین کی ضرورت ہوتی ہے لیکن ہر ملک کا آئین حکومت جدا۔ نظام سیاست مختلف اور طریقۂ حکمرانی جداگانہ ہوتا ہے۔

نظام سیاست۔ اور آئین جہاں بانی کی اجرائی کیلئے ایک صدر دفتر کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس کے بغیر نظام سیاست جاری ہو سکتا ہے اور نہ کاروبار مملکت چل سکتے ہیں، نظم و نسق کی پابندی ہو سکتی ہے اور نہ آئین و قوانین پر عمل کیا جا سکتا ہے۔ بہرحال ہر زمانہ میں ہر ملک میں اسکے انصرام کے لئے ایک خاص دفتر کی ضرورت لازمی ہے۔ جس کی مختلف شاخیں ہوتی ہیں جو اپنا اپنا کام انجام دیتی ہیں۔ صدر دفتر کو ایک درخت کے تنہ سے تشبیہ دی جا سکتی ہے جس کی کئی شاخیں ہوتی ہیں جس کے بغیر درخت کا وجود ناممکن ہے۔

آصفی حکومت ارباب تاریخ سے یہ امر پوشیدہ نہیں ہے کہ نواب آصفجاہ اول پہلی مرتبہ بزمانہ فرخ سیر سنہ ۱۱۲۴ھ میں دکن کی صوبہ داری پر مامور کئے گئے تھے اور دو سال سے زیادہ عرصہ تک آپ نے اس خدمت کو انجام دیا۔ اس کے بعد دوسری مرتبہ سنہ ۱۱۳۶ھ میں دکن کی جانب روانہ ہوئے اور زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔ آپ کا دور حکمرانی زیادہ تر مسلسل معرکوں میں گزرا۔ پہلے نواب مبارز جنگ

اور مظفر جنگ کے قلیل زمانہ کے بعد نواب صلابت جنگ نے کئی سال تک حکمرانی فرمائی آپکے زمانہ میں بھی جنگ و جدل کے بادل دکن کی فضا پر منڈلاتے رہے کبھی شمالی حصہ میں خونریزی ہوتی رہی تو کبھی جنوب میں حتی کہ نواب نظام علی خان آصفجاہ ثانی کا دور حکومت آیا۔ اگرچہ اس زمانے میں بھی سیاسی فضا مکدر رہی۔ اندرونی و بیرونی لڑائیوں سے دکن کی زمین خون سے رنگی جارہی تھی لیکن چونکہ آپ مستقل طور پر عرصہ دراز تک حکمرانی کرتے رہے اس لئے باضابطہ نظم و نسق قائم کرنے کا موقع ملا۔ آپ بہ نفس نفیس امور مالی و ملکی کو انجام دیتے تھے۔ حتی کہ ایک ایک دن کی سپاہی کی رخصت بھی آپ نے منظور فرمائی ہے۔ آپ کے بعد یہ بات باقی نہیں رہی۔ دیوان یا مدارالمہام وقت ہی زیادہ تر انصرام امور سلطنت اور کاروبار مملکت کے ذمہ دار ہوگئے تھے۔

اس امر کی صراحت کر دی گئی ہے کہ ہر بادشاہ یا حکمران کے لئے ایک دفتر کی ضرورت داعی ہے اسی طرح سلطنت آصفیہ کا شاہی دفتر دفتر دیوانی او رمال تھا۔

وجہ تسمیہ دفتر دیوانی او رمال کی وجہ تسمیہ پر ہم کو سب سے پہلے نظر ڈالنے کی ضرورت ہے اس کی وجہ تسمیہ کے متعلق بقول بعض "دفتر دیوان دکنی ہی کا مخفف بظاہر دفتر دیوانی ہے"۔ عام طور سے خیال یہ ہے کہ دفتر دیوانی "دیوان" کا دفتر تھا اس لئے اس نام سے موسوم ہوا۔ دکن کی کسی تاریخ میں دفتر دیوانی و مال کی وجہ تسمیہ کے متعلق کوئی وضاحت کم از کم میری نظر سے نہیں گزری۔ اس لئے کوئی صحیح رائے تاریخوں کے حوالہ سے بیان نہیں کی جاسکتی۔ البتہ میں اپنی ذاتی رائے اور خیال کا اظہار کرونگا۔

اگر اس کو دیوان کے دفتر سے موسوم کیا جائے تو فرض کرنا ہوگا کہ یہ دفتر اس وقت قائم ہوا جب کہ عہدہ دیوانی کا وجود ہوا تاریخوں سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ حضرت آصفجاہ اول نے کسی کو اپنا دیوان نہیں بنایا تھا۔ البتہ نواب ناصر جنگ نے اپنی مسند نشینی کے بعد ۱۱۶۲ھ ہجری میں صمصام الملک کو اس خدمت سے سرفراز فرمایا اس کے برخلاف دفتر دیوانی و مال میں اسکے پہلے کے کاغذات موجود ہیں اس لئے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ اس سے قبل دفتر کا وجود تھا۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اگر دفتر دیوانی کو دیوان کا دفتر تسلیم کیا جائے تو پھر یہ بحث پیدا ہوتی ہے کہ آخر حکمران وقت کس طرح انصرام امور ملک کرتے تھے مہات سلطنت کس طور پر انجام پاتے تھے۔ اگر کوئی شاہی دفتر علیحدہ تھا تو وہ کون سا تھا حالانکہ حیدرآباد میں دفاتر دیوانی و مال سے قدیم دفتر کوئی نہیں ہے اور نہ قدیم کاغذات کسی اور جگہ محفوظ ہیں۔

تیسرا اعتراض یہ ہے کہ دیوان یا مدارالمہام کے فرائض مالی امور کا انجام دینا تھا۔ فوج کا تعلق بالکلیہ پیشکار اور بخشی الملک سے ہوتا تھا۔ فوجی کاغذات سے جو دفتر دیوانی میں موجود ہیں ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بخشی الملک کے اجرا کردہ ہیں اس لئے دفتر دیوان کو ان سے تعلق نہیں ہو سکتا۔ حالانکہ قدیم زمانہ سے دفتر دیوانی و مال میں فوجی کاغذات بھی موجود ہیں۔

دفتر دیوانی میں خاص شاہی "سیاہہ" موجود ہے حالانکہ دیوان کے دفتر کو خاص شاہی سیاہہ سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔ اس سیاہہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں چار قسم کے کاغذات ہوتے تھے یعنے مال، سپاہ، محلات اور متفرق۔ بہرحال ان وجوہ سے میرا خیال ہے کہ دفتر دیوانی اور مال دیوان کے دفاتر نہیں تھے بلکہ شاہی دفاتر تھے ان کا تعلق بادشاہ وقت سے ہوتا تھا۔ البتہ زمانۂ مابعد میں جب کہ دیوان یا مدارالمہام امورات مالی و ملکی میں زیادہ دخیل ہو گئے تو یہ دفاتر بھی ان کی نگرانی میں آ گئے تھے۔

میرا خیال ہے کہ لفظ "دیوان" سے جس کے معنی دفتر کے ہیں لفظ دیوانی مخفف ہوا ہے۔ زمانۂ مابعد میں اس کے ساتھ دفتر کا لفظ مکرر اضافہ ہو گیا ہو گا۔ اس طرح "دفتر دیوانی" کی اصل قرار دی جا سکتی ہے۔

دفتر کو دیوان سے موسوم کرنے کی ابتدا حضرت عمرؓ سے ہوئی ہے چنانچہ الفاروق کے مطالعہ سے معلوم ہو گا کہ آپ نے جو سرکاری عمارتیں تعمیر کرائی تھیں ان میں دارالامارۃ، بیت المال، قید خانے، مہمان خانے اور "دیوان" شامل تھے۔

دیوان کے متعلق یہ صراحت ہے کہ ایک مکان تھا جس میں دفتر کے کاغذات رکھے جاتے تھے

رہا کرتے تھے۔ فوج کا دفتر بھی اسی مکان میں رہا کرتا تھا۔ سلطنت کے نظم ونسق، حساب کتاب کا بھی یہی مکان مخزن ومعدن تھا۔ بہ الفاظ دیگر اس کو شاہی محکمہ کہا جاسکتا ہے۔ حضرت عمرؓ کے بعد یہی دستور حکومت اسلامیہ میں رائج رہا مگر چونکہ کام کی کثرت ہونے لگی اس لئے بجائے ایک دیوان کے مختلف دیوان ہوتے تھے۔ چنانچہ دیوان الانشا۔ دیوان الزام۔ دیوان استیفا، دیوان الجند۔ دیوان الخراج وغیرہ ناموں کا پتہ چلتا ہے۔

ہندوستان کی اسلامی حکومتوں اور خود مغلیہ دور میں یہ لفظ مستعمل رہا ہے۔ اس طرح سلطنت آصفیہ کے ابتدائی دور میں شاہی دفتر کو لفظ "دیوان" سے موسوم کرتے ہوں گے اور زمانۂ مابعد میں وہ دفتر دیوانی کی صورت میں آگیا ہوگا۔ اس دفتر کو دفتر دیوانی سے موسوم ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ دور مغلیہ میں ہر صوبہ دار کے ساتھ "دیوان" یا چیف سکریٹری کا تقرر بھی ہوتا تھا اس طرح آصفجاہ اول کے ساتھ دکن کا جو دیوان مقرر رہا ہوگا اس کا دفتر دفتر دیوان سے موسوم رہا ہو۔ چونکہ دفتر دیوانی میں آپ کی صوبہ داری کے زمانے کے کاغذات بھی ہیں اس لئے اس خیال کی تائید بھی ہوتی ہے۔ اسی طرح دفتر مال کی وجہ تسمیہ کے متعلق میرا خیال ہے کہ چونکہ مالی امور اس دفتر سے متعلق تھے اس سلئے دفتر مال سے اس کو موسوم کیا گیا ہوگا۔ اسکی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ دفتر دیوانی میں جو سیاہہ ہے نواب آصفجاہ ثانی کے متعلق کاغذات کا موجود ہے۔ اس میں "مال" کے عنوان کے تحت جن کاغذات کی کھتاؤنی ہوئی ہے وہ عموماً مالی انتظام سے متعلق ہیں۔ فوج یا محلات اور دیگر متفرق نوعیت کے کاغذات کی اس کے سلسلے میں کھتاونی نہیں ہوئی ہے بلکہ ان کو جداگانہ عنوانوں کے تحت رکھا گیا ہے۔

بہرحال جیسا کہ میں نے ظاہر کیا ہے اس دفتر کی وجہ تسمیہ کے متعلق کسی تاریخ سے کوئی صحیح خیال ظاہر نہیں کیا جاسکتا جو خیال میں نے ظاہر کیا ہے ممکن ہے کہ صحیح ہو اور ممکن ہے غلط ہو۔

دفاتر دیوانی اور مال کی ابتداء

ان دفاتر کی وجہ تسمیہ کے بعد ان کی ابتداء کے متعلق صراحت کرنے کی ضرورت ہے۔ بعض اصحاب کا خیال اسکی ابتداء کے متعلق یہ ہے کہ

"حضرت مغفرت مآب نواب آصفجاہ اوّل نے دکن میں سلطنت آصفیہ کا نظم و نسق
وہی رکھا جو سلطنت مغلیہ میں رائج تھا۔ تمام امور کی انجام دہی کے لئے دفتر دیوان قائم کیا گیا"
اس سے واضح ہے کہ حضرت آصفجاہ اول نے دفتر دیوانی قائم کیا تھا لیکن دفتر دیوانی میں ایسے کاغذات بھی موجود ہیں جو ۱۱۲۶ھ میں جاری ہوئے ہیں اس سے یہ تصور کرنا ہوگا کہ آپ کے ابتدا ر صوبہ داری کے کاغذات بھی یہاں موجود ہیں اس لئے دفتر دیوانی کی ابتداء کو ۱۱۲۶ھ سے تسلیم کرنے میں کوئی امر مانع نہیں معلوم ہوتا۔

دفتر مال کی ابتداء کے متعلق دکن کی مشہور اور معتبر تاریخ گلزار آصفیہ میں مرقوم ہے:۔

"نواب آصفجاہ بہادر برائے انتظام دکن از پیشگاہ خلافت رخصت انصراف یافتند۔ راجہ ساگرمل بہادر را بقدر دانی و افزائش مراتب عزت و حرمت ہمراہ از دارالخلافۂ شاہجہان آباد بدکن آوردہ مختار کاروبار دفاتر مال وملک ساختند۔ مشہور آفاق است کہ ہفتصد متصدیان ذی مرتبہ در کچہری مال در پیش دستی و اطاعت امر راجہ موصوف می بودند صفحہ (۲۵۳)

نواب آصفجاہ بہادر جب دہلی سے دکن کی جانب روانہ ہوئے تو راجہ ساگرمل کو عزت و حرمت کے ساتھ اپنے ساتھ دارالخلافہ شاہجہان آباد سے ہمراہ لاکر دفاتر مال کا مختار کل فرمایا۔ مشہور ہے کہ آپ کی کچہری میں سات سو متصدی کام کرتے تھے۔

اس سے واضح ہے کہ دفتر مال ۱۱۲۶ھ میں قایم ہوا ہے۔

سر دفتر: اس امر کی وضاحت ہو چکی ہے کہ دفاتر دیوانی اور مال نواب آصفجاہ اول کے زمانہ میں قایم ہوئے ہیں۔ ان دفاتر کے افسر اعلیٰ سر دفتر سے موسوم تھے۔ دفتر مال کے پہلے سر دفتر راجہ ساگرمل تھے۔ ان کے پسماندگان کی اولاد سے کوئی شخص اس خدمت سے سرفراز ہوتا رہا آخری شخص راجہ شیوراج دھرم جہانی تھے جن کے مرنے پر ۱۳۳۳ف مطابق ۱۹۲۴ء میں یہ دفتر دفتر دیوانی کے ساتھ ضم کر دیا گیا۔ دفتر مال کی وجہ سے راجہ ساگرمل کا خاندان

مال والوں کے خاندان سے موسوم ہوا ہے۔ اور ان کے رہنے کا محلہ آج تک مال والوں کی گلی کہلاتا ہے۔ راجہ دھرم کرن بہادر صدرالمہام تعمیرات اس وقت اس خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔

آصفجاہ اول کے زمانہ میں دفتر دیوانی کے سررشتہ دار کون تھے، ہنوز تحقیق طلب ہے۔ البتہ نواب میر نظام علی خان آصفجاہ ثانی کے زمانے میں راجہ رائے رایاں کلاں دفتر دیوانی کے سردفتر مقرر ہوئے۔ راجہ صاحب کے بعد ان کے خاندان میں یہ خدمت رہی راجہ شنکر راؤ رائے رایاں کے انتقال پر ۱۳۰۵ھ سے یہ دفتر سرجارج کیپن واکر نے راست سرکاری نگرانی میں لے لیا۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے دفتر مال، دفتر استیفا، دفتر ملکی وغیرہ دفتر دیوانی کے ساتھ ضم ہوتے گئے۔ راجہ رائے رایاں کے خاندان کے چشم و چراغ راجہ شام راج راج ونت بہادر اس وقت بقید حیات ہیں۔

دفتر دیوانی و مال سے کیا کام لیا جاتا تھا

اب مجھے یہ بیان کرنا ہے کہ زمانۂ سابق میں دفتر دیوانی اور مال سے کیا کام لیا جاتا تھا۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے یہ شاہی دفاتر تھے جملہ امور سلطنت اور انصرام مملکت کا کام ان ہی دفاتر سے وابستہ تھا۔ خواہ وہ کام مالی ہوں یا حسابی، فوجی ہوں یا انتظامی، سیاسی ہوں یا تجارتی سب کا تعلق بالکلیہ ان ہی دفاتر سے متعلق تھا۔

اگر ہم ان دفاتر کے کاروبار کے متعلق مزید وضاحت کریں تو کہہ سکتے ہیں کہ تقرر عمال و تعہداران انتظام مالیہ، حساب و کتاب ریاست، ترتیب موازنہ، وصولی مال گزاری و دیگر ابواب اجرائی اسناد ان معاش عطاء "جاگیر" انعام" یومیہ اور منصب وغیرہ نگہداشت جمعیت تقرر تبدل تعیناتی و برطرفی اہل سیف، اہل قلم وقائع نگاری عہد نامہ جات سیاسی و تجارتی غرض ایسا کوئی کام نہیں تھا جو ان دفاتر سے متعلق نہ ہو۔

دفتر مال سے متعلق صرف صوبہ جات حیدرآباد اور بیدر تھے اور دفتر دیوانی سے

صوبہ خجستہ بنیاد بہار اور بیجاپور کو تعلق تھا علاوہ ازیں دفتر مال سے زیادہ تر مالی امور طے ہوتے تھے اس کے برخلاف دفتر دیوانی کو ہر قسم کے کاروبار سے تعلق رہا لیکن حضرت آصفجاہ ثانی کے بعد اس میں کچھ تغیر ہو گیا تھا۔ دفتر مال میں بھی دوسرے امور طے ہونے لگے تھے۔

اب ان دفاتر سے کیا کام لیا جاتا ہے

اب میں اس امر کی صراحت کروں گا کہ گزشتہ چالیس پچاس سال سے ان دفاتر سے کیا کام لیا جارہا ہے نواب مختار الملک نے جب سنہ ۱۲۸۶ف / ۱۸۸۳ء میں دیگر دفاتر سرکار عالی قائم کرلئے تو یہ دفاتر گویا بے کار ہو گئے تھے البتہ صرف تصدیق اسناد کا کام لیا جاتا رہا، جاگیردار انعامدار اور یومیہ دار وغیرہ اپنی معاشوں کا دعویٰ متعلقہ دفاتر میں دائر کریں تو ان کے اصل اسناد کی تصدیق ان دفاتر سے چاہی جاتی ہے یہاں ہر نوعیت کی معاش کے داخلے مختلف ہوتے ہیں جن کے مدنظر سند اور معاش زیر بحث کی تصدیق یا تکذیب کی جاتی ہے۔

دوسرا کام ان دفاتر میں تہذیب کاغذات کا ہوتا رہا ہے چونکہ یہ دفاتر ایک عرصہ دراز تک غیر مہذب حالت میں تھے ان کا کوئی پرسان حال نہیں تھا۔ اس لئے ردی کی سی حالت ہو گئی تھی اس طرح صدہا کاغذ تلف بھی ہو گئے تھے باقی ماندہ کاغذ کو اچھی حالت میں لانا اور رکھنا ایک ضروری امر تھا اس کے مدنظر یہ کام بھی ہوتا رہا ہے۔ چنانچہ تہذیب اور ترتیب کا بہت کچھ کام ہو چکا ہے۔

چونکہ اس دفتر کو ایک کارآمد دفتر تاریخی مخزن بنانا سرکار عالی کے پیش نظر ہے اس لئے ایک مختصر مگر نادر کتب خانہ بھی فراہم کر لیا گیا ہے۔

آئندہ کیا کام لیا جاسکتا ہے

مجھے بالآخر یہ بتانا ہے کہ اس دفتر سے کیا کام لیا جاسکتا ہے اور پبلک کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

(۱) سب سے پہلے تو یہ ہے کہ تاریخ دکن سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہاں کافی ذخیرہ موجود ہے خواہ وہ تاریخ ملکی ہو یا انتظامی فوجی ہو یا سیاسی۔

دفتر دیوانی اور مال کے ذخیرہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ملک سرکار عالی کی تقسیم کیا تھی، کتنے صوبے ضلع اور تعلقے تھے۔ مواضعات کتنے تھے، کون کون موضع کس تعلقہ اور ضلع کے تحت تھا، ہر صوبہ میں کتنے ضلع اور کتنے تعلقے ہوتے تھے، ان کی حیثیت کیا تھی، سرکاری خالصہ میں شامل تھے یا کسی کی جاگیر وانعام میں۔ ان کا محاصل سالانہ کیا تھا، اس کے وصول کرنے کے کیا طریقے رائج تھے، سرکاری آمدنی کے کیا کیا ابواب تھے، سالانہ آمدنی کیا ہوتی تھی، رقم کہاں جمع ہوتی ارسال رقم کا کیا طریقہ تھا، سرکاری خزاین کہاں کہاں تھے۔

آمدنی وخرچ کا موازنہ کس طرح مرتب ہوتا، خرچ کے ابواب کیا ہوتے تھے، اخراجات کے بعد بچت ہوتی تھی یا فاضل خرچ بر آمد ہوتا، قرضہ تھا تو اس کی ادائی کا کیا طریقہ تھا، کون کون سکے رائج تھے، ان کی مالیت کیا ہوتی تھی، دارالضرب کہاں کہاں تھے اور اس کا انتظام کیا تھا،

مالی اور انتظامی عہدہ دار کون کون ہوتے تھے، ان کے فرائض منصبی کیا تھے، ان کے تقرر تبدل تنزل برطرفی کا کیا طریقہ تھا، رعایا کے ساتھ ان عہدہ داروں کا برتاؤ کیا ہوتا تھا۔

ملک میں عدالت اور پولیس کے انتظامات کیسے تھے، قاضی کے فرائض کیا تھے اور کوتوال کیا کیا امور انجام دیتا تھا، تعمیرات۔ پبلک ورکس بلدی انتظامات کیا تھے، ملک میں آب پاشی کے کیا ذرائع تھے، ان کی کس طرح تعمیر و ترمیم ہوتی تھی۔

تعلیم کا کیا انتظام تھا، دواخانوں، حکیموں، ویدوں، مشائخوں، حافظوں، عالموں، پنڈتوں کو کس لئے روزینے مقرر ہوتے تھے، مسجدوں دیولوں خانقاہوں، مٹوں وغیرہ کو معاش کیوں جاری ہوتی تھی، ان کے انتظامات کیسے تھے۔

ملک میں بٹہ کا کیا طریقہ اور کیا انتظام تھا، قحط کے موقع پر کیا انسدادی تدابیر اختیار کئے جاتے تھے۔

فوج کا کیا انتظام تھا، اس کی تقسیم کیا تھی۔ ان کی تنخواہیں کیا ہوتی تھیں۔ قلعے کتنے تھے، کون کون قلعے مشہور تھے، قلعہ دار کون تھے، ان کے فرائض کیا تھے، قلعوں کی حفاظت کا کیا انتظام تھا۔

سرکار آصفی کے معاہدات اور عہد نامہ جات سرکار کمپنی، پیشوا، اور حیدر علی کے ساتھ کیا کیا ہوئے تھے۔

مخطوطات کے خزانے

از محمد غوث صاحب ایم۔ اے

(۱)

میر عبدالرزاق صمصام الدولہ شہنواز خان کے خطوط

نواب ناصر جنگ شہید اور نواب صلابت جنگ مرحوم کے زمانہ میں صمصام الدولہ شہنواز خان نے اپنی خداداد قابلیت اور وفا شعاری کی بدولت بڑی نام آوری حاصل کی۔ وکیل مطلق کے اہم ترین عہدہ پران کو مامور کیا گیا تھا۔ اس زمانہ کے نازک اور پیچیدہ حالات کو سنبھالنے کیلئے انھوں نے اپنی مقدور بھر کوشش عمل میں لائی تھی۔ مآثر الامرا اور بہارستان سخن کے مولف کی حیثیت سے تذکرہ نویسوں کی صف اول میں بھی انھوں نے اپنی جگہ حاصل کی ہے۔

ان کی شخصیت کی اہمیت کے لحاظ سے ان کی خط وکتابت کو بھی جیسی کچھ اہمیت حاصل ہونی چاہیئے وہ صاف طور سے واضح ہے۔ کتب خانہ آصفیہ میں حضرت آصفجاہ اول کے میر منشی موسوی خان جرأت کے منشآت کا ایک نسخہ انشائے میر محمد ہاشم کے[۱] نام سے محفوظ ہے[۲]۔ اس کے آخر میں ناقل کتاب نے بہارستان سخن کا تکملہ بھی شامل کر دیا ہے۔ اس تکملہ میں شہنواز خان کے ۶۶ مکاتیب بھی شامل ہیں۔

واضح ہو کہ بہارستان سخن کا موضوع شعرائے فارسی کا تذکرہ ہے۔ قدما کے علاوہ ہندوستان کے فارسی گو شعرا کے حالات بھی اس میں قلمبند کئے گئے ہیں۔ اس کتاب کا تکملہ مولف کے فرزند میر عبدالحی خان وقار نے ترتیب کی اور لکھا ہے کہ بہارستان سخن کی ترتیب کے بعد مولف کو یہ خیال پیدا ہوا کہ چند دوسرے سخن سراؤں کے حالات بھی لکھے جائیں چنانچہ ان کے نام مولف نے کتاب کے اپنے نسخہ کی پشت[۳]

---

[۱] اسکے متعلق مزید تفصیلات کیلئے ملاحظہ ہو راقم کا مضمون مندرجہ رسالہ شہاب جلد ۵ نمبر ۱ ص ۲۰۱ انشار فارسی

لکھ دیئے تھے۔ قبل اسکے کہ ارادہ کی تکمیل ہوتی شہ نواز خان اس زمانہ کی افراتفری میں قتل ہو گئے۔ بعد ازاں میر عبدالحی خان وقار نے ان باقی ماندہ شعرا کے حالات خود قلم بند کئے اور اصل کتاب میں متعلقہ باب[1] کے آخر میں "تکملہ" لکھکر ان کا اضافہ کر دیا۔[2]

انشاے میر محمد ہاشم کے ساتھ جو "تکملہ" شامل ہے وہ گویا آخری باب (طبقہ) کا تکملہ ہے، میر عبدالحی خان وقار نے صراحت کی ہے کہ انہوں نے یہ امر پسند کیا کہ میر غلام علی آزاد بلگرامی اور میر رضی اقدس کے حالات قلم بند کئے جائیں اس تقریب میں چند دوسرے شعراء کے حالات بھی مرتب کر کے آخری باب کا ضمیمہ کر دیئے گئے۔

اس "تکملہ" میں وقار نے لکھا ہے کہ ان کے والد اپنے شباب کے زمانہ میں کبھی کبھی شعر کہہ لیا کرتے تھے لیکن لوگوں کو ان کی نثر زیادہ پسند ہوتی تھی کہ اس کی ایک طرز خاص تھی۔ اسی کے مد نظر ان کے چند "رقعات" فراہم کر کے اس تکملہ کے ذیل کے طور پر درج کئے گئے۔

یہ منشآت تعداد میں ۶۶ ہیں مکتوب الیہم اور ہر مکتوب الیہ کو جس تعداد میں یہ خطوط لکھے گئے ان کی تفصیل ذیل میں درج ہے۔

(۱) عرضداشت بہ پیشگاہ عزیز الدین عالمگیر ثانی ایک قطعہ (۲) خط جو نواب صلابت جنگ کی جانب سے فیروز جنگ کو بموجب مسودہ شہ نواز خان لکھا گیا۔ ایک قطعہ۔ (۳) فیروز جنگ کی خدمت میں عرائض دو قطعے (۴) خطوط بنام راجہ کیشو راؤ ہرکارہ بادشاہی دو قطعے (۵) نواب ناصر جنگ کی خدمت میں عرضداشتیں ۵ قطعات (۶) خطوط بنام راؤ بالاجی پنڈت پردھان دو قطعے (۷) خطوط بنام ملہار راؤ ہلکر دو قطعے (۸) خط بنام گورنر پانڈیچری ایک قطعہ (۹) خط رکن الدولہ نصیر جنگ کے نام پر ایک قطعہ (۱۰) خطوط بنام امانت خان ۴ قطعات (۱۱) خطوط بنام قطب الدولہ محمد انور خان تین قطعات (۱۲) خط بنام قسورہ جنگ ایک قطعہ (۱۳) خط بنام قوی جنگ ایک قطعہ (۱۴) خط بنام احمد علی خان ایک خط (۱۵) خطوط بنام مہاراجہ ارجن بہادر دو قطعات (۱۶) کمال الدین کے نام پر خط ایک قطعہ (۱۷) شاہ علی درویش کے نام ایک قطعہ (۱۸) مرزا شمبھو لال منشی کے نام ایک قطعہ (۱۹) نصیر الدین مصطفےٰ خان کے نام

---

[1] اصل کتاب میں "باب" کو طبقہ قرار دیا گیا ہے۔ [2] ملاحظہ ہو صفحہ ۳۰۷ و ۳۰۸ نسخہ کتب خانہ آصفیہ انشاء فارسی ۲۰۸

ایک قطعہ (۲۰) ملا ورخان کے نام ۱۱ قطعات (۲۱) میر غلام علی آزاد بلگرامی کے نام ۱۱ قطعات (۲۲) درگاہ علی خان کے نام ۶ قطعات (۲۳) میر محمد حسین خان کے نام دو قطعات (۲۴) سید غلام حسین کے نام ایک قطعہ (۲۵) بنام رستم خان ایک قطعہ۔

اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ جن اصحاب کو یہ خطوط لکھے گئے ہیں ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو اس زمانہ میں واقعات و حوادث کا محور تھے۔ ان خطوط سے اس وقت کے سیاسی اور معاشی و معاشرتی حالات کا کھلا اندازہ ہوتا ہے، جب تک ان سارے خطوط کی تاریخ کی کتابوں کی روشنی میں ترتیب عمل میں نہ آئے ان کی اہمیت کما حقہ ظاہر نہیں ہو سکتی۔ ضرورت ہے کہ یہ اور اس قسم کے دوسرے مکاتیب کی ترتیب اور اشاعت کا ایک خاص سلسلہ قایم کیا جائے تاکہ تاریخ کی کتابوں میں جو امور تشنہ رہ گئے ہیں ان کی تکمیل ہو جائے۔ جامعۂ عثمانیہ کا شعبۂ تاریخ اگر ایم۔ اے کی جماعت میں اس نوعیت کے مکاتیب کی ترتیب مقالہ نگاروں کا موضوع قرار دینے پر غور کرے تو شاید جلد ایسے مکاتیب کی ترتیب و اشاعت کی صورت پیدا ہو سکے۔ نا مناسب نہ ہوگا اگر یہاں شہ نواز خان کے بعض مکاتیب کا خلاصہ درج کیا جائے۔

نواب صلابت جنگ نے دولت آباد کے قلعہ پر تاخت کی تھی اسکے وجوہ و اسباب کے متعلق شہ نواز خان نے اپنی عرضی میں نواب وزیر الممالک فیروز جنگ کو لکھا ہے کہ:۔

قلعہ داران دولت آباد نے جاگیرات کی بحالی کے باوجود اشرار کو پناہ دینا اپنا شعار کر لیا تھا، اس سلسلے میں قلعہ داروں کو پند و نصیحت کی گئی کہ اگر کوئی شخص کسی ظالم کے ظلم سے تنگ آکر امان طلب کرے تو اس کو امان دینا درست ہوگا لیکن ہمیشہ ایسے افراد کو پناہ دینا جن کے ذمہ سرکاری محاسبہ ہوتا ہے امور شاہی کیلئے نقصان رساں ہے قلعداروں نے یہ نصیحت نہیں سنی، چونکہ بندگانعالی (نواب صلابت جنگ) کو کار بادشاہی کے سلسلہ میں اکثر دور دراز مقامات پر جانا ہوتا ہے اس لحاظ سے ہمیشہ اس بات کی خلش رہتی تھی کہ اورنگ آباد میں کوئی مقام ایسا نہیں ہے کہ جہاں ضرورت کے وقت سب اہل محل کی نگہداشت ہو سکے۔ پھر جب کہ ابدالی کی آمد آمد کا شہرہ ہے۔ علاوہ ازاں یہ بات ظاہر ہوئی کہ قلعداروں نے یہ بات ٹھان لی تھی کہ قلعہ مخالفوں کے سپرد کر دیا جائے بنا بریں نواب صلابت جنگ نے مصلحت وقت کی بنا پر قلعہ پر یورش کی اور قلعہ داروں کو انکے

حسب خواہش دوسری جاگیر دے دی .... اس زمانہ میں بھی دربار دہلی سے سند کا
حصول لازم تھا چنانچہ نواب صلابت جنگ کے نام قلعہ دولت آباد کی سند عطا ہونے کے لئے شہ نواز خان
نے فیروز جنگ کو توجہ دلائی ہے "از توجہ حضرت یقین است کہ زود سند مرحمت شود"

اسی خط میں شہ نواز خان نے فیروز جنگ کو یہ بھی لکھا ہے کہ نواب صلابت جنگ نے بادشاہ
کی خدمت میں یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ خود کو امیر الممالک کا خطاب مرحمت فرمایا جائے اور بادشاہ
نے اسکو پسند بھی کیا تھا۔ لیکن ابھی فرمان صادر نہیں ہوا۔ اگر جلد شفقہ والا صادر ہو جائے تو بہتر ہوگا۔
واضح ہو کہ نواب فیروز جنگ بھی حضرت آصف جاہ اول کے فرزند اور دہلی میں مقیم تھے۔ ابتداء
میں انہوں نے دکن کی حکومت حاصل کرنے پر توجہ نہیں کی بلکہ اولاً نواب ناصر جنگ شہید اور بعد میں
نواب صلابت جنگ کو صوبہ دار دکن تسلیم کر لیا۔ چنانچہ شہ نواز خان کے ان مکاتیب سے بھی یہی امر واضح
ہے لیکن بعد میں نواب فیروز جنگ نے صوبہ داری دکن کی سند نواب صلابت جنگ کے برخلاف دہلی کے دربار سے
حاصل کر لی اور اپنے لشکر کے ساتھ اورنگ آباد پہونچ گئے تھے کہ انتقال کر گئے۔ یہ بات تحقیق طلب ہے
کہ نواب فیروز جنگ کو نواب صلابت جنگ سے اختلاف کب پیدا ہوا اور اسکے اسباب کیا تھے۔

نواب صلابت جنگ کے دربار میں فرانسیسی ارباب تدبیر کو جو رسوخ حاصل تھا وہ تو سب کو
معلوم ہے لیکن ابھی اس بات کی کافی تحقیق ہونی ہے کہ فرانسیسی لوگوں کے رسوخ سے کیا کیا نقصانات
عاید ہوئے، آیا انہوں نے اپنے واجبات کی کما حقہ تعمیل کی یا نہیں۔ نواب شہ نواز خان نے راجہ کیشو راؤ
ہرکارہ بادشاہی کو اپنے ایک خط میں لکھا ہے کہ اس سال ارادہ تھا کہ سری رنگ پٹن کی جانب روانگی
عمل میں آئے لیکن فرانسیسی لوگ ضرورت کے وقت نہ آنے سے کور مشکال پر توقف کرنا ضروری معلوم ہوا۔
اس زمانہ میں مالیہ کی جو خراب حالت تھی اسکے سلسلہ میں بھی راجہ کیشو راؤ ہرکارہ بادشاہی کو ایک
خط میں مطلع کیا ہے کہ اب نہ خزانہ ہے اور نہ جنس۔ کارخانجات رکاب نواب ناصر جنگ کے ساتھ میں
برباد ہو گئے۔ ایک چہاونی میں ہر چند اس بات کی کوشش کی گئی کہ بعض اجناس تنخواہ داروں کو دیئے
جائیں لیکن کوشش کامیاب نہ ہوئی۔ اس جملہ کا مطلب واضح نہ ہو سکا کہ آیا کتاب خانہ حیدرآباد ہفت ہزاری

کتاب بوویکہزار وپانصد جلد برآمد کہ بہ پنج ہزار روپیہ نمی رسد گنم برائے ایں قدر بد نامی اموال فروشی نمی تواں گرفت''

ایک اور جملہ سے حالات کس درجہ تاریک نظر آتے ہیں،

''طرفہ ایں کہ سررشتہ کاغذ نیست و سررشتہ داران موجود، انہامی گویند جنس بہ کار رفتہ، ایں ہا می گویند کاغذ جنس ہمہ بلوط رفتہ'' کاغذ تک بھی اس وقت موجود نہ تھا۔

نواب ناصر جنگ نے حکومت دکن حاصل کرنے کے بعد دہلی کا قصد کیا تھا بعد میں ارادہ ترک کرکے حافظ ہدایت محی الدین خاں مظفر جنگ کی سرکوبی کے لئے کرناٹک کا قصد فرمایا، اس وقت ناصر جنگ شہید نے شہ نواز خاں سے بھی غالباً مشورت کی، انہوں نے صاف طور سے یہ رائے دی ہے کہ دہلی کا قصد نہ کرنا بہتر ہوگا، من جملہ اور وجوہ کے یہ بھی لکھا ہے کہ

''بادشاہ وقت مستقل صاحب عزم نیست کہ نوکری بالاصالۃ تو اند شد، مثل عالمگیر بادشاہ می باید''

لیکن شہ نواز خاں تاڑ گئے تھے کہ ان کی رائے پر عمل نہ ہوگا چونکہ متوقعہ اور مستحصلہ نتائج ہمیشہ ایک نہیں ہوتے اس لئے اس پر تکیہ کرکے آخر میں یہ لکھا کہ

''باوصف ایں ہمہ اقبال کارہا وارد بفضل الٰہی بخت خداداد حضرت یاور است۔ انچہ لوہم درنیاید از پردہ غیب بظہور خواہد رسید فاذا عزمت فتوکل علی اللہ''

راؤ بالاجی پنڈت پردھان نے لکھا تھا کہ جانب کرناٹک عزیمت کرنی چاہیے اسکے جواب میں لکھا ہے کہ کرناٹک کی جانب راؤ بالاجی کی روانگی دو حال سے خالی نہ ہوگی یا تو انگریزوں سے پرخاش منظور ہے یا اس کے برعکس، اگر انگریزوں سے پرخاش منظور ہے تو ہمیں آپ کی امداد کرنی پڑیگی اور یہ عہد و پیمان کے منافی ہے۔

شہ نواز خاں نے گورنر پانڈی چری کو خط لکھا ہے کہ ۱۵ لاکھ روپئے قرض دیئے جائیں تا کہ سپاہ کی تنخواہ ادا ہوسکے۔ اور جس طرح سے کہ رقم روانہ کرنے کی ترغیب دی گئی ہے اس سے صاف

ظاہر ہوتا ہے کہ حالات کس قدر نازک تھے۔ غرض تمام خطوط کا بامعان مطالعہ کیا جائے اور واقعات مندرجۂ کتب تاریخ سے مطابقت دی جائے تو نئے امور روشنی میں آئینگے یا جو امور معلوم ہیں ان کی مزید توثیق وتصدیق ہوگی۔

• یہ منشآت کتب خانہ آصفیہ کے نسخہ ع ۲۰۱ انشار فارسی میں شامل ہیں نیز بہارستان سخن کے نسخہ ع ۱۹۳ تذکرہ فارسی میں بھی یہ مکتوبات موجود ہیں، خود بہارستان سخن پر آئندہ علحدہ لکھا جاسکے گا۔

(۲)

"چند فرامین بادشاہان دہلی موسومہ روسائے دکن وغیرہ"

متذکرہ صدر نام سے کتب خانۂ سعیدیہ میں کاغذات تاریخی کے ذخیرہ کے ساتھ ایک رسالہ مخزون ہے۔ اس مخطوطہ کی تمہید یا اسکے ترقیمہ سے رسالہ کے مرتب کی نسبت کوئی اطلاع حاصل نہیں ہوسکی، نیز ان ماخذوں کی نسبت بھی کوئی علم حاصل نہ ہوسکا کہ جن سے یہ منشآت ماخوذ ہیں، البتہ صفحہ اول پر "خواجہ حبیب اللہ" بطور دستخط تحریر ہے، شان خط سے یہ امر صاف ظاہر ہے کہ مرتب رسالہ نہ سہی ناقل یہی صاحب ہیں، نیز یہ عبارت بھی صفحہ اول پر درج ہے "مالکہ غلام محمد بن عبدالوہاب عفی اللہ عنہما" اول الذکر غلام محمد (شرف الدولہ) نواب غلام محمد غوث خان آخری نواب کرناٹک کے زمانہ میں بخشی کے عہدہ پر مامور تھے، ثانی الذکر عبدالوہاب (مدارالامرا) نواب صاحب موصوف کے دربار میں دیوان تھے ۱۲۸۵ھ میں وفات پائی۔

بہرحال اس مجموعہ میں ایسے منشآت فراہم کئے ہیں جن کے اصل نظر سے اوجھل نہ معلوم کہاں مخزون ہیں۔ نقل بھی کہیں نظر سے نہیں گزری، اس مجموعہ کے مکاتیب کا بڑا حصہ تاریخ مملکت آصفیہ سے متعلق ہے۔ اور اس زمانہ سے متعلق ہے کہ جس کے واقعات وحالات پر تاریکی ہی تاریکی چھائی ہوئی ہے۔

حضرت آصف جاہ اول کے انتقال کے بعد جانشینی کا جو ہنگامہ برپا ہوا اسکے سلسلہ میں اصلی کاغذات کیاب عنقا کہا جائے تو بجا ہے کہ معدودے چند اصلی کاغذات اب تک دیکھنے میں آئے ہیں۔ چنانچہ حضرت ناصر جنگ شہید اور نواب صلابت جنگ نے تنجاور[1] کے راجہ کے نام جو عنایت نامے

---

[1] انگریزی تالیفات میں تنجاور کو Tanjore لکھا جاتا ہے۔

اُس زمانہ میں تحریر فرمائے تھے۔ اُن کا ایک مجموعہ کتب خانۂ سعیدیہ میں محفوظ ہے اور رسالہ معارف اعظم گڑھ کے دو شماروں نمبر ۶ جلد ۱۳ و نمبر ایک جلد ۲۲ میں شائع کرائے جا چکے ہیں۔

پیش نظر رسالہ میں بھی اسی زمانہ کے فرامین اور مکاتیب جمع کئے گئے ہیں، ان کے اسلوب تحریر اور تاریخوں کا کتب خانۂ سعیدیہ کے مخزونہ عنایت ناجات موسومہ راجہ سنجاور سے مقابلہ کیا جائے تو صاف واضح ہے کہ یہ اصل کی ہی نقل ہیں۔

اس رسالہ کے گویا تین حصے ہیں،

۱۔ فرامین بادشاہان دہلی موسومہ روسائے دکن۔

۲۔ فرامین بادشاہ عالمگیر، بنام فرزندان خود و امرائے دکن

۳۔ (الف) عنایت ناجات نواب ناصر جنگ شہید بنام امرائے کرناٹک۔

(ب) عنایت ناجات نواب صلابت جنگ بنام امرائے کرناٹک۔

(ج) روسائے کرناٹک کی باہمی مراسلت اور نواب والاجاہ کے عرائض موسومہ نواب ناصر جنگ و نواب صلابت جنگ۔

ان سب کے متعلق مزید وضاحت ذیل میں کی جاتی ہے۔ بادشاہ کی جانب سے نواب صلابت جنگ کے نام جو فرامین صادر ہوئے وہ تعداد میں ۱۲ ہیں، نواب بسالت جنگ کا موسومہ ایک فرمان بھی شامل ہے، نواب سراج الدولہ انورالدین خان والاجاہ کے نام کا بھی ایک فرمان درج کیا گیا ہے۔ عبدالنبی خان نواب کڑپہ کے نام کے بھی ایک فرمان کو نقل کیا گیا ہے۔ ایک فرمان کے متعلق لکھا ہے کہ ناظم دکن کے نام پر صادر ہوا۔ ان کے علاوہ علی گوہر شاہ کا ایک فرمان موسومہ نواب محمد علی خان والاجاہ درج ہے۔

نواب صلابت جنگ کے موسومہ پہلے فرمان میں یہ حکم مندرج ہے کہ بخشی الممالک غازی الدین خان فیروز جنگ کی بجائے نواب صلابت جنگ کو صوبجات دکن کی صوبہ داری عطا کی جاتی ہے دوسرے فرمان میں بھی اسی کی صراحت ہے، البتہ فرمان اول میں یہ مرقوم ہے کہ

"بہ عطائے خدمت صوبہ داری صوبجات دکن از تغیر بخشی الممالک امیر الامرا نظام الملک

غازی الدین خان بہادر فیروز جنگ بدستور معزول سرمایہ اندوز مفاخرت و مباہات ساخت"

دوسرے فرمان میں لکھا گیا ہے کہ

"بعطائے خدمت صوبداری دکن بدستور آصف جاہ نامر جنگ مرحوم از انتقال فیروز جنگ سرمایہ اندوز مفاخرت و مباہات ساخت"

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا پہلا فرمان فیروز جنگ کی زندگی میں ہی عطا ہوا یا بعد۔ اگر زندگی میں ہی عطا ہوا تھا تو پھر فیروز جنگ کو کب اس خدمت کا فرمان عطا ہوا۔ کیونکہ سب تاریخوں سے واضح ہے کہ انہوں نے حکومت دکن کا فرمان حاصل کر کے اورنگ آباد کا قصد کیا تھا اور اورنگ آباد تک چلے آئے تھے کہ انتقال ہو گیا، افسوس ہے کہ مرتب رسالہ نے فرامین کے ساتھ ان کی تاریخیں درج نہیں کی ہیں ورنہ کئی شبہات دور ہو جاتے۔

نواب صلابت جنگ کے موسومہ تیسرے فرمان میں ابوالمنصور کی نمک حرامی کا تذکرہ مختصر طور سے کر کے یہ ہدایت کی گئی ہے کہ صوبجات دکن کا بند و بست حزم و احتیاط سے عمل میں لایا جائے۔

چوتھے فرمان میں یہ تذکرہ ہے کہ بادشاہ نے تخت پر جلوس کیا ہے۔ نواب صلابت جنگ کو چاہیئے کہ اپنے علاقہ کے بند و بست میں کوئی اہمال عمل میں نہ لائیں اور نماز جمعہ میں پڑھنے کے لئے جو خطبہ ارسال کیا گیا ہے وہ صوبجات دکن کی تمام مساجد میں جاری کیا جائے۔

پانچویں فرمان میں یہ اطلاع دی گئی ہے کہ ایک ہزار اشرفی بابت نذر جلوس وصول ہوئے اور یہ کہ خلعت دو شالہ ملبوس خاص عطا کی گئی ہے۔

چھٹے فرمان میں احمد شاہ ابدالی کے ہنگامہ کا تذکرہ کیا گیا ہے اور مطلع کیا گیا ہے کہ وزیر الملک ملہار جی ہولکر اور جیاجی مرہٹہ کو لاہور روانہ کیا جا رہا ہے، نواب صلابت جنگ سے بھی یہ خواہش کی گئی ہے کہ وہ بھی دہلی آئیں، اس سلسلہ میں فرمان کے الفاظ یہ ہیں۔

"آں فرزند عزیز الدین معنی تردد رابخاطر راہ نداده باستقلال و استعداد تمام برتق و فتق مہام و بند و بست صوبجات دکن پرداختہ، چوں آں فرزند عزیز را بمنزلہ فرزند حقیقی می دانیم

از کمال تفضل والا این معنی رقم پذیر خامۂ اعجاز طراز شده ۔ فرزند عزیز من! اگر آں فرزند عزیز
بساماں احسن و سرانجام مستحسن خود را بحضور والا رساند رفع مخالف ، اسہل وجوہ خواہد شد ،
ورالا انتظام تعلقات آں فرزند ہم اہم است ۔۔۔۔۔۔۔ "

اسکے متعلق نواب صلابت جنگ نے آنے سے معذوری ظاہر کرکے جو جواب ادا کیا وہ منشا دت شہ نواز خان میں شامل ہے جس کے متعلق ایک نوٹ ابھی اوپر گزر چکا ہے۔

علی گوہر شاہ کے فرمان موسومہ نواب محمد علی خان والاجاہ میں یہ مرقوم ہے کہ بدستور سابق دیوانی وفوجداری ارکاٹ اور قلعداری وفوجداری ترچناپلی کے خدمات بحال و برقرار رکھے گئے ۔

یہ فرمان توزک والاجاہی میں بھی نقل کیا گیا ہے ،

نواب بسالت جنگ کے موسومہ فرمان کا مطلب یہ ہے کہ "صوبہ داری دارالظفر بیجاپور وتعلقہ انتظام ہنگی آنطرف دریائے کشنا" کی سند عنقریب عطا کی جائیگی۔

نواب سراج الدولہ انورالدین خان والاجاہ کے موسومہ فرمان میں ان کو منصب وعلم ودیگر اعزازات اور خطاب عطا ہونے کا تذکرہ کیا گیا ہے ، اس فرمان کے دو ایک فقرات کو یہاں نقل کرنا نامناسب نہیں ،

"از معروض وزیر الملک بہادر ہویدا گشت کہ آں فدوی بہ رہبری سیف الدولہ عمدۃ الملک
بہادر بطریق اطاعت و فرماں برداری وعقیدت و خدمت گزاری بارگاہ والا موفق گشتہ"

واضح ہو کہ سیف الدولہ عمدۃ الملک کسے کا خطاب تھا اور اگر اس فرمان میں اسی کی جانب اشارہ ہے تو اس کے سلسلہ میں مزید تحقیق ضروری ہے کیونکہ نواب محمد علی خان والاجاہ کو فرانسیسی لوگوں سے کبھی موافقت نہیں تھی ، ایسے سے بھی ان کو ہمیشہ اختلاف رہا ، نہ معلوم اس فرمان میں "رہبری" سے کیا منشا ہے اور سیف الدولہ عمدۃ الملک سے کونسی شخصیت مراد ہے ،

ان فرامین کے بعد اورنگزیب عالمگیر کے چند فرامین درج ہیں ، جہاں تک دیکھا گیا ، سب فرامین متداول کتابوں میں موجود ہیں ، کوئی نیا خاص فرمان نہیں ہے ، البتہ تیسرے حصہ کے مکاتیب

کے متعلق مختصر توضیح ضروری ہے

نواب ناصر جنگ شہید مسند نشینی کے بعد جانب دہلی روانہ ہوئے تھے، دریائے نربدا پر پہونچکر فرمان بادشاہ کی بنا پر اورنگ آباد واپس چلے آئے، اس دوران میں حافظ ہدایت محی الدین خان مظفر جنگ نے کرناٹک میں شورش شروع کر دی تھی اور ایک ہنگامہ میں صوبہ دار کرناٹک نواب انور الدین خان قتل کر دیئے گئے۔ کرناٹک میں جب حالات نازک ہوتے گئے تو خود حضرت ناصر جنگ شہید نے کرناٹک کی جانب عزم فرمایا اور راستہ سے حکام و زمینداران کرناٹک کے نام عنایت نامے صادر فرمانے کا تسلسل قائم رکھا، چنانچہ پیش نظر رسالہ میں نواب ناصر جنگ کے وہ عنایت نامے نقل کئے گئے ہیں جو نواب محمد علی خان والاجاہ کے نام پر صادر ہوئے۔ تعداد میں یہ عنایت نامے (۱۸) ہیں اور سب کے سب اثنائے راہ سے صادر ہوئے ہیں، یہ عنایت نامے مختصر بھی ہیں اور طویل بھی، ان عنایت ناموں میں نواب ناصر جنگ نے مکرات و مرات شورش کے رفع کرنے پر اپنے عزم مصمم کا اظہار فرمایا ہے اور نواب والاجاہ کو مناسب ہدایات دیئے ہیں۔ مرتب مشارت نے ان عنایت ناموں کو غالباً تاریخ وار مرتب نہیں کیا ہے، بریں ہم ان کی تاریخی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ان عنایت ناموں سے واضح ہوتا ہے کہ ہمراہ رکاب کون کون سردار تھے دکن کے زمینداروں اور مرہٹہ سرداروں سے کس قسم کی مدد کی توقع تھی کرناٹک کے زمینداروں اور انگریزوں نے کیا مدد بہم پہونچائی، چھوٹے چھوٹے معرکوں کے کیا نتائج برآمد ہوئے، کس تاریخ کو کہاں مقام ہوا، مختلف دریائیں تنجرا بھیرا اور کرشنا و تنگ بھدرا کو کب عبور کیا گیا، فرانسیسی لوگوں پر عتاب کی وجہ کیا ہے، ایک عنایت نامہ میں حکم صادر فرمایا ہے کہ:۔

"باید کہ آں شہامت پناہ بہ تفحص و تفتیش، نقود و اجناس و امتعہ و اقمشہ قوم فرنگ سیس خرابورا ہرجا سراغ یابند و املاک و بیوتات آنہا را ہرجا باشد از قرار واقعی بضبط در آرند، ضبط اموال کسان پھول چری (پانڈی چری)، تنہا مقصود نیست از قوم اینہا در ہر بندرے کہ باشد یا بشراکت ای لوجہ باشد با اموال آنہا ضبط باید کرد۔

جہاز قومے کہ بید النشی کرد۔ ذکر را منزلت ما مذنہ سرما و اقوام دیگر فرنگی انگریز و ولندیز وغیرہ بجاکہ

اند آنہا را ہیچ نباید گفت و مزاحم احوال آنہا نباید شد، ہمین قوم فرنگ سیس کہ یکے از آنہا رفاقت باغی اختیار کردہ مورد عتاب گردیدہ، مخالفوں کے منصوبے کیا تھے، ان کی کامیابی اور ناکامی کی کیا صورتیں تھیں، راستہ میں کیا واقعات ظاہر ہوئے، ہمراہی عہدہ داروں نے وفاشعاری کے کیا مراتب انجام دیئے۔ راستہ میں جو مقابلے وقوع میں آئے اسکے نتائج کیا رہے، غنیمت میں کیا کیا مال حاصل ہوا، راستہ سے دوسرے اور لوگوں کے نام کس قسم کے احکام صادر ہوئے، باغیوں کی استمالت اور ان کے ساتھیوں سے کس قسم کا برتاؤ کیا گیا، ان سب امور کی ان عنایت ناموں سے صراحت ہوتی ہے۔

نواب محمد علی خان، والاجاہ کے موسومہ عنایت ناموں کے علاوہ نواب ناصر جنگ کا ایک عنایت نامہ موسومہ غلام مرتضیٰ خان قلعہ دار ویلور بھی اس مجموعہ میں شامل ہے۔

ان عنایت ناموں کے علاوہ اور جو بشارات اس مجموعہ میں شریک ہیں ان کا بھی مختصر تذکرہ کر دیا جاتا ہے۔

۱۔ نواب صلابت جنگ کا ایک عنایت نامہ موسومہ نواب محمد علی خان والاجاہ اس عنایت نامہ میں نواب والاجاہ کو اپنی مخالفت سے باز آنے کے لئے ایما کیا گیا ہے، اور ہدایت کی گئی ہے کہ ملک نواب حسین دوست خان چندا صاحب کے سپرد کر کے نواب والاجاہ دربار میں واپس چلے آئیں، ان سے دوسرا کام لیا جائے گا۔

۲۔ نواب صلابت جنگ کا عنایت نامہ نواب حسین دوست کے نام پر، اس مضمون کا کہ نواب والاجاہ کی بقرار واقعی تنبیہ کی جائے۔

۳۔ نواب صلابت جنگ کا عنایت نامہ گورنر مدراس کے نام پر۔ اس عنایت نامہ میں یہ صراحت کی گئی ہے کہ بادشاہ کی جانب سے صوبہ داری کا فرمان حاصل ہو چکا ہے، ترچناپلی کا علاقہ نواب والاجاہ کی بجائے نواب حسین دوست خان کے سپرد کیا گیا ہے، کیوں مدراس سے نواب والاجاہ کے لئے مدد روانہ کی گئی؟ چاہیئے کہ اپنے کام سے کام رکھیں جو یہ ہے کہ تجارت اور خرید و فروخت، آخر میں لکھا ہے کہ:-

"اگر باوجود ممانعت دست از رفاقت و موافقت برنخواهند داشت زود مکافات خواهند دید" از راہ نصایح و لطف نوشتہ شد کہ بے جہت خود را بد نام کردن فائدہ ندارد و نظر بہ بندگیہائے موروثی کہ در جناب حضرت علیہ الرحمٰن والرضوان بود برہمان و تیرہ خود ثابت قدم و قایم باشند والا ہرچہ خواہند دید از خود خواہند دید" و دریں باب تاکید دانند"

۴۔ نواب والاجاہ کی عرضداشت نواب ناصر جنگ کی خدمت میں بعض تدابیر جنگ کے متعلق اور ملک کے جغرافیائی حالات کی توضیح، پانڈیچری کی تسخیر کا فائدہ اور اسکے مواقع۔

۵۔ نواب والاجاہ کی عرضداشت نواب صلابت جنگ کی خدمت میں برائے عطا سند معاش بہ سلسلہ مقبرۂ والد خود،

۶۔ نواب شہ نواز خان کا مکتوب نواب والاجاہ کے نام پر۔

۷۔ نواب والاجاہ کا مکتوب نواب شہ نواز خان کے نام پر کرناٹک کی صوبہ داری کے متعلق۔

۸۔ نواب والاجاہ کا خط تہور جنگ کے نام پر، اس وقت کے حالات جب کہ نواب ناصر جنگ شہید کرناٹک میں تشریف فرما تھے،

۹۔ نواب والاجاہ کا مکتوب نواب عبدالحکیم خان کے نام پر، نواب ناصر جنگ کی شہادت کے بعد جو واقعات ظاہر ہوئے ان کی تفصیل، مشہور محاصرۂ آرکاٹ اور نواب حسین دوست خان چندا صاحب کے قتل کی تفصیلات۔

غرض ان مکاتیب کو تاریخ کی کتابوں کی روشنی میں مرتب کیا جائے تو بہت سارے کارآمد امور کی توثیق و تصدیق ہوگی۔

تاریخی کاغذات کے ذخیرے

از محمد غوث صاحب ایم۔ اے

کتب خانۂ سعیدیہ میں دفتر والاجاہی دکرناٹک، کا جو حصہ محفوظ ہے اس میں ایک مجموعہ ان عنایت ناموں کا بھی موجود ہے جو روسائے آصفیہ کی جانب سے تنجاورکے راجہ کے نام پر صادر ہوئے۔

یہ تو معلوم ہے کہ حضرت آصف جاہ اول کے زمانہ میں اور نواب ناصر جنگ شہید کی مسند نشینی کے وقت جنوبی ہند کے راجہ اور نواب سب کو اپنی سلامتی کے لئے آصف جاہی زلہ ربائی ضروری تھی۔ تنجاورکے اس زمانہ کے راجہ، پرتاب سنگھ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھے، عنایت ناموں کے اس مجموعہ سے واضح ہوتا ہے کہ راجہ پرتاب سنگھ نے بھی نواب ناصر جنگ شہید سے عقیدت کا اظہار کیا، نذرگزرانی اور تعمیل احکام کا یقین دلایا، شہادت مآب کی پیشگاہ سے بھی الطاف و عنایات کا اظہار ہوا، اور عنایت نامے پر دستخط و مہر خاص نافذ ہوئے۔

مجلۂ طیلسانیین کی اس اشاعت کے لئے یہ امر مناسب متصور ہوا کہ عنایت ناموں کے اس مجموعہ میں سے دو عنایت ناموں کے عکس طبع کرائے جائیں۔ دونوں عنایت ناموں کے متعلق ضروری تصریح ذیل میں قلم بند کی جاتی ہے۔

(۱)

یہ عنایت نامہ حضرت آصف جاہ اول کی جانب سے صادر ہوا ہے اس پر مہر خورد ثبت ہے مہر کی عبارت یہ ہے۔

"نظام الملک آصف جاہ ۱۱۲۹"

عنایت نامہ کے آخر پر صحیح خاص بھی ثبت ہے۔

عنایت نامہ کی عبارت یہ ہے۔

---

(۱) صحیح سے مراد وہ علامت ہے جو خط کے آخر پر کاتب اپنے قلم سے درج کرتا تھا۔
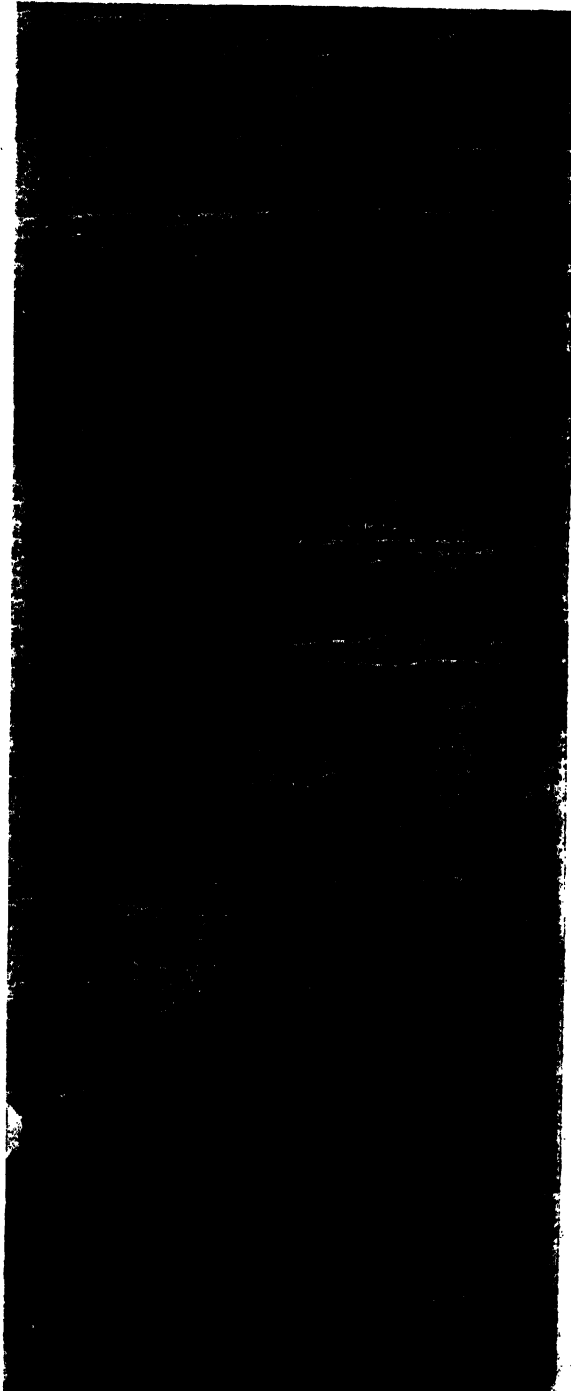
حضرت آصف جاہ اول کا عنایت نامہ بنام راجۂ تنجاور

"ہوالکریم"

شہامت و جلادت دستگاہا

دریں ولا شہامت پناہ راؤ جانوجی نوشتہ کہ کسا[illegible]باوت دستگاہ نقد و جنس و اسپان کسان مرار راو را متصرف شدہ اند، لہٰذا نوشتہ می شود کہ آنچہ متصرف شدہ باشند تاکید نمودہ حوالہ راو جانوجی نمایند۔ زیادہ چہ نوشتہ شود (بیض خاص)

مطلب یہ ہے کہ راؤ جانوجی کی تحریر سے واضح ہوا کہ تمہارے علاقہ کے لوگوں نے مرار راؤ کے مال و اسباب پر اپنا تصرف کیا ہے لہٰذا لکھا جاتا ہے کہ یہ مال طالب راو جانوجی کے سپرد کر دیا جائے

یہ عنایت نامہ اس سے پہلے کسی مجلہ میں طبع نہیں ہوا عکس اور متن پہلی مرتبہ شائع کئے جاتے ہیں۔

یہ عنایت نامہ نواب ناصر جنگ کی جانب سے راجہ پرتاب سنگھ کے نام پر صادر ہوا۔

اس پر جو مہر ثبت ہے اسکی عبارت صاف اور مختصر یوں ہے "نظام الدولہ ۱۱۵۲"

یہ عنایت نامہ اس زمانہ میں صادر ہوا جب کہ نواب ناصر جنگ شہید، حافظ ہدایت محی الدین خان مظفر جنگ کی شورش کے انسداد کی غرض سے کرناٹک کے جانب رہ سپار تھے، عنایت نامہ کے مضمون سے واضح ہے کہ وہ اثنائے سفر سے صادر ہوا ہے۔

بیض[1] خاص ثبت ہونے کے علاوہ اس عنایت نامہ کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس پر نواب ناصر جنگ شہید کی خود نوشتہ تحریر بھی درج ہے جس کو اصطلاحاً "شرح دستخط خاص" کہا جاتا ہے[2]

عنایت نامہ کی نگارش یوں ہے۔

"ہوالکریم"

شہامت و جلالت دستگاہا

---

[1] بیض سے مراد وہ علامت ہے جو خط کے آخر پر کاتب اپنے قلم سے درج کرتا تھا۔

[2] جس تحریر پر اسکے بیضہ ہونے کے بعد عبارت جو خاص درج کیا جاتا ہے اسکو شرح [illegible] کہتے ہیں۔

"بنصرت و تائید الٰہی موکب منصور بارادہ تنبیہ باغیاں قریب رسیدہ، باید آں شہامت پناہ با جمعیت
شایستہ خود را بحضور رسانیدہ در قتل و اسیر [illegible] مفسدان ترددات نمایاں شوند۔ زیادہ چہ نوشتہ شود،
(شرح دستخط) شنیدہ شد [illegible] اشقیا [illegible] رسیدہ و با [illegible] قاہرہ و سرداران نامی عنقریب می رسند،
خود بخود اشقیا خود را گرفتار وبال و نکال کردہ اند، در صورتیکہ ہمانجا ہستند و فوج متعلقہ برسد آنہا را جائے
گریز ہم نمی ماند، دریں وقت استقلال از دست ندہند، ہمیں کہ فوج متعلقہ رسید محمد علی خان کہ ملقب بہ انوار الدین
خان شدہ یقین کہ شریک فوج متعلقہ خواہد شد، از چہار طرف اشقیا را در میان گرفتہ قسمے تنگ باید کرد کہ از جان
بتنگ آیند، دریں صورت گروہ نکبت پژوہ آنہا پراگندہ می شود و تاہم با لشکر قیامت اثر لبسر وقت انتہای
رسیم بحول و قوۃ الٰہی"

عنایت نامہ کے متن کا مطلب یہ ہے کہ باغیوں کی تنبیہ کے لئے ہم قریب پہونچ چکے ہیں، تمہیں بھی
چاہیئے کہ اپنی فوج لیکر لشکر میں شامل ہو جائیں اور باغیوں کے قتل اور قید کرنے میں نمایاں کوشش عمل میں لائیں،

شرح دستخط خاص کا مطلب یہ ہے کہ معلوم ہوا ہے کہ باغی لوگ ابھی وہاں ہیں عنقریب افواج قاہرہ
اور سرداران نامی پہونچتے ہی ہیں، ان اشقیا نے اپنے آپ کو گرفتار وبال کر لیا ہے اگر وہ اسی مقام پر رہیں اور
فوج پہونچ جائے تو بھاگنے کی جگہ بھی نہیں رہے گی۔ اس وقت استقلال کو ہاتھ سے جانے نہ دینا چاہیئے، جونہی فوج
پہونچ جائے یقین ہے کہ محمد علی خان جو والا جاہ ہیں بھی پہونچ جائیں گے۔ اشقیا کو چار طرف سے گھیر کر اس طرح تنگ
کرنا چاہیے کہ اپنی جان سے تنگ آ جائیں، اس صورت میں باغیوں کا گروہ پراگندہ ہو جائے گا، یہیں ہم لشکر
قیامت اثر کے ساتھ ہم بھی آ رہے ہیں۔

واضح ہو کہ یہ عنایت نامہ اس مجموعہ کے دوسرے عنایت ناموں کے ساتھ مع ضروری یادداشتوں
کے رسالہ معارف اعظم گڈھ کی جلد ۱۳ نمبر ۳ میں طبع کرایا گیا تھا لیکن اس کا عکس اب تک شائع نہ ہوا تھا۔

حضرت ناصر جنگ شہید کا عنایت نامہ بنام راجۂ تنجاور

"بنصرت وتائید الٰہی موکب منصور باراده تنبیہ باغیاں قریب رسیده، باید آں شہامت پناه با جمعیت
شایستہ خود بحضور رسانیده در قتل و اسیر [illegible] مصدر خدمات نمایاں شوند۔ زیاده چہ نوشتہ شود فقط۔
(شرح دستخط) شنیده شد [illegible] اشقیا ہمانجا اند و بار آمدن افواج قاہره و سرداران نامی عنقریب می رسند،
خود بخود اشقیا خود را گرفتار وبال و نکال کرده اند، در صورتے کہ ہمانجا ہستند و فوج متصلاً برسد آنہا را جائے
گریز ہم نمی ماند، دریں وقت استقلال از دست ندہند، ہمیں کہ فوج متصلاً رسید محمد علی خان کہ ملقب بہ انور الدین
خان شده یقین کہ شریک فوج متصلاً خواہد شد، از چہار طرف اشقیا را در میان گرفتہ قسمے تنگ باید کرد کہ از جان
بتنگ آیند، دریں صورت گروه نکبت پژوه آنہا پراگنده می شود و تاہم با لشکر قیامت اثر بسر وقت آنہا می
رسیم بحول و قوة الٰہی"

عنایت نامہ کے متن کا مطلب یہ ہے کہ باغیوں کی تنبیہ کے لئے ہم قریب پہونچ چکے ہیں، تمہیں بھی چاہیئے کہ اپنی فوج لیکر لشکر میں شامل ہو جائیں اور باغیوں کے قتل اور قید کرنے میں نمایاں کوشش عمل میں لائیں،

شرح دستخط خاص کا مطلب یہ ہے کہ معلوم ہوا ہے کہ باغی لوگ ابھی وہاں ہیں عنقریب افواج قاہره اور سرداران نامی پہونچتے ہی ہیں، ان اشقیا نے اپنے آپ کو گرفتار وبال کر لیا ہے اگر وه اس مقام پر رہیں اور فوج پہونچ جائے تو بھاگنے کی جگہ بھی نہیں رہے گی۔ اس وقت استقلال کو ہاتھ سے جانے نہ دینا چاہیئے۔ جونہی فوج پہونچ جائے یقین ہے کہ محمد علی خان والا جاه بھی پہونچ جائیں گے۔ اشقیا کو چار طرف سے گھیر کر اس طرح تنگ کرنا چاہیے کہ اپنی جان سے تنگ آ جائیں، اس صورت میں باغیوں کا گروه پراگنده ہو جائے گا، بعد میں ہم لشکر قیامت اثر کے ساتھ ہم بھی آتے ہیں۔

واضح ہو کہ یہ عنایت نامہ اس مجموعہ کے دوسرے عنایت ناموں کے ساتھ مع ضروری یادداشتوں کے رسالہ معارف اعظم گڑھ کی جلد ۱۳ نمبر ۱ میں چھپ گیا تھا لیکن اس کا عکس اب تک شائع نہ ہوا تھا۔

حضرت ناصر جنگ شہید کا عنایت نامہ بنام راجۂ تنجاور

تنقید و تبصرہ

(۱) ہندوستان کے آثار قدیمہ

یہ مولوی غلام یزدانی صاحب ناظم آثار قدیمہ ریاست حیدرآباد کا ایک مقالہ ہے جو اُردو اکاڈیمی میں پڑھا گیا تھا۔ اس موضوع پر یزدانی صاحب سے بہتر کہنے کا کوئی حق نہیں رکھتا لیکن ہندوستان کے آثار قدیمہ ایک بہت بڑا موضوع ہے اور ایک چھوٹا سا مقالہ آثار قدیمہ سے دلچسپی رکھنے والوں کو مطمئن کرنے کی بجائے اولٹا بے چین کر دیتا ہے۔ یزدانی صاحب فرماتے ہیں" حال میں مجھے یہ بھی حکم دیا گیا ہے کہ سر جان مارشل کی معیت میں ہندوستان کے قدیم آثار کی ایک جامع تاریخ لکھوں۔ چنانچہ آج کل ہم دونوں اس کام میں معروف ہیں"۔ زیر تنقید مقالہ ۱۹۳۷ء میں پڑھا گیا تھا، اور ہمیں نہیں معلوم کہ اوس جامع تاریخ کا کام اب کس نوبت پر ہے لیکن کتاب جب بھی شایع ہو بڑی قابل قدر ہوگی۔ موجودہ مقالہ کو بھی پڑھنے کے بعد دلوں میں ان کی عظمت کا احساس تو ضرور پیدا ہو جاتا ہے اور ایک اُمنگ پیدا ہوتی ہے کہ اس مضمون کا تفصیل سے مطالعہ کیا جائے اور اس مختصر مقالہ سے غالباً غرض بھی یہی تھی کہ اسکے پڑھنے والوں کے دلوں میں آثار قدیمہ سے دلچسپی لینے کا شوق پیدا ہو۔ مقالہ نہایت اچھے کاغذ پر اچھی کتابت وطباعت کے ساتھ شایع ہوا ہے۔ آثار قدیمہ کی مختلف تصویریں بھی شریک کی گئی ہیں۔ کتاب مجلد ہے اور مکتبہ جامعہ دہلی سے شایع ہوئی ہے لیکن قیمت درج نہیں ہے۔ ک۔ ا

(۲) جنگ ۱۹۳۹ء کیوں ہوی؟

یہ کتاب "عبدالحق اکاڈیمی" (حیدرآباد دکن) سے شایع ہوئی ہے اور بقول ناشران "دنیا کے سب سے بڑے موضوع یعنی موجودہ جنگ سے متعلق ہے۔ ہمیں اس میں بہت شبہ ہے کہ دوران جنگ

ہیں جنگ کے اسباب سے متعلق کوئی اچھی کتاب لکھی جاسکتی ہے۔ "دنیا کے سب سے بڑے موضوع" پر چھوٹے سائز کے ڈیڑھ سو صفحات کی کتاب کچھ زیادہ روشنی بھی نہیں ڈال سکتی اسلئے ہمیں تعجب ہے کہ "عبدالحق اکاڈیمی" میں اس کتاب کو اشاعت کے لئے کیوں منتخب کیا گیا۔ ناشران خود اس سوال کا جواب اس طرح دیتے ہیں۔

"آپ سوال کرینگے کہ عبدالحق اکاڈیمی نے علم و ادب کی کوئی معیاری کتاب آپ کے لئے کیوں نہ منتخب کی۔ عبدالحق اکاڈیمی بھی چاہتی تھی۔ مگر آج کل آپ کو ایسی کتاب پڑھنے اور اس سے فائدہ اوٹھانے کی فرصت ہے؟ ہم نہیں چاہتے تھے کہ آپ کے ذوق پر بار ڈالیں"

اس جواب سے متعلق ہم کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے اور ہم نے جو کچھ لکھا ہے اوسکا یہ مطلب نہیں ہے کہ کتاب مفید یا دلچسپ نہیں ہے۔ آج کل ہر شخص جنگ سے متعلق اپنی معلومات کو مکمل اور اپنے حافظہ کو تازہ رکھنا چاہتا ہے۔ کتاب میں جنگ سے قبل کے بہت سے واقعات ترتیب وار درج ہیں اور کتاب ختم ہونے کے بعد اون واقعات پر ایک نظر ڈالنے کو جی چاہتا ہے۔ کاغذ و طباعت کی اس گرانی کے زمانہ میں کتاب کی قیمت ۱۲ زیادہ نہیں ہے۔ طباعت و کتابت اچھی ہے اور اچھا کاغذ استعمال نہ کرسکنے کی مجبوریاں قوی ہیں۔ فولڈنگ جلد خوبصورت ہے۔ ہم کتاب کے مطالعہ کی سفارش کرتے ہیں۔

ک۔ و

(۳) خنداں

خنداں اور دوسرے مضامین، مصنف پروفیسر رشید احمد صدیقی صدر شعبہ اردو علی گڈھ یونیورسٹی۔ ناشر مکتبہ جامعہ دہلی، حجم (۲۸۱) صفحات قیمت (عہ) یہ وہ مضامین ہیں جو آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن دہلی سے نشر کئے گئے اور اب بہ اجازت نشرگاہ شایع ہوئے ہیں،

اردو زبان میں مزاحیہ نویسی یا ظرافت نگاری کی ابتدا نظیر سے قرار دی جاسکتی ہے، گو اس زمانہ میں اسکو حقارت کی نظر سے دیکھا گیا تھا، لیکن بعد میں یہ عیب ہنر بن گیا، بہرحال نظیر اکبرآبادی نے

اردو میں طنز نگاری کی بنا ڈالی، اس کے بعد عرصہ دراز تک اس ڈگر پر چلنے والا کوئی نہیں تھا، انیسویں صدی کے آخر میں منشی سجاد حسین مرحوم نے اخبار اودھ پنچ کے ذریعہ نثر میں مزاحیہ نویسی شروع کی، منشی صاحب مرحوم کو چند اور ساتھی بھی مل گئے، مثلاً سرشار، ستم ظریف اور حضرت اکبر الہ آبادی وغیرہ، اودھ پنچ اور اودھ اخبار کے بعد جو سجاد حسین اور سرشار کی ادارت میں شایع ہوتے تھے پھر ظرافت نگاری پر اوس پڑ گئی تھی، اب بیسویں صدی میں جو مزاحیہ نگاری ہو رہی ہے یہ مغربی مضراب کا ایک سر ہے، مغربی ادب کی تقلید میں اب اردو میں مزاحیہ نویسی ہوتی ہے، اس وقت شمالی ہند، پنجاب، اور دکن میں کئی ایک اہل قلم نے مزاحیہ نویسی میں نام پیدا کیا ہے، مثلاً شمال میں پروفیسر رشید احمد، پطرس، عظیم بیگ مرحوم، شوکت تھانوی، ملا رموزی، یم اسلم، حجاب امتیاز علی، عصمت چغتائی وغیرہ اور دکن میں مرزا فرحت اللہ بیگ، ناکارہ اور آصف جہاں بیگم کے نام اس عنوان کے تحت پیش کئے جا سکتے ہیں۔

ان مزاحیہ نگاروں کی طرز نگارش میں بڑا فرق ہے ہر ایک کا مذاق جداگانہ ہے، کوئی سیرت نگاری میں مزاحیہ نگاری کرتا ہے، کوئی طنز کے ذریعہ ہماری خامیوں کو ظاہر کرتا ہے، اور کوئی زبان کی لطافت اور اسلوب بیان کے ذریعہ ہنسی کا سامان مہیا کرتا ہے۔

پروفیسر رشید احمد طنزیہ نگاری کے استاد ہیں، رمز اور کنایہ کے ذریعہ اپنا مافی الضمیر ظاہر کرتے ہیں، اپنے ذاتی جذبات اور احساسات کو طنزیاتی انداز میں پیش کرتے ہیں، جن کو پڑھنے والا مذاق سمجھ کر ٹال نہیں سکتا، اگرچہ ان کے مضامین عام فہم نہیں ہوتے، ان کو ہر شخص نہیں سمجھ سکتا، اور اسکو وہی سمجھ سکتا ہے جس کو تاریخ اور سیاسیات میں اچھی طرح دخل ہو، مگر زیر نظر مجموعہ میں یہ بات نہیں ہے، کیونکہ یہ ریڈیو کے لئے لکھے گئے ہیں، اس لئے ان کو عام فہم ہونے کے علاوہ ہر طبقہ اور ہر عمر کے لوگوں کے استفادہ کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے اس کے ساتھ ریڈیو کی نشری تقریریں ہونے کے لحاظ سے کئی اور شرایط بھی ہوتی ہیں۔ مثلاً زبان ایسی ہو جس کو زیادہ لوگ سمجھ سکیں، یہ تقریریں صرف پندرہ منٹ کی ہوں، اور پھر اس کے ساتھ ہی ریڈیو والے کاٹ چھانٹ کا حق بھی رکھتے ہیں، بلکہ اکثر مباحث او عنوان خود ریڈیو والوں کی جانب سے مقرر ہوتے ہیں،

جب یہ شرائط ہوں تو ظاہر ہے کہ مضمون لکھنا کس قدر دشوار ہے، کیونکہ اول تو طنزیہ مضمون لکھنا دشوار ہے اور پھر جب اس میں کئی شرائط ہوں تو اس کا لکھنا دشوار تر ہو جاتا ہے طنزیہ مضمون میں ذرا سی لغزش ہو جائے تو پورا مضمون بے کار ہو جاتا ہے۔ مگر یہ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ پروفیسر رشید احمد صاحب نے نہایت کامیابی کے ساتھ اس میدان کو طے کیا ہے سخت سے سخت نکتہ چیں بھی اعتراض کرنا چاہے تو اس کو مشکل سے کامیابی ہوگی۔

"خنداں" میں کل (۲۹) تقریریں شامل ہیں جن کو پانچ عنوانوں میں تقسیم کیا گیا ہے یعنی ادھر اُدھر، چند معروف اور غیر معروف ہستیاں، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا، چند خاکے، طنزیات"

ہر نوعیت کے چند عنوان یہاں پیش کئے جاتے ہیں مثلاً ریڈیو سننے والے احمق کی جنت، ہوٹل میں ریڈیو، دعوت وغیرہ۔ خنداں، ایڈیٹر فدوی، لیڈر بابو، بہرو وغیرہ، اگر میں فاونٹن پن ہوتا، اگر میں چور ہوتا، الکشن، عدالت، بیمہ کا ایجنٹ، عاشق، ناصح، رقیب وغیرہ،

ان عنوانات سے واضح ہوگا کہ پروفیسر رشید نے کیا کیا موضوع انتخاب کئے ہیں، اور پھر ان کی نوعیت جس طرح جداگانہ ہے وہ بھی مخفی نہیں، لیکن اس کے باوجود پروفیسر رشید صاحب نے جس قابلیت سے ان کو لکھا ہے وہ خاص ان ہی کا حصہ ہے حق یہ ہے کہ کوئی اور شخص اس میدان میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

اُن کتابوں کی رسید جو مجلہ میں تنقید کے لئے وصول ہوئیں

۱۔ قائد ملت نواب بہادر یار جنگ بہادر کی مختصر سوانح، تالیف مولوی عبدالرحمٰن سید حبیب صاحب صدیقی بی اے (عثمانیہ)، ناشران سید علی شبر حاتمی بی ایس سی (عثمانیہ) اور چودھری اقبال سلیم گاہندری۔ قیمت ۸/ کتب خانہ انجمن ترقی اردو ہند عابد روڈ حیدرآباد دکن سے مل سکتی ہے۔

۲۔ "محمد رسول اللہ"، ٹامس کارلائل کے مقالہ کا ترجمہ۔ مترجم مولانا عبیدالرحمٰن عاقل رحمانی۔ ناشر کتابستان، پوسٹ بکس ۱۹۶۱ بمبئی نمبر ۳ قیمت ۸/

۳۔ جواہر العلوم۔ علامہ طنطاوی جوہری مصری کی عربی کتاب کا اُردو ترجمہ۔ مترجم مولوی فاضل

عبدالرحیم صاحب استاذ عربی اسلامیہ کالج پشاور۔ ناشر کتابستان، پوسٹ بکس ۲۱۶۴ بمبئی نمبر ۳۔ قیمت دو روپیے۔

۴۔ شان خدا۔ تالیف مولانا عبیدالرحمن صاحب عاقل رحمانی، ناشر کتابستان، پوسٹ بکس ۲۱۶۴ بمبئی نمبر ۳۔ قیمت ایک روپیہ۔

۵۔ جنگ ۱۹۳۹ء کیوں ہوئی تالیف شیخ رحمن بخش صاحب بی اے ال ال بی ناشر عبدالحق اکیڈمی حیدرآباد دکن (قیمت ۱ر) تبصرہ اس شمارہ میں کیا گیا ہے،

انجمن طیلسانین عثمانیہ کے کتب خانہ میں جدید اضافہ

سررشتۂ تالیف و ترجمہ جامعۂ عثمانیہ سے مندرجہ ذیل کتابیں تحفتہً وصول ہوئی ہیں:۔

۱۔ علم امراض النساء، جلد اول ترجمۂ ڈاکٹر غلام دستگیر صاحب، ۲۔ علم طب جلد دوم، ترجمۂ ڈاکٹر محمد عثمان خان صاحب۔ ۳۔ تاریخ فلاسفۃ الاسلام، ترجمۂ ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب ۴۔ بحری ولی نراشیں ترجمہ محمد نذیرالدین صاحب۔ ۵۔ مضبوطیٔ اشیاء، ترجمۂ ضیاءالدین صاحب انصاری ۶، اصول قانون معاہدۂ انگلستان، ترجمۂ حسین علی مرزا صاحب۔ ۷، فتوح البلدان، حصۂ دوم، ترجمۂ سید ابوالخیر صاحب مودودی۔ ۸، تغیروں کا نظریہ (ادتجزیہ) ترجمۂ ضیاءالدین صاحب انصاری۔ ۹، تاریخ انگلستان حصۂ دوم، ترجمۂ سید ہاشمی صاحب فرید آبادی، ۱۰، تاریخ طبری، جلد اول، حصۂ چہارم ترجمۂ سید محمد ابراہیم صاحب۔ ۱۱، مقدمہ فلسفۂ حاضرہ، ترجمۂ ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب۔ ۱۲، فلزیات، ترجمۂ محمد عبداللہ حسین صاحب۔ ۱۳، اسفار اربعہ، حصۂ اول، جلد اول، ترجمۂ سید مناظر احسن صاحب گیلانی۔ ۱۴، قانون ورواج ہنود، جلد اول ترجمۂ اکبر علی صاحب موسوی۔ ۱۵، امراض چشم، ترجمہ ڈاکٹر محمد عثمان صاحب

مندرجہ ذیل کتابیں سررشتۂ معلومات عامہ سے وصول ہوئیں۔

۱، رپورٹ نظم و نسق سررشتۂ کورٹ آف وارڈز۔ ۲، رپورٹ سررشتۂ طبابت یونانی ۱۳۴۹ف ۳، رپورٹ سررشتۂ جسٹریشن ۱۳۴۵ف ۴، رپورٹ نظم و نسق ممالک آصفیہ ۵، رپورٹ سررشتۂ کوتوالی بلدہ ۱۳۴۶ف

۶، رپورٹ بلدیہ حیدرآباد سنہ ۱۳۴۵ف

کتب مندرجہ ذیل بطور عطیہ وصول ہوئے۔

۱، سلیس اردو، مرتبہ انجمن ترقی اردو حیدرآباد۔ ۲، سر سید احمد خان، ۳، دفتری معلومات کتب نمبر ۲ و ۳ کے مولف ظہیر الدین احمد صاحب ایم اے ایچ سی ایس ہیں۔

کتب خانہ معاشی کمیٹی حیدرآباد میں جدید اضافہ

۱، تربیت جنگلات، تالیف ابو یوسف احمد محی الدین حسین فاروقی مرحوم۔ ۲، معرف جنگلات، تالیف ابو یوسف احمد محی الدین حسین فاروقی مرحوم۔ ۳، رپورٹ ٹکنیکل کالج سنہ ۱۳۵۰ف و سنہ ۱۳۵۱ف دو جلد۔ ۴، رپورٹ سررشتہ جنگلات سنہ ۱۳۴۵ف۔ ۵، اقتصادی ہند، تالیف برج نارائن صاحب ایم اے۔ ۶، ہندوستان کا دیہی قرض تالیف پروفیسر محمد عاقل صاحب ایم اے۔ ۷، ہمارے مزدور، تالیف محمد عبدالقادر صاحب بی ایس سی آنرز (لندن)، ۸، ہماری ریلیں اور سڑکیں، تالیف ڈاکٹر جعفر حسن صاحب۔ ۹، رپورٹ نظم و نسق سررشتہ کروڑگیری سنہ ۱۳۴۹ف۔ ۱۰، رپورٹ سررشتہ علاج حیوانات، ۱۱، کسان، تالیف چودھری مختار سنگھ۔ ۱۲، علم دولت، تالیف برج نارائن صاحب ایم اے ۱۳، مالیات عامہ اور ہمارے افلاس کے اسباب، ترجمہ قاضی محمد حسین صاحب۔ ۱۴، جاگیرداری، تالیف عبداللہ ملک صاحب۔ ۱۵، مشین اور مزدور تالیف کامریڈ باری صاحب۔ ۱۶، سوشلیزم شایع کردہ مکتبہ اردو لاہور۔ ۱۷، سرمایہ داری، تالیف عبداللہ ملک صاحب۔ ۱۸، مبادی معاشیات، تالیف ذاکر حسین خاں صاحب ۱۹، روپیہ، تالیف حسین بن حسن نظامی صاحب، ۲۰، مفہوم زر، تالیف رشید احمد صاحب۔ ۲۱، اصول و طریق محصول، تالیف حبیب الرحمن صاحب ایم اے بی ایس سی آنرز (لندن)۔ ۲۲، مبادلات تالیف رشید احمد صاحب ۲۳، اصول معاشیات، تالیف رشید احمد صاحب، ۲۴، دنیا کی موجودہ کساد بازاری کے اسباب، تالیف حبیب الرحمن صاحب ایم اے، بی ایس سی آنرز (لندن) ۲۵، تبویب حیدری، تالیف فضل اللہ احمد صاحب۔

۲۵، اصطلاحات پیشہ وران، جلد اول و دوم، تالیف ظفر الرحمن صاحب دہلوی، ۲۶، رپورٹ سررشتہ زراعت ۲۷، رپورٹ تنظیم اقتصادی تالیف نواب معشوق یار جنگ بہادر، ۲۸، رویداد حیدرآباد اکونومیکل کانفرنس سن ۱۳۴۵ف جلد

۲۹، سود خوار کی سود خوری (؟)، شائع کردہ مدار المہام (؟)، ۳۰، ضلع پٹنہ کی معاشی تحقیق، تالیف محمد ناصر علی صاحب ایم اے۔
۳۱، سکھی کسان، تالیف محمد عبدالحمید صاحب۔ ۳۲، مسلمانوں کی صنعت و حرفت زراعت اور تجارت، تالیف خان کریم، ترجمہ جمیل الرحمٰن مرحوم، ۳۳، اسلام اور اشتراکیت، تالیف مسعود عالم صاحب۔
۳۴، ہماری غذا، شائع کردہ انجمن ترقی اردو ہند، ۳۵، اسلام کا اقتصادی نظام، تالیف محمد حفیظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی۔ ۳۶، معاہدۂ عمرانی از روسو ترجمۂ ڈاکٹر محمود حسین خان صاحب
۳۷، ہمارا ہندوستان تالیف مسانی ترجمہ نواب منظور جنگ بہادر۔ ۳۸، اصطلاحات پیشہ وران، جلد سوم تالیف ظفر الرحمٰن صاحب۔ ۳۹، برطانیہ اور امداد باہمی تالیف اے، ایم سانڈرس، ۴۰، مناظر امداد باہمی، تالیف ایم، ایل ڈارلنگ، ۴۱، امداد باہمی اور ہندوستان، تالیف پی مکرجی۔ ۴۲، معاشیات دیہات، تالیف تھامس ٹکسن۔ ۴۳، امداد باہمی۔ ۴۴، رہنمائے امداد باہمی تالیف سی، ایف کلنٹن۔ ۴۵، جمہوریت امداد باہمی، ایف، سی، ہو ۴۶، مالیات دیہات، تالیف ایم ڈی ہیرک۔ ۴۷، آئینہ پنجاب، تالیف ایچ کیلورٹ۔ ۴۸، چراغ ہدایت، تالیف سید مصطفیٰ علی صاحب
۴۹، معاشیات، حبیب الرحمٰن صاحب ایم اے، بی ایس سی، آنرز (لندن)
۵۰، رپورٹ سررشتۂ آبکاری، جلد ۱۳۳۰-۳۶ف

کتب از نمبر ۳۹ تا ۴۷ پنجاب کوآپریٹو یونین لاہور کی شائع کردہ ہیں۔

۵۱. (AGRICULTURAL ECONOMIC RESEARCH) تالیف حبیب الرحمٰن صاحب
۵۲. (INDIGENOUS BANKING) تالیف ڈاکٹر انور اقبال صاحب
۵۳. (POULTRY SURVEY REPORT) مرتبۂ سررشتۂ زراعت سرکار عالی
۵۴. (SUGAR CANE CULTIVATION) مرتبۂ راؤ بہادر ٹی ایس وینکٹ رامن
۵۵. (FRUIT SURVEY) مرتبہ ایم آر سدراما
۵۶. (ECONOMIC HISTRY OF INIA) تالیف رومیش چندر دت
۵۷. (PRINCIPLES OF PUBLIC FINANCE) تالیف آمد الٹن

(ENGLISH INDUSTRIAL HISTRY) تالیف شیشگری راو ام اے

(OUTLINES OF ENGLISH INDUSTRIAL HISTRY) تالیف ڈبلیو کننگ ہام ، ڈی ڈی

رہبر نمائش مصنوعات ملکی بابتہ ۱۳۵۱ ف

مولفہ

خواجہ حمید احمد صاحب بی اے (عثمانیہ)

چند گراں قدر تبصرے

ہز ہائنس پرنس آف برار حضرت ولی عہد بہادر بالقابہ

”اس مرتبہ نمائش کے حالات کی کیفیت ایک کتابچہ کی شکل میں شائع کی جا کر ایک بہت بڑی ضرورت کو پورا کیا گیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ ارشاد شاہانہ جس سے کتاب کے سرورق کو مزین کیا گیا ہے شمع ہدایت کا کام دے گا اور نمائش ملکی صنعتوں کی موثر تشہیر اور ترقی کا باعث ہوگی۔“

سر ایم وشویشرایا کے سی۔ آئی۔ ای

”میں نے رہبر نمائش بابتہ سنہ ۱۹۴۱-۴۲ء کا خاص دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کیا اس میں اعلیٰ حضرت حضور نظام کی قلمرو کی چوتھی صنعتی نمائش کی بعض موثر خصوصیات درج ہیں۔

”رہبر مذکور میں نمائش کے مقاصد اس وسیع سلطنت کی معاشی صلاحیتیں نمائش میں سرکار عالی کے مختلف محکموں نے جو دلچسپی لی ہے اور انجمن طیلسانین عثمانیہ کی کارگذاری اجمالی طور پر واضح کی گئی ہیں اس ضمن میں انجمن طیلسانین عثمانیہ نے جو ایک مستقل ادارہ ہے اپنی مساعی سے اس تحریک کی جو رہبری کی وہ عامۃ الناس سے خراج تحسین حاصل کرنے کی مستحق ہے۔“

رعایتی قیمت دو روپیہ سکہ عثمانیہ ملنے کا پتہ دفتر مجلس نمائش معاشی کمیٹی معظم بلڈنگ حیدرآباد

معاشی کتب خانہ کا قیام

زیر اہتمام معاشی کمیٹی (انجمن طیلسانین عثمانیہ)

اس کتب خانہ میں علم معاشیات کے نظری اور عملی کتب کے علاوہ حسب ذیل شعبہ جات سے متعلق کتب، رپورٹیں، رسائل اور اخبارات جمع کئے جا رہے ہیں۔ (۱) زراعت (۲) جنگلات (۳) تنظیم دیہی (۴) معدنیات (۵) آبپاشی (۶) آبکاری (۷) صنعت و حرفت (۸) مالیات (۹) تجارت (۱۰) بنک کاری (۱۱) بیمہ (۱۲) امداد باہمی (۱۳) تحریک مزدوران (۱۴) ساہوکارہ (۱۵) ریلوے (۱۶) مشترکہ سرمایہ دار ادارے (۱۷) کارخانہ جات (۱۸) بازارات (۱۹) اعداد و شمار (۲۰) تعمیرات (۲۱) گداگری (۲۲) بے روزگاری۔

حیدرآباد میں یہ کتب خانہ اپنی نوعیت کا پہلا واحد فنی کتب خانہ ہوگا۔ اراکین معاشی کمیٹی کے علاوہ اہل فن حضرات اور عوام اس کتب خانہ سے استفادہ کر سکیں گے۔ معاشی امور میں اس سے کافی مدد ملے گی۔ جو حضرات مذکورہ بالا فنون سے متعلق اپنی تالیفات و رپورٹیں یا رسائل اس کتب خانہ میں بطور عطیہ دیں وہ شکریہ کے ساتھ قبول کئے جائیں گے۔

اطلاع

مجلہ طیلسانین کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ اسکے ذریعہ جامعہ عثمانیہ کے ایم۔ اے اور ایم۔ ایس سی کے امتحانات کی غرض سے لکھے ہوئے مقالے طبع ہوں چنانچہ اب تک تین مقالے طبع ہو چکے ہیں۔ اور ایک مقالہ زیر طبع ہے۔ مجلہ طیلسانین کے نئے انتظامات کے تحت اب توقع ہے کہ مزید مقالے جلد جلد طبع ہو سکیں گے جو صاحب اپنا مقالہ مجلہ میں طبع کرانا پسند فرمائیں وہ براہ کرم معتمد انجمن طیلسانین عثمانیہ معظم بلڈنگ سڑک نظام شاہی حیدرآباد کے پتہ سے مراسلت فرمائیں یا بہ تعین وقت ملاقات فرمائیں مقالہ کے طباعت کی منظوری جامعہ عثمانیہ سے حاصل کرنی ضروری ہے اگر کسی مقالے کی طباعت مناسب قرار پا جائے تو انجمن کی جانب سے اجازت حاصل کر لی جائے گی۔

معاصروں کے صفحے

۱۔ "ہماری زبان" دہلی ۶؍ستمبر ۱۹۴۲ء

حیدرآباد کے دفاتر میں زبان سرکاری کے وقار کو مستحکم کرنے کے لئے عرصۂ دراز سے انجمن طیلسانیین عثمانیہ کوشاں ہے بعد میں اسکی اہمیت اور ضرورت نے دوسرے اداروں کی توجہ بھی حاصل کر لی مقامی صحافت بھی اس کی پوری طرح موید ہے۔ "ہماری زبان" نے وہاں سے انجمن کی کوششوں میں ہاتھ بٹایا ہے۔ اس سے قبل اس نے انجمن کی تفصیلی یادداشت جو سرکار عالی کی خدمت میں ارسال کی گئی تھی اخبار پیام حیدرآباد کے حوالہ سے بہ تمام وکمال اپنے صفحات پر نقل کر دی تھی اور ادارت کی جانب سے اس یادداشت کی تائید کی تھی، اب پیش نظر شمارے میں نہ صرف انجمن کی وہ یادداشت جو جدید یدگشتی کے نفاذ کے بعد سرکار عالی کی خدمت میں ارسال کی گئی اخبار پیام کے حوالہ سے نقل کر دی ہے بلکہ ادارت کی جانب سے ایک علحدہ مقالہ میں انجمن کے مطالبات کی پرزور تائید کی ہے، لکھا ہے کہ:۔

"یہ کسی غیر ملکی زبان کا معاملہ تو ہے نہیں معاملہ ہے اردو زبان کا جو قدامت کے اعتبار سے نہ صرف ملکی بلکہ وطنی حقوق و روایات و مراعات کی حامل ہے، عام ہے، عام فہم ہے، سہل ہے، صرف ایک نقص ہے کہ بعض لوگ اسے خلاف فیشن اور خلاف شان سمجھنے لگے ہیں مگر ایسے لوگ ہی کتنے ؟ اور کیا ان کے باعث؟ غرض یہ کہ اردو زبان سے گریز کا سبب ایک طفلانہ فریب کمتری ہے اور اسکے ازالے کی بڑی اچھی سبیل یہ ہے کہ حکومت کے ذمہ دار ارباب اقتدار اردو کو سرکاری زبان سمجھنے لگیں تو ساری دقت رفع ہو جائیگی۔"

آگے اس سلسلہ میں لکھا ہے کہ:۔

"فنی اعتبار سے اردو زبان کو اتنا مفلس اور ناقابل اعتنا سمجھ لینا کہ ریلوے اور تعمیرات وغیرہ کے محکموں میں پوری طرح کام دینے سے اردو زبان قاصر ہے تمہاری اردو کی مجموعی ترقیوں اور اسکے ادب میں نئے اضافوں اور اردو کی فنی کتابوں سے لاعلمی کا ثبوت ہے اور اس سے بڑھ کر یہ جامعہ عثمانیہ کی نفی کرنا ہے۔ کیا جامعہ عثمانیہ صرف فاضل دینیات وادب اور ماہرین فلسفہ و تاریخ ہی پیدا کرتی رہی!؟ جامعہ عثمانیہ سے

سائنس ریاضی اور انجینئرنگ کے جو فارغ التحصیل طلبہ برآمد ہوئے ہیں انہوں نے آخر اردو زبان ہی میں تو پڑھا ہے، بخصوص فارغ التحصیل طلبہ پر کتنا بڑا ظلم ہے کہ وہ پڑھیں تو اردو میں اور توقع ان سے یہ کی جائے کہ وہ کام کریں غیر زبان میں اور یا پھر مادر جامعہ کے ان فرزندوں کی حیثیت مادر وطن کی آغوش میں وہی ہوگی جو ہندوستانیوں کی انگلستان میں!"

اپنی زبان کی حفاظت کے جذبہ کی ایک تازہ مثال یہ بیان کی ہے کہ :۔

"۱۹۴۲ء میں بیرونی منگولیا نے روسی زبان کی ترویج کے خلاف احتجاج پر وفاق روس سے علٰحدگی اختیار کرلی اور اس وقت تک شرکت نہ کی جب تک اپنی زبان کے استعمال کی آزادی نہ مل گئی حیدرآباد کے ریلوے کے محکمے کو اردو زبان کے استعمال کا پابند بنانے میں جو ہچکچاہٹ محسوس ہو رہی ہے وہ اس مثال سے رفع ہوجانا چاہیئے اور یہ عذر بھی دور ہوجانا چاہیئے کہ چونکہ ہماری ریلوے بیرونی ریلوے سے متصل ہے اس لئے بیرونی زبان کا جاری رہنا ضروری ہے"!

آخر میں بالکل صحیح لکھا ہے کہ :۔

"ہندوستان اس وقت ایک سیاسی و لسانی خلفشار میں مبتلا ہے اور کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ آئندہ آئین کس شکل کا ہو۔ ایسی حالت میں مختلف ممکنہ صورتیں پیش نظر رکھتے ہوئے اپنے لسانی مفاد کی حفاظتی تدابیر سے غافل نہیں رہنا چاہیئے۔ یہ خطاب ارباب حیدرآباد سے بھی ہے اور ارباب اردو سے بھی!"

۲۔ المعلم۔ اعدادی نصاب نمبر ۱ عدد دوسرے دہ عادوی شمارے دہرہ دون آباد (۱۹۵۱ء) یہ مجلہ ۱۸ سال سے مسلسل جاری ہے اور جس پابندی و وضع داری کو مشکلات کے باوجود جس طرح نباہا ہے وہ ہر طرح قابل ستائش ہے، یہ مجلہ محض تعلیمی رسالہ ہے جس میں تعلیم کے مختلف شعبوں کے متعلق مضامین درج ہوتے ہیں۔ [illegible] ۲۵ [illegible] نصاب نمبر [illegible] ہو گیا ہے [illegible] المعلم کے [illegible] مگر ہم [illegible] موجودہ حالات میں مدیرین کا [illegible] ہوتی ہے [illegible] مطالعہ کرتے رہتے ہیں رسالہ [illegible] کی [illegible] ہے کہ چند سال

کے وقفہ سے مدرسین کو یکجا کرکے ماہرین تعلیم کے خیالات سے مستفید ہونے کا اور اپنی مشکلات کو حل کرانے کا موقع دیا جائے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہمارے ملک میں اول تو عموماً مطالعہ کا شوق نہیں، دوسرے مطالعہ کی سہولت نہیں تیسرے ایسے مواقع بھی مہیا نہیں کئے جاتے کہ حاصل کردہ معلومات کو تازہ رکھنے کی ضرورت محسوس ہو۔

بہرحال "اعادی نصاب" کا مطلب یہ ہے کہ حاصل کردہ معلومات کو تازہ رکھا جائے۔ چنانچہ خورداد ۱۳۵۱ف میں اس قسم کے اعادہ یا آموختہ کا انتظام عمل میں آیا اور مدیر المعلم کے الفاظ میں سررشتۂ تعلیمات مملکت آصفیہ کی تقریباً ایک صدی کی عمر میں یہ پہلا موقع تھا کہ مدرسین تربیت یافتہ کے طریقۂ تعلیم میں اصلاح، ان کی معلومات میں اضافہ اور کارکردگی میں ترقی کے لئے اعادی نصاب کا انعقاد عمل میں آیا۔ اس کی یاد تازہ رکھنے کے لئے المعلم کی یہ اشاعت مختص کردی گئی ہے۔ اور پڑھنے کے لئے بعض دلچسپ صفحات ضرور موجود ہیں۔

اسکے اداریہ سے ایک بات کا اعادہ شاید نامناسب نہیں۔ اداریہ میں ظاہر کیا گیا ہے کہ اس کی تحریک ۱۳۴۷ف میں کی گئی لیکن عمل آوری ۱۳۵۱ف میں ہوئی ہمارے ملک میں اس قسم کی مفید اور کم خرچ تجاویز بھی ۴۔ ۴ سال کی مدت میں عمل پذیر ہوں تو ہماری کارکردگی کیلئے کسی درخشاں مستقبل کی امید بے سود ہے۔ آخر حیدرآباد کب بیدار ہوگا!

المعلم کے شمارہ ماہ مہر میں اعادۂ نصاب کے مقصد کے متعلق خواجہ یوسف الدین صاحب لکچرار عثمانیہ ٹریننگ کالج کے ایک توضیحی مضمون سے مزید معلومات حاصل ہوتے ہیں۔

اردو کے پڑھنے اور پڑھانے سے جن اصحاب کو دلچسپی ہو ان کو ماہ مہر کے شمارے میں دو مضمون ۔ ۔ ۔ ۔ ضرور پڑھنا چاہیے۔ ایک مضمون ہے "ابتدائی شہری مدارس میں مادری اور دیگر زبانوں کی تعلیم" عبدالحکیم صاحب لکچرار عثمانیہ ٹریننگ کالج نے یہ مضمون لکھا ہے۔ دوسرے مضمون کا عنوان "اردو کی تدریس" ہے عظیم الدین صاحب مدگار سینئر ماجبی گاما اسکول نے یہ مضمون لکھا ہے۔

ماہ آبان ۱۳۵۱ف کے شمارہ میں "پڑھنے سے پہلے کی تیاری" کا مضمون ہر اس شخص کو پڑھنا چاہیے

جنکو گھریلو صنعتوں سے دلچسپی ہو اور جو ملک کے پھلوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرنا چاہتے ہوں، اور جو ملک میں پھلوں کی کاشت کو وسعت دینے کا خیال رکھتے ہوں۔ المعلم شروع سے ہاتھ سے بنائے ہوئے دیسی کاغذ پر طبع ہوتا رہا ہے۔ اب دیکھنا چاہیئے کہ سرپور کے کاغذ کا کیا ردعمل ہوتا ہے۔

۴۔ سب رس بابتہ ستمبر و اکتوبر ۱۹۴۲ء

ادارۂ ادبیات اردو نے جنم لیتے ہی اپنی سودمندی جس طرح ثابت کر دی ہے وہ ہر کام کرنیوالے ادارہ کے لئے ایک مثال ہے۔ اس نے اردو امتحانات کا جو نظام رائج کیا ہے اس کی قدر کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اردو کو نہ صرف دفاتر بلکہ ملک کے سارے کاروبار میں رائج ہوتے دیکھنے کے لئے بیقرار اور بے چین ہیں۔

ادارہ کا ترجمان "سب رس" سب کے لئے دلچسپ ہے لیکن اس کی سودمندی اب اور زیادہ ہو جائیگی۔ ماہ اکتوبر کے شمارے میں ادارت کی جانب سے واضح کیا گیا ہے کہ:۔

"سب رس میں جو علمی مضامین شایع ہوتے ہیں ان کو آئندہ سے خاص مسائل کے تحت مرتب اور شریک کیا جائے گا۔ فی الحال یہ مسائل ہونگے: ۱۔ حیدرآباد میں ہندو مسلم تعلقات۔ ۲۔ اردو زبان کے مسایل۔ ۳۔ دکن کے آثار قدیمہ۔ ۴۔ دکنی مشاہیر" نومبر کا شمارہ غالباً اسی باب واری تقسیم پر مشتمل ہوگا۔

۵۔ "سلطنت" بلدہ فرخندہ بنیاد کا ایک ہفتہ وار اخبار ہے۔ اور ہر ہفتہ پابندی سے شایع ہوتا ہے۔ مولوی سید شمس اللہ صاحب قادری جیسے کہنہ مشق اور مطالعہ کے دھنی بزرگ کے فرزندوں نے اپنے والد کے ذوق مطالعہ سے کافی حصہ حاصل کیا ہے۔ "سلطنت" کے ہر شمارہ میں کوئی نہ کوئی مضمون ایسا ضرور ہوتا ہے کہ جس کا پڑھنا کسی نہ کسی وجہ سے ضروری ہوتا ہے۔

۵۔ سررشتۂ معلومات عامہ سرکار عالی کی جانب ایک ماہنامہ "معلومات حیدرآباد" کے نام سے اردو اور دوسری زبانوں میں شایع ہوتا ہے۔ اس کے شمارہ ماہ آبان ۱۳۵۲ف میں "دور ماضی سے ارتباط"

کے عنوان سے دفتر دیوانی و مال و ملکی کے حالات پر ایک مفید مضمون شائع ہوا ہے۔ اس مضمون میں واقعا کیا گیا ہے کہ دفاتر مذکور میں ڈیڑھ کروڑ قدیم سرکاری کاغذات محفوظ ہیں۔ ان کاغذات کی قدر و قیمت کا اندازہ ان دو کاغذات کے عکس سے ہو سکتا ہے جو اس شمارے میں شائع ہوئے ہیں، ایک کاغذ جنگ ٹیپو کے تاوان کی نسبت ہے اور دوسرا حیدرآباد اور پونا کے درمیان پٹہ کے انتظامات کے متعلق، دونوں کاغذات پر نواب میر نظام علی خاں سوم کی خود نوشتہ تحریر موجود ہے۔

ادارۂ انجمن طیلسانین عثمانیہ کی مطبوعات

۱۔ اردو ادب بیسویں صدی میں موجودہ صدی کے اردو ادب پر ایک سیر حاصل تنقیدی مقالہ مولفۂ سید علی حسین صاحب زیبا ایم۔ اے (عثمانیہ) قیمت بارہ آنے ۱۲/

۲۔ عہد ابراہیم عادل شاہ ثانی کے متولیاں ریاست عادل شاہی دور تولیت کی بسیط اور محققانہ تاریخ مولفۂ سید علی محسن صاحب ایم۔ اے عثمانیہ قیمت دو روپیہ (عہ)

۳۔ سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کی مفصل محققانہ اور مستند تاریخ مولفۂ ظہیر الدین صاحب ایم۔ اے (عثمانیہ) قیمت ۱۲/

۴۔ موضع دوپلی کی معاشی تحقیق از محمد ناصر علی صاحب ایم۔ اے (عثمانیہ) زیر طبع اراکین انجمن اور خریداران مجلہ طیلسانین عثمانیہ سے نصف قیمت کتب فروشوں کے ساتھ خاص رعایت۔

بغرض سہولت کتابیں تبادلہ میں بھی لی جاتی ہیں

ملنے کے پتے

(۱) دفتر مجلہ طیلسانین (انجمن طیلسانین عثمانیہ) حیدرآباد دکن نظام شاہی روڈ

(۲) مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد۔

جامعاتی معلومات

سنہ ۱۳۵۱ف کے سال تعلیمی کے آغاز سے جامعۂ عثمانیہ کے شعبۂ قانون میں ال ال ایم کی جماعت کا افتتاح عمل میں آیا ہے۔ ال ال ایم ابتدائی میں ایسے طلبا داخل ہوسکیں گے جو جامعہ عثمانیہ یا کسی مسلمہ جامعہ سے ال ال بی یا اسکے مماثل کسی امتحان میں کامیاب ہوں۔ ال ال ایم آخری میں صرف وہی طلبہ شریک ہوسکیں گے جو جامعۂ عثمانیہ سے ال، ال، ایم ابتدائی کا امتحان کامیاب ہوں، نصاب تعلیم کی تفصیل حسب ذیل ہے :-

ال ال ایم ابتدائی، چار پرچے

۱۔ تقابلی اصول قانون و اصول وضع قانون،

۲۔ قانون دستور (انگلستان، برطانوی ہند و حیدرآباد)

۳ و ۴ مندرجہ ذیل مضامین سے کوئی دو :-

الف ۔ شرع شریف مع تاریخ و اصول قانون

ب ۔ دھرم شاستر مع تاریخ و اصول قانون ہنود

ج ۔ قانون حقیت اراضی ۔

برطانوی ہند کے مختلف صوبوں اور حیدرآباد کے قوانین کا تقابلی مطالعہ

د ۔ قانون انتقال جائیداد ۔

ھ ۔ تصادم قوانین

و ۔ قانون بین الممالک

ز ۔ قانون معاہدہ

ح ۔ قانون طاں، (ٹارٹ)

ط۔ قانون جرائم و جرمیات

ال ال ایم آخری

دو پرچے اور ایک مقالہ

۱۔ دکن کے کسی دور کا قانونی موضوع۔

۲۔ مضامین ال ال ایم ابتدائی کے کسی خاص مضمون کا تفصیلی مطالعہ۔

نیز مقالہ جس کے موضوع کا تعین مجلس نصاب کریگی۔

انڈین سرامک سوسائٹی کی از سر نو تاسیس عمل میں آئی ہے اور اس کا مستقر شعبہ سرامک ہندو یونیورسٹی بنارس میں قایم کیا گیا ہے۔ سوسائٹی اپنا ایک مرکزی کتب خانہ قایم کریگی، عجائب خانہ بھی قایم کیا جائیگا، اس عجائب خانہ میں ہندوستان میں پیدا ہونے والی ایسی خام اشیا بھی فراہم کیجائیں گی جن سے سرامک صنعتوں کی تیاری عمل میں آتی ہے، (کرنٹ سائنس بنگلور جولائی ۱۹۴۲ء)

دہلی کی جامعہ کو RHODES TRUSTEES (ٹرسٹ رہوڈس) کی جانب سے دو ہزار پانچسو پونڈ کا ایک عطیہ حاصل ہوا ہے تاکہ اس رقم سے ایک وقف قائم کر کے اس سے سیاسیات یا زبان انگریزی کی پروفیسری یا لکچراری قایم کی جائے (کرنٹ سائنس، بنگلور، جولائی ۱۹۴۲ء)

حکومت میسور نے یکمشت ایک لاکھ روپیے بطور سرمایہ اور سالانہ پندرہ ہزار روپیے کی متوالی امداد انڈین انسٹیٹیوٹ آف سائنس بنگلور کے لئے منظور کی ہے۔ تاکہ اس سے AUTOMOBILE (اور) AIRONAUTICAL (انجینرنگ کا شعبہ قایم کیا جائے (کرنٹ سائنس، بنگلور، اگسٹ ۱۹۴۲ء)

"ہندوستان ایرکرافٹ کنسٹرکشن کمپنی" کے صدر نے تین سو پونڈ سالانہ کا ایک وظیفہ چار سال کے لئے انڈین انسٹیٹیوٹ آف سائنس بنگلور کے ایک ایسے طالب علم کے لئے عطا کیا ہے جو کسی امریکی ادارہ میں (AIRONAUTICAL) انجینرنگ کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرے۔ (کرنٹ سائنس بنگلور، اگسٹ ۱۹۴۲ء)

کلکتہ کی جامعہ کے صدر شعبۂ نفسیات (کلیۂ سائنس) پروفیسر بی، ایس، بوس، ڈی ایس سی، نے پیشہ ورانہ رہبری کے سلسلے میں یہ اطلاع شائع کرائی ہے کہ تعلیمی اور پیشہ ورانہ رہبری کے لئے دماغی اور ذہنی صلاحیتوں کے امتحان کا کام پھر آغاز کیا گیا ہے۔ یہ امتحان کسی قسم کی فیس لینے کے بغیر عمل میں لایا جاتا ہے۔ جو لوگ اس قسم کے امتحان کے خواہش مند ہوں وہ اس کام سے متعلق لکچرار سے مراسلت عمل میں لائیں پتہ یہ ہے۔

LECTURER-IN CHARGE APPLIED SECTION
DEPARTMENT OF PSYCHOLOGY
UNIVERSITY COLLAGE OF SCIENCE
92 UPPER CIRCULAR ROAD
CALCUTTA

(ماڈرن ریویو، کلکتہ، اگسٹ ۱۹۴۲ء)

آندھرا یونیورسٹی کے جلسۂ تقسیم اسناد میں خطبہ پڑھنے کے لئے مہارانی ٹراونکور کا انتخاب عمل میں آیا ہے۔ نیز مہاراجہ ٹراونکور انامالائی یونیورسٹی کے جلسۂ تقسیم اسناد میں خطبہ پڑھیں گے۔ (انڈین ریویو مدراس، ستمبر ۱۹۴۲ء)

---

۱۶ ؍ جولائی ۱۹۴۲ء کو بمقام کولمبو میں جامعۂ سیلون کا قیام عمل میں آیا۔ اس وقت تک سیلون کی

اعلیٰ تعلیم کا تعلق لندن کی جامعہ سے تھا۔ اور بہت عرصہ سے یہ کوشش عمل میں لائی جارہی تھی کہ مقامی حالات اور خصوصیات کے مدنظر خود سیلون میں جامعہ کا قیام عمل میں لایا جائے، یہ جامعہ اقامتی ہے اور فی الوقت فنون، سائنس، مشرقی السنہ، اور طب کے شعبوں پر مشتمل ہے، تجویز ہے کہ آئندہ شعبۂ قانون بھی قایم کیا جائے۔ (کرنٹ سائنس، بنگلور، جولائی ۱۹۴۲ء)

ہندوستان ریویو کے شمارۂ جولائی ۱۹۴۲ء میں ایک مصری مصطفیٰ زادہ پی ایچ، ڈی، مددگار پروفیسر تاریخ جامعۂ مصر نے مصر کی علمی نشاۃ ثانیہ پر ایک مختصر مضمون لکھا ہے، اس سے جو معلومات حاصل ہوئے ان کو ذیل میں دہرانا بے محل نہ ہوگا۔ انہوں نے لکھا ہے کہ ۱۹۰۸ء سے قبل مصر میں کوئی جامعہ قایم نہیں تھی، اور قدامت و تاریکی سے مقابلہ کرنے کے لئے صرف شیخ محمد عبدہ کا مدرسہ ازہر اور چند سرکاری کلیات تھے، شیخ محمد عبدہ کے مدرسہ میں محض محدود تعداد میں چند افراد تعلیم پایا کرتے تھے، سرکاری کلیات میں سرکاری نوکریاں حاصل کرنے کی خاطر لوگ تعلیم پاتے تھے، ان میں سے ہی بعض طلبہ یورپ کو بھیجے جاتے تھے، کوئی شبہ نہیں کہ ان میں بعض قابل افراد بھی پیدا ہوئے لیکن ان کی تعداد بھی محدود تھی، یہ واقعہ کہ مصر میں جامعاتی تعلیم ایک شئے درآمد کی صورت میں حاصل ہوا اس بات کی محرک ہوئی کہ سرزمین مصر میں کم از کم ایک جامعہ کا قیام عمل میں لایا جائے۔

بہرحال ۱۹۰۸ء میں خانگی عطیات سے جامعہ قایم ہوئی، تا آنکہ اوسکو ۱۹۲۵ء میں حکومت نے شاہ فواد کے حکم سے ایک سرکاری ادارہ قرار دے دیا۔ اس کا سالانہ معاوضہ دس ہزار مصری پونڈ سے بڑھکر ۱۹۳۲ء میں ۲ لاکھ ۸ ہزار سات سو چھیاسی پونڈ ہوگیا۔ طلبہ کی تعداد ۱۹۲۵ء سے قبل (۱۰۷) تھی لیکن ۱۹۳۲ء میں ان کی تعداد (۲۳۸۱) ہوگئی، اس وقت جامعہ فنون، سائنس، قانون اور طب کے چار شعبوں پر مشتمل ہے، یوں پہلے صرف دو شعبے فنون اور قانون کے ہی قایم تھے دوسرے دو شعبے بعد میں قایم ہوئے، ۱۹۳۶ء میں شعبوں کی تعداد سات ہوگئی یعنی شعبہ جات فنون، سائنس، قانون، طب، انجنیرنگ، زراعت اور تجارت، شعبہ طب کے ساتھ بیطاری، ادویہ سازی، دندان سازی اور دایہ گری کے مکاتیب علحدہ قایم

ہیں۔ ۱۹۳۶ء میں سالانہ موازنہ ۸ لاکھ پچاس ہزار مصری پونڈ ہوگیا اور تعداد طلبہ (۸۱۰۶) جامعہ کی جانب سے ہر سال شام میں عام لکچر ہوتے ہیں۔ نیز ایک مجلس اشاعت بھی موجود ہے جو تحقیقاتی کتابیں شایع کرتی ہے۔

ستمبر ۱۹۴۱ء میں شیکاگو کی جامعہ نے اپنی پچاسویں سالگرہ منائی، اس جامعہ کے ساتھ اس کا مطبع شروع سے قائم ہے، اس مطبع نے اپنے سلسلے کی اب تک (۳۰۰۰) کتابیں شایع کی ہیں، اس کی جانب سے (۱۸) مجلات شایع ہوتے ہیں، سب سے پہلا مجلہ ۱۸۹۲ء میں "جرنل آف پولیٹیکل اکانومی" کے نام سے شایع ہونا شروع ہوا۔ بیان کیا گیا ہے اس جامعہ کی سالگرہ کے موقع پر ۴۳ مشاہیر کو جامعہ کی جانب سے اعزازی ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا کی گئی اور سب سے صرف عمرانیات کے موضوع پر ۱۹۴۰ء میں ممالک متحدہ امریکہ اور کناڈا کے اداروں سے (۵۰) افراد نے ڈاکٹریٹ کا اعزاز حاصل کیا۔ اور (۲۰۰۱) افراد نے ماسٹری ڈگری حاصل کی۔ جولائی ۱۹۴۱ء میں اس موضوع پر ممالک متحدہ امریکہ اور کناڈا کے اداروں میں جو لوگ مصروف کار تھے ان کی تعداد ڈاکٹریٹ کے لئے (۱۱) تھی اور ایم اے کے لئے (۱۹۱)۔ (امریکن جرنل آف سوشیالوجی جولائی ۱۹۴۱ء)

امریکہ کا ایک خیراتی فنڈ موسوم بہ (JULIUS ROSEN WALD FUND) نے اپنے سرمایہ سے ۶۴ فیلوشپ عطا کرتا ہے جس کی مجموعی رقم ایک لاکھ اسٹرلنگ ہوتی ہے۔

پرن سی ٹن (PRINCETON) کی جامعہ کے ایک طالب علم نے جغرافیہ کے موضوع پر اپنا مقالہ پیش کرنے کیلئے گراما فون کا جدید ذریعہ اختیار کیا۔ ٹائپ کرانے کی بجائے مقالہ گراما فون پر ریکارڈ کرا دیا گیا اور نقشوں کی سہولت کے لئے نقشے اور رفا کے ایک کتابچہ کی صورت میں چھپا کرائے گئے۔ (انڈین ریویو، مدارس، ستمبر ۱۹۴۲ء)

عثمانیہ ٹریننگ کالج حیدرآباد کی سالانہ رپورٹ بابتہ ۱۳۵۰-۵۱ف میں صدرصاحب نے اس کالج کی علمی اور تحقیقاتی سرگرمی کے متعلق بیان کیا ہے کہ:—

"یہ کالج تدریسات کے نصابوں کی تکمیل کے علاوہ علمی اور تحقیقاتی کام بھی کرتا رہتا ہے اب تک اٹھائیس معیاری درسی انگریزی کتب کا ترجمہ ہوچکا ہے جن میں سے ستائیس شایع ہوچکی ہیں، تقریباً چار ہزار اصطلاحاتِ تدریسات وضع کی جاچکی ہیں جو عرصہ سے دارالطبع جامعہ عثمانیہ میں زیر طبع ہیں، تالیف و تصنیف کا بھی آغاز ہوچکا ہے اور ملک سردار علی صاحب نے نفسیات اور اصول تعلیم پر قابل قدر کتابیں شایع کی ہیں . . . . میر احمد علی خان صاحب نے ممالک محروسہ کے لئے سماجیت پر ایک کتاب تیار کی ہے جو عنقریب شایع ہوگی، کالج کے ٹرینڈ اساتذہ بھی ترجمے اور تالیفیں شایع کررہے ہیں، متعدد مسودات اہم عنوانات پر تیار ہیں، لیکن اخراجات کی تنگی کے باعث یوں ہی پڑے ہوئے ہیں" (المعلم بابتہ خورداد و تیر ۱۳۵۱ف)

زبان اردو کی کم سے کم مدت میں موثر تدریس کے متعلق عثمانیہ ٹریننگ کالج (حیدرآباد) میں جو کامیاب تجربہ کیا جارہا ہے اسکے متعلق بھی کالج کے صدر صاحب نے اپنی حالیہ رپورٹ میں واضح کیا ہے۔

ممالک محروسہ آصفیہ میں جب سے مادری زبان پر بحیثیت ذریعہ تعلیم زور دیا جارہا ہے تدریس زبان کا مسئلہ روز بروز اہم اور پیچیدہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس بارے میں عام طور پر یہ فراموش کردیا جاتا ہے کہ ہمارے وطن میں چار زبانیں نہیں بلکہ ۲۱ زبانیں بولی جاتی ہیں، اس لئے ہم دو یا تین زبانیں سیکھنے پر مجبور ہیں، چنانچہ ہمارے ہاں کے ناخواندہ بھی ایک سے زیادہ زبانیں بولتے ہیں۔ لیکن یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ان سب زبانوں میں ایک زبان ایسی ہے جو خانوادۂ آصفیہ کی زبان ہے، سرکاری زبان ہے، اور ساتھ ہی وہ ہندوستان کی بین الصوبجاتی اور ایشیا کی بین الاقوامی زبان بھی ہے چنانچہ اس زبان اردو یا ہندوستانی کی اہمیت

کے مد نظر اس کالج نے اس کی کم سے کم مدت میں موثر تدریس کے لئے اردو داں اور غیر اردو داں دونوں کے لئے چند تجاویز اختراع کی ہیں، جن پر تجربہ کیا جا رہا ہے۔ اردو داں بالغ کی تعلیم کے لئے جو تجویز کی گئی ہے اس کو حیدرآباد کے مشہور ادارۂ ادبیات اردو نے رائج کیا ہے اسکے متعلق معتمد صاحب کا بیان ہے کہ وہ مقبول اور کامیاب ثابت ہوا۔ غیر اردو داں کے لئے جو طریقۂ تعلیم ارتھولاجیکل انسٹیٹیوٹ سوجد بیسک انگلش کے اشتراک سے وضع کیا گیا ہے اس کا ایک تجربہ افواج باقاعدہ کے ناخواندہ اور غیر اردو داں سپاہیوں پر کیا گیا۔ عہدہ داران متعلقہ نے اس کی غیر معمولی کامیابی کا اعتراف کیا ہے۔ (العلم بابتہ خورداد و تیر ۱۳۵۱ف)

مجلۂ طیلسانیین کے ناظرین سے

۱۔ مجلۂ طیلسانیین کے خریداروں سے استدعا ہے کہ اپنے پتہ کی تبدیلی سے بروقت مطلع کر دیں۔

۲۔ تنقید کے لئے کتابیں بھیجی جائیں تو مدیر کے پاس راست دفتر مجلہ پر بھیجی جائیں۔

۳۔ مضامین مقالوں اور دیگر متعلقہ امور میں مدیر کو مخاطب کرنا مناسب ہے۔

۴۔ اشتہارات خریدی اور دوسرے مماثل امور میں مہتمم کو مخاطب کرنا بہتر ہے۔

مجلہ کے دفتر کا پتہ

دفتر انجمن طیلسانیین عثمانیہ کمرہ نمبر ۱۹ مجرد گاہ

نظام شاہی روڈ حیدرآباد دکن

انجمن اور اس کے ملحقہ اداروں کی اطلاعیں

سنہ ۱۳۵۲ف کے لئے جو انتخابات عمل میں آئے ہیں وہ کئی اعتبارات سے قابل لحاظ ہیں۔ انجمن کی کابینہ کے سب عہدہ دار اور ارکان بالاتفاق منتخب ہوئے۔ دس سال کی مدت میں یہ پہلا موقع ہے کہ یہ مثال قایم ہوئی۔ جو اصحاب عہدہ دار اور ارکان کابینہ منتخب ہوئے ان میں بعض پہلی مرتبہ کابینہ میں شریک ہوئے ہیں اور بعض پہلے سے خدمت گزاری میں مصروف ہیں، جو اصحاب منتخب ہوئے ہیں ان میں وہ بھی ہیں جو جامعہ کا دور ختم کرکے عملی زندگی میں بہت آگے نکل چکے ہیں اور وہ بھی ہیں جو ابھی ابھی نئی امنگوں اور نئی آرزوں کے ساتھ میدان عمل میں آئے ہیں۔ غرض انجمن کے لئے جو کابینہ منتخب ہوئی وہ یہ ہے۔

صدر۔ ظہیر الدین احمد صاحب ام اے پی ایچ ڈی سی ایس

نائب صدر۔ ڈاکٹر قاضی معین الدین صاحب ایم ایس سی، پی ایچ ڈی

معتمد۔ محمد غوث صاحب۔ ایم اے

نائب معتمد۔ عبدالعلی صاحب بی ایس سی، ال ال بی

خازن، شرف الدین صاحب بی اے

ارکان میر اکبر علی خان صاحب بیرسٹر ایٹ لا، عبدالمجید صاحب صدیقی۔ ام اے، ال ال بی، شنکرجی صاحب بی اے، ال ال بی، سید فضل حق صاحب ام اے، گرو داس صاحب بی اے، ال ال بی، سید عبدالرزاق صاحب قادری جعفر ام اے، نیر الدین صاحب بی اے۔ معتمدی پر محمد غوث صاحب کا انتخاب عمل میں آیا۔ لیکن چونکہ ان کو تعلیمی مصروفیت ہے اس لئے اس سلسلہ میں کابینہ مناسب انتظام عمل میں لائیگی۔

معاشی کمیٹی کے سالانہ انتخابات میں صدر، نائب صدر، معتمد اور رفقائے کار کا انتخاب بلا اختلاف عمل میں آیا۔ مجلس عاملہ کی تشکیل یوں ہے۔

صدر۔ ال۔ان گپتا صاحب، بی اے، ایچ سی ایس

نائب صدر۔ عبدالقیوم صاحب بی اے، ایچ سی ایس

معتمد۔ خواجہ حمید احمد صاحب بی اے

نائب معتمد۔ محمد یوسف الدین صاحب ام اے

خازن۔ عزالدین محمود صاحب

ارکان، مشتاق احمد صاحب ام اے، ڈکنٹب، عبدالمجید صاحب صدیقی ام اے، ال ال، بی،
میر محمود علی صاحب ام اے، عبدالقادر صاحب بی ایس سی آنرز (لندن)
کا بینۂ انجمن کی جانب سے معاشی کمیٹی کی مجلس عاملہ میں حسب ذیل ارکان کی نامزدگی عمل میں آئی،
ظہیر الدین احمد صاحب صدر انجمن، محمد غوث صاحب ام اے، شرف الدین صاحب خازن انجمن
شنکرجی صاحب۔

جماعت اتحاد و ترقی کی مجلس عاملہ کی تشکیل حسب ذیل قرار پائی۔

صدر، میر اکبر علی خان صاحب بیرسٹر

نائب صدر، ڈلشاجی اٹالیہ صاحب

معتمد، رائے گرو داس صاحب

نائب معتمد، خواجہ سردار اللہ خان صاحب جاگیردار

خازن، سری کشن صاحب

ارکان، سید محمد علی صاحب موسوی، ڈاکٹر لطیف سعید صاحب، میر زاہد علی صاحب کامل بی اے
ال ال بی، سیٹھ سکھ دیو پرشاد صاحب۔ محمد عبداللہ پاشاہ صاحب اڈوکیٹ، سید حسن صاحب
بنکٹ پرشاد صاحب بی اے ال ال بی،

کابینۂ انجمن کی جانب سے جماعت اتحاد و ترقی کی مجلس عاملہ میں حسب ذیل ارکان کی نامزدگی عمل میں آئی۔

میر حسن الدین صاحب بی آل ال بی ایڈیٹر مملکت، عبدالعلی صاحب مجالسین سی ال ال بی وکیل ہائی کورٹ، نواب میر احمد علی خان صاحب ایم اے ال ال بی، شام سندر صاحب بی اے۔
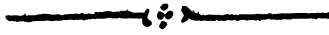
مجلس نمائش کی مجلس عاملہ کے لئے بھی انتخابات بلا اختلاف عمل میں آئے، اور حسب ذیل تشکیل قرار پائی،

صدر، ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی

نائب صدر، پریم جی لال جی صاحب

معتمد، شرف الدین صاحب

نائب معتمد، عبدالعلی صاحب

خازن، سشنکر جی صاحب

ارکان، میر اکبر علی خان صاحب بیرسٹر نظام الدین صاحب، سید محمد علی صاحب موسوی، محمد غوث صاحب مرزا محمد بیگ صاحب، حکیم نارائن داس صاحب،

معاشی کمیٹی کی مجلس عاملہ نے حسب ذیل ارکان کو نامزد کیا۔

ال، ان گپتا صاحب صدر معاشی کمیٹی، ظہیر الدین احمد صاحب صدر انجمن طیلسانیین عثمانیہ۔

خواجہ حمید احمد صاحب معتمد معاشی کمیٹی۔

مجلس نمائش کے دو عام جلسوں میں مجلس کے قواعد (شرائط شرکت) کی ترمیمات عمل میں آئیں تاکہ اس ترقی پذیر ادارہ کے کاروبار میں مزید خوش اسلوبی اور باقاعدگی پیدا ہو، اور حسابات ۱۳۵۱ف تنقیح کردہ ڈنگلے اینڈ کمپنی کی منظوری عمل میں آئی۔ جیسا کہ اعلان ہو چکا ہے یکم ذیحجہ ۱۳۶۱ھ م ۶ بہمن ۱۳۵۲ف سے نمائش مملکت آصفیہ کا انعقاد عمل میں آئیگا۔ اس کی تفصیلات علیحدہ ملاحظہ ہوں۔

عثمانیہ بلدی جماعت کے انتخابات بھی عمل میں آئے اور اس کی مجلس عاملہ کی تشکیل حسب ذیل ہوئی ہے۔

مجلس عاملہ عثمانیہ بلدی جماعت

صدر۔ نواب ڈاکٹر ناظر یار جنگ بہادر۔ نائب صدر۔ نواب خواجہ سرار اللہ خان صاحب جاگیردار
معتمد۔ مولوی غیاث الدین خان صاحب یم اے۔ نائب معتمد۔ محمد عبدالہادی صاحب بی۔ ایس۔ سی۔
خازن۔ شیخ محمد علی صاحب انصاری یم اے۔ ارکان بلدیہ۔ پنڈت پریم جی لال جی صاحب نائب
میر مجلس بلدیہ۔ سید محمد علی صاحب موسوی رکن بلدیہ۔ پنڈت حکیم نارائن داس صاحب رکن بلدیہ۔
محمد کلیم الدین صاحب انصاری بی اے ال ال بی ایڈوکیٹ رکن بلدیہ۔ غلام مصطفےٰ صاحب رکن مجلس بلدیہ
ارکان میر محلہ گان۔ محمد سلطان صاحب میر محلہ۔ ڈاکٹر ست نارائن صاحب میر محلہ۔

ارکان عام مولوی حبیب اللہ صاحب فاروقی بی اے ال ال بی۔ آریل مانک راؤ صاحب (عثمانیہ)
نیز راجہ بہادر وینکٹ راما ریڈی صاحب او۔ بی۔ ای سابق صدر عثمانیہ بلدی جماعت۔

کابینۂ انجمن نے حسب ذیل اصحاب کو نامزد کیا ہے۔

۱۔ سید حامد معین الدین صاحب ام ایس سی۔ ۲۔ نواب میر احمد علی خاں صاحب ام اے
۳۔ یوسف الدین صاحب ام اے ۴۔ رائے رگھو بیر بلی صاحب بی۔ اے
۵۔ رائے گرو داس صاحب بی۔ اے ال ال بی۔

نمائش مصنوعات ممالک آصفیہ سال بہ سال

سنہ ۱۳۴۸ف میں ملکی مصنوعات کی پہلی نمائش کا افتتاح نواب اکبر یار جنگ بہادر نے فرمایا۔ اس نمائش میں تقریباً سو اسٹال قائم ہوئے تھے اور ایک لاکھ روپیہ کی مالیت کا سامان فروخت ہوا۔ پچاس ہزار سے زاید اشخاص نے نمائش دیکھی یہ نمائش دس دن جاری رہی۔

صدر مجلس نمائش معاشی کمیٹی مولوی میر محمود علی صاحب ایم، اے لکچرار سٹی کالج تھے سنہ ۱۳۴۹ف میں ملکی مصنوعات کی دوسری نمائش کا افتتاح حضرت شہزادہ جنرل والا شان ڈاکٹر نواب اعظم جاہ بہادر نے فرمایا۔ اس نمائش میں (۲۰۵) اسٹال قائم ہوئے تھے اور دو لاکھ روپیہ کی مالیت کا سامان فروخت ہوا ایک لاکھ سے زاید اشخاص نے نمائش دیکھی اعلیحضرت بندگانعالی نے بطور خاص نمائش کا تفصیلی معائنہ فرماکر اپنے تاثرات کا اظہار فرمان مبارک کے ذریعہ فرمایا یہ نمائش دو ہفتہ جاری رہی۔

صدر مجلس نمائش معاشی کمیٹی مولوی محمد فاروق صاحب بی، سی، ایس، دوم تعلقدار تھے۔

سنہ ۱۳۵۰ف میں تیسری نمائش کا افتتاح نواب سر اکبر حیدری نواز جنگ بہادر صدر اعظم باب حکومت نے فرمایا، اس نمائش میں (۲۵۰) اسٹال قایم ہوئے تھے دو لاکھ روپیہ کی مالیت کا سامان فروخت ہوا۔ ڈیڑھ لاکھ اشخاص نے یہ نمائش دیکھی۔ اس نمائش کے ساتھ حسب فرمان خسروی نمائش باغبانی و مرغبانی کا بھی اضافہ کیا گیا، یہ نمائش تین ہفتہ تک جاری رہی۔ صدر مجلس نمائش معاشی کمیٹی مولوی سید علی صاحب موسوی رکن بلدیہ تھے۔

سال ۱۳۵۱ف کی چوتھی نمائش حسب ارشاد شاہانہ یکم ذیحجہ سے شروع اور ایک مہینہ تک جاری رہی اس نمائش کا افتتاح نواب سر محمد احمد سعید خان بہادر صدر اعظم باب حکومت نے فرمایا اس نمائش میں (۴۰۰) اسٹال قایم ہوئے۔ دو لاکھ سے زائد کا مال فروخت ہوا تین لاکھ اشخاص نے نمائش دیکھی جس میں بیرونی مشاہیر اور کانفرنسوں کے اراکین بھی شامل تھے۔ حضرت اقدس اعلیٰ نے دو دفعہ نمائش کا معائنہ فرماکر عمارت نمائش گھر کے تعمیر کا حکم محکم صادر فرمایا۔ صدر مجلس نمائش اور معاشی کمیٹی نواب میر اکبر علی خان صاحب بیرسٹر تھے۔

نمائش مصنوعات ملکی آصفیہ سنہ ۱۳۵۲ ف

خلاصہ پیش نامہ

ف ۔ نمائش مصنوعات مملکت آصفیہ میں ملک کی صنعتی ترقی کے لئے نہ صرف ایسی اشیاء پیش ہونگی جو اہل ملک کی بنائی ہوئی ہوں بلکہ ملک کے سامان خام سے ہر قسم کے مصنوعات تیار کرنے کے عملی مظاہروں کا بھی انتظام ہوگا۔

ف ۔ نمائش کے دوران میں معاشی کمیٹی کی طرف سے پانچویں معاشی کانفرنس سررشتہ زراعت کی جانب سے نمائش باغبانی و مرغبانی اور عثمانیہ بلدی جماعت کی امداد سے نمائش اطفال اور فینسی ڈریس کے مظاہرہ کا انعقاد بھی ہوگا۔ نمائش ۷ بہمن سے شروع ہو کر ۹ اسفندار تک جاری رہے گی۔

ف ۔ سال ضمنی امور کے سوا نمائش کے مستقل پانچ حصے ہونگے ۔ (۱) تیار مصنوعات ۔ ایسے صناع جو علحدہ اسٹال قایم نہ کر سکتے ہوں یا ایسی دستکار خواتین جن کیلئے یہ ممکن نہ ہو مرکز مصنوعات ملکی کے اسٹال میں مقررہ فیس یا حاصلہ کی ادائی پر قواعد منظورہ کے تحت اپنے اپنے اشیاء کی نمائش اور فروخت کا انتظام کر سکتے ہیں ۔ (۲) سرکاری محکموں کی افادیت اور ترقیات ۔ (۳) غیر سرکاری رفاہی اداروں کے مقاصد و اغراض کی تبلیغ و تشہیر (۴) مظاہر (۵) مخصوص و دلکش تفریحات ۔

ف ۔ قیام اسٹال کی درخواست ۔ دو روپیہ فیس شرکت کے ساتھ ۲۵ مہر سنہ ۱۳۵۲ ف تک دفتر مجلس نمائش میں وصول ہو جانا چاہیئے۔ کرایہ اور دیگر تفصیلات کے لئے پیش نامہ نمائش ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

ف ۔ اضلاع اور بیرون کے صناعوں کو اسٹال کا ایک تہائی کرایہ معاف ہوگا۔ مصنوعات کی تیاری کے مظاہرات کیلئے اسٹال بلا کرایہ دیا جائیگا آمد و رفت اور سامان کے لانے اور لیجانے میں [illegible] ریلوے سے رعایتیں ملتی ہیں۔

ف ۔ احاطہ نمائش کی آرائش اور سجاوٹ نیز رات میں روشنی کیلئے مجلس نمائش سال حال بھی اپنے موازنہ میں کافی رقم محفوظ کر رہی ہے ہر اسٹال کو ایک برقی گولہ بلا معاوضہ دیا جائے گا۔ مزید روشنی کیلئے بھی مجلس نمائش اخراجات کی ادائی پر انتظام کر سکے گی۔ اسٹال پر کام کرنے والوں کیلئے احاطہ نمائش میں اجازت نامے بلا قیمت دیئے جائیں گے نیز نمائشی خرچ پر سیاحوں کی ٹکٹ بھی جاری ہوں گے کارکنان اسٹال کی سیکلوں کی نگرانی کا انتظام بھی ہوگا۔

ف ۔ مالکان اسٹال احاطہ نمائش میں اپنی مصنوعات کی تشہیر کیلئے اشتہارات نصب کر سکیں گے اور تقسیم

بھی کرا سکتے ہیں۔ تصویر کشی اور پھیری کر کے مصنوعات کی فروخت کی اجازت بھی مل سکے گی۔ آلہ مکبر الصوت کے ذریعہ بھی تشہیر ہو سکے گی اس غرض سے ایک رہبر نمائش طبع ہوگی اور اخبار نمائش بھی شایع ہوگا۔

ف ۔ اضلاع اور باہر سے آنے والوں کیلئے ضلع سرائے جو حیدرآباد کی بڑی پٹری کے ریلوے اسٹیشن نامپلی سے بالکل متصل ہے اور نمائش گاہ سے دو فرلانگ دور ہے جگہ محفوظ ہو سکے گی۔ یہاں بجانب سر رشتہ بلدیہ ہر وجہ کے قیام وطعام کی بہت اچھی سہولتیں حاصل ہیں پیشگی اطلاع دینے پر نیز اخراجات کی ادائی پر فرنیچر کی فراہمی کی کوشش کی جائے گی۔

ف ۔ نمائش منظورہ قواعد کے تحت صبح میں ۹ بجے سے ۱۲ بجے تک اور شام میں ۴ بجے سے ۱۰ بجے تک کھلی رہے گی۔ صبح میں ایک آنہ ٹکٹ رہیگا تاکہ اطمینان سے لوگ خریدی کیلئے آسکیں اور شام میں دو آنے کے ٹکٹ سے داخلہ ہوگا۔ طلبا کے لئے رعایتی ٹکٹ بھی جاری ہونگے۔

ف ۔ مجلس نمائش کثیر ترین تعداد میں عوام مشاہیر اور تجار کے نمائش کو معائنہ کرنیکے لئے ہر قسم کا انتظام کرے گی۔ کیونکہ ان ہی کی دلچسپی سے نمائش میں شرکت کرنے والے صناعوں کی ہمت افزائی ہوتی ہے۔ اور کاروبار کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ پردے کے انتظامات کے ساتھ خواتین کے معائنہ کیلئے بھی متعلق رکھے جائیں گے۔

ف ۔ مجلس نہ صرف اپنی جانب سے بلکہ حکومت سرکار عالی نیز امراء و عمائدین ملک کی جانب سے نمائش کے بہترین مصنوعات اور ان کی سجاوٹ کی بابت اسناد نقد رقم اور تمغے تقسیم کرے گی۔ بہترین مظاہرات اور ایجادات کیلئے بھی اسی طرح کے انعامات دیئے جائیں گے۔ اس کے سوا اعلیحضرت حضرت اقدس و اعلیٰ بندگانعالی کی بارگاہ ہر پرورسے جو پیام شاہانہ رونق افروزی شاہانہ کے بعد سرفراز ہوتا ہے اس کا عکس بجانب سرکار عالی ہر شریک نمائش کو عطا ہوگا۔

ف ۔ مصنوعات کی زیادہ سے زیادہ فروخت پر مجلس نمائش پوری طرح متوجہ رہیگی کیونکہ یہ اس کا بنیادی مقصد ہے۔

ف ۔ ایسے صنعت کاروں کی رقمی امداد بھی کی جائیگی جو مجلس کی رائے میں خصوصی امداد کے مستحق ہوں۔

تفصیلی قواعد اور مزید اطلاعات کے لئے مجلس نمائش سے بلا قیمت طلب کیا جا سکتا ہے۔ خط و کتابت معتمد اعزازی دفتر مجلس نمائش صناعی ملکی حیدرآباد [illegible] معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد دکن ٹیلیفون نمبر ۲۵۰۴۳

سرمایہ دیون	روپیہ	آنہ	پائی
ذخیرۂ عام			
باقی بتاریخ یکم شہریور ۱۳۵۱ف	۴۵۹۲	۶	۹
اضافہ آمدنی بر اخراجات	۵۰۲۹	۱	۸
ذیلی اخراجات			
دیگر رقومات ادا شدنی			
خواجہ حمید احمد صاحب	۵	۱۲	۰
سید اسماعیل اینڈ سنس	۲۴	۸	۰
میزان			

ہم نے فرد واصل باقی کی تنقیح مجلس کے رجسٹرات اور حسابات کی مدد سے کی ہے۔ اور اس سلسلہ میں وہ سب معلومات اور کیف[illegible]
جسکی ہم کو ضرورت تھی۔ ہماری رائے میں یہ فرد واصل باقی بالکل صحیح اور قانون کے مطابق مرتب ہوئی ہے [illegible]س کی ہم نے علیحدہ رپور[illegible]
ہم نے امکنہ حد تک مجلس کے رجسٹرات اور بیانات کے ذریعہ اس امر کا اطمینان کرلیا ہے فقط

[illegible] کے۔ ڈھگے اینڈ کمپنی
چارٹرڈ اکونٹس آڈیٹرس

(شرح دستخط)

حیدرآباد دکن
مورخہ یکم اکٹوبر ۱۹۴۲ء

(شرح دستخط)

میر اکبر علی خاں صاحب — صدر مجلس نمائش
یل۔ ین۔ گپتا صاحب — نائب صدر مجلس نمائش
شرف الدین صاحب — اعزازی معتمد
عبدالعلی صاحب — نائب معتمد
رائے شنکرجی صاحب — خازن
عبدالمجید صاحب صدیقی — رکن
سید محمد علی صاحب موسوی — رکن
عبدالروف صاحب — رکن
ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی — رکن
محمد غوث صاحب — رکن
رائے رگھوبیر بلی صاحب — رکن

آمدنی	روپیہ	آنہ	پائی
ت ٹکٹ داخلہ	۱۶۹۳۶	۳	۸
شرکت وکرایہ اسٹال	۴۱۳۳	۱۵	۴
۔ از انڈسٹریل ڈیمسٹ فنڈ	۸۰۰۰	۰	۰
جات	۹	۰	۰
، اراکین	۸۴	۰	۰
، منافع	۱۰	۲	۶
قیا	۰	۰	۶
میزان	۲۹۱۷۳	۶	۰

ئی کی جانچ کی گئی درست پائے گئے نقط

(شرح دستخط) وی۔ کے۔ ڈھگے اینڈ کمپنی

رجسٹرڈ اکونٹنٹ آڈیٹرس

مجلۂ طیلسانیین

فہرست مضامین

	صفحہ
۱۔ نقل پروانۂ خوشنودی	
۲۔ "پروانۂ خوشنودی"	
۳۔ حرفِ آغاز	ا
۴۔ پیامات	ج
۵۔ خطبۂ استقبالیہ معاشی کانفرنس ۱۳۴۵ف۔ جناب مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی ایم اے ایل ایل بی (عثمانیہ)	۱
۶۔ خطبۂ صدارت معاشی کانفرنس اجلاس اول ۱۳۴۵ف۔ جناب مولوی محمد عبدالرحمن خانصاحب سابق صدر جامعہ عثمانیہ	۷
۷۔ خطبۂ صدارت معاشی کانفرنس اجلاس دوم ۱۳۴۵ف۔ جناب مولوی لیاقت اللہ خانصاحب بی سی ایس معتمد فینانس سرکار عالی	۲۳
۸۔ حیدرآباد میں دیہی تنظیم کی ترقی۔ جناب مولوی رضی الدین صاحب بی سی ایس شریک ناظم سررشتۂ امداد باہمی	۳۳
۹۔ تنظیم دیہی کے بعض معاشی پہلو۔ جناب مولوی برہان الدین حسین صاحب بی اے جی مہتمم مزرعہ رائچور	۴۳
۱۰۔ موضع دوپلی کی معاشی تحقیقات۔ جناب مولوی ناصر علی صاحب ایم اے (عثمانیہ) لکچرار معاشیات جامعہ عثمانیہ	۸۱

اس سال بھی میں نے سالانہ نمایش صنعت ملکی باغ عامہ کا
غور مطالعہ کیا اور اس امر سے محظوظ ہوا کہ الحمد اللہ ہر سال
اس میں بیّن ترقی نمایاں ہے جو کہ ایک قابلِ اطمینان امر ہے
اور ملک کے لئے ایک فالِ نیک ہے!

متعلقہ عہدہ داران جو کہ اپنے فرائض کی بجا آوری میں
منہمک یا مستعد دکھائی دے رہے ہیں یہ بھی ضرور قابل ستایش
ہے کہ بیداری کے آثار چوطرف رونما ہیں اور اگر واقعات کی
رفتار یہی رہی تو وہ زمانہ دُور نہیں ہے کہ ملک خوشحالی اور
ارتقاء کے منازل سرعت سے طے کرتے ہوئے کہاں سے کہاں
پہنچ جائیگا جسکی تمنّا ہر بہی خواہ ریاست کو ہے

۲۹ر ذی حجہ ۱۳۶۰ھ بقلم آصف سابع

پروانۂ خوشنودی

مملکت آصفیہ کے کسی ادارہ کے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا چیز باعث فخر و مباہات ہو سکتی ہے کہ اسکی خدمت گزاری خود حضرت جلالت الملک کی بارگاہ عالی مرتبت میں اس قابل قرار پائے کہ پروانۂ خوشنودی مرحمت فرمایا جائے۔ نہ صرف مجلس نمائش اور معاشی کمیٹی، بلکہ انجمن طیلسانیین عثمانیہ کا ساری تنظیم جس قدر فخر کرے بجا ہے کہ اسکی حقیر کوششیں ملک کے لئے مفید اور مالک کے پاس شرف قبولیت حاصل کر رہی ہیں۔

گزشتہ نمائش مصنوعات مملکت آصفیہ کے ملاحظہ کے بعد بارگاہ جہاں پناہی سے صناعوں کو جو پروانۂ خوشنودی مرحمت فرمایا گیا اس کو پہلی مرتبہ "معاشیات" کی اس اوّلین اشاعت میں سرنامۂ عزت و افتخار بنایا گیا ہے۔

ملازمانِ حضرت بندگان عالی کے اس گہر ریز ارشاد ملوکانہ سے تمام وابستگان سلطنت آصفیہ اور خدمت گذاران ملک کے حوصلے اور ارادے زیادہ قوی اور زیادہ مضبوط ہو جانے چاہئیں، اور اپنے عزیز ملک کو خوشحالی اور ارتقا کے بلند ترین کنگرہ پر پہنچا دینے کے لئے جو سعی عمل میں آ رہی ہے اس میں مزید تیز گامی پیدا کرنی چاہیئے۔

خداوند کریم جلشانہ کی درگاہ صمدیت میں یہ دعا ہے کہ ارادوں میں مضبوطی اور عمل میں خلوص نصیب ہو اور کام کے ایسے نمایاں نتائج حاصل ہوں کہ ہر کام کرنے والا یہ کہہ اُٹھے کہ

شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم

مجلہ

حرفِ آغاز

مملکت آصفیہ قدرت کی بے شمار فیاضیوں سے مالامال ہے، ان قدرتی فیاضیوں سے کام لیکر ملک کی زراعت، صنعت اور تجارت کی ایک ایسی تنظیم جسکی بنیاد ضروریات ملک پر رکھی جائے اور جس سے ملک میں خوش حالی اور فارغ البالی کا دور دورہ ہو ازبس ضروری ہے۔

یہ امر ملک کی خوش بختی کا باعث ہے کہ اب اہل ملک میں معاشی ترقی کا کافی میلان پیدا ہو چکا ہے اور آئے دن سرکار اور رعایا کی کوششوں سے نئی نئی تدبیریں اختیار کی جا رہی ہیں۔

عملی جد و جہد کے ساتھ ملک کے معاشی مسایل پر علمی نقطۂ نظر سے غور و فکر کا بھی ذوق پیدا ہو رہا ہے چنانچہ جامعۂ عثمانیہ کے شعبۂ معاشیات میں بیسوں نوجوان دنیا کے دوسرے ممالک کے معاشی مسایل کے ساتھ خود اپنے ملک کے معاشی حالات کا بھی جوش و انہماک سے جائزہ لے رہے ہیں، ملک میں دوسرے اصحابِ ذوق بھی معاشی امور پر غور و خوص کر رہے ہیں، ملک کی معاشی ترقی کی جد و جہد میں ہاتھ بٹانے کے لئے معاشی کمیٹی اور مجلس نمایش دونوں گرمِ عمل ہیں ان حالات میں یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ معاشی امور پر خیالات اور آراء کے اظہار کیلئے ایک ترجمان مہیا کیا جائے۔

مجلۂ طیلسانیین اس کوشش کا آغاز کرتا ہے۔ خدا کرے کہ یہ کوشش کامیاب ثابت ہو اور مجلۂ طیلسانیین کا حصۂ معاشیات خدمت اور اخلاص مندی کی روایات قائم کرے۔

دُنیا کے اس خلفشار میں کسی نئے کام کا آغاز بیسیوں مشکلات کا سامنا کرنے کے مترادف ہے۔ یوں تو ہر کام کی ابتدا میں دقتوں کا پیش آنا لازمی ہے چنانچہ اس کوشش میں بھی گوناگوں دقتیں پیدا ہوئیں لیکن تکیہ اس بات پر ہے کہ حرکت میں برکت ہوتی ہے اور کوشش مسلسل سے ہی ہر مشکل کامیابی کا مقدمہ بن جاتی ہے۔ مجلہ کی ادارت، معاشی کمیٹی اور کابینۂ انجمن طیلسانیین عثمانیہ کے باہمی اشتراکِ عمل سے توقع ہے کہ جلد سب مشکلات دور ہو جائینگی۔

"معاشیات" کے آغاز کے موقع پر ارادوں اور خیالات کا کوئی مزید اظہار غیر ضروری ہے البتہ سب

بہی خواہان ملک سے یہ استدعا ہے کہ اعانت فرمائیں یہ اعانت جس قدر قوی ہوگی اسی قدر "معاشیات" کی خدمت گزاری اور کامیابی بھی نمایاں ہوگی۔

اس اشاعت میں جو خطبے شایع کئے جا رہے ہیں وہ گزشتہ معاشی کانفرنس میں پڑھے گئے تھے۔ ان خطبات پر اہل ملک کو مزید غور و فکر کی ضرورت ہے۔ اُن مشوروں کی روشنی میں جو ان خطبات میں درج ہیں دوسرے اصحاب کو اپنے خیالات اور عملی صورتیں پیش کرنے کا موقع ہے۔

"حیدرآباد میں دیہی تنظیم" اور "تنظیم دیہی کے بعض معاشی پہلو" کے عنوان سے جو دو مقالے اس اشاعت میں شامل کئے گئے ہیں وہ بھی گزشتہ معاشی کانفرنس میں پڑھے گئے تھے۔

اس اشاعت کے ساتھ "موضع دوپلی کی معاشی تحقیقات" کا مقالہ بھی شامل ہے۔ واضح ہو کہ مجلّہ "طیلسانیین" میں اس مقالہ کی اشاعت کا سلسلہ کچھ عرصہ قبل شروع کیا گیا تھا لیکن ختم نہ ہوسکا۔ فی الوقت اس اشاعت میں اس مقالہ کا ایک مزید حصہ شایع کیا جاتا ہے اور کوشش کیجائیگی کہ آیندہ دو ایک اشاعتوں میں یہ مقالہ جسکے مولف ناصر علی صاحب ام اے ہیں مکمل ہو جائے۔ جن اصحاب کو اس کے ابتدائی صفحات کی ضرورت ہو مجلّہ کے دفتر سے طلب فرمائیں۔

جن کرم فرماؤں نے اپنی نوازش سے ہمت افزائی کے مدنظر پیامات مرحمت فرمائے وہ مخلصانہ شکریہ کے ساتھ شائع کئے جاتے ہیں۔

"وقت کم ہے اور کام بہت، رستہ کٹھن ہے اور منزل مقصود دور، اسلئے ایک زبان اور ایک دل ہو کر ہم سب کو ملک کی معاشی ترقی اور خوشحالی کے لئے وہ سب کچھ کرنا چاہیئے جو ہو سکتا ہے۔"

دعا ہے کہ اعلیحضرت بندگان عالی متعالی آصف سابع خلد اللہ ملکہ کے عہد مسعود میں مملکت آصفیہ معاشی ترقی کے بلند ترین درجہ پر پہنچ جائے۔

پیامات

"انجمن طیلسانیین عثمانیہ اور اس کے ملحقہ ادارے ملک اور ممالک کی جو خدمت گزاری کر رہے ہیں اور مجلس نمائش نے جو نمایاں حیثیت انعقاد صنعتی نمائش سے حاصل کی ہے اس کا لازمی تقاضا یہ تھا کہ کوئی اخبار یا مجلہ مستقل طور پر معاشی اور دیگر مسایل ملکی کے متعلق انجمن کی جانب سے نکالا جائے۔ میں بہ حیثیت ایک شریک کار کے ان تمام دقتوں اور مشکلات کو محسوس کرتا ہوں جو کسی مجلّہ کو ذمہ داری سے چلانے میں پیش آتے ہیں۔ لیکن ان مشکلات کی وجہ سے اس خصوص میں کوئی قدم نہ اٹھانا بھی نامناسب ہی تھا۔ مجھکو دلی مسرت ہے کہ بعض باہمت بھائیوں نے نہ صرف مجلّہ طیلسانیین کو پابندی سے چلانے کا ارادہ کیا ہے بلکہ اس میں حصہ "معاشیات" کا اضافہ کرکے استفادہ کے مواقع میں اضافہ فرما دیا ہے۔ میری دلی تمنّا ہے کہ ملک کی معاشی ترقی میں اس مجلہ کو رہبری کا شرف حاصل رہے"

میر اکبر علی خانصاحب سابق صدر مجلس نمائش معاشی کمیٹی

"مجلّہ کے پڑھنے والوں کے لئے یہ امر نہایت مفید ثابت ہوگا کہ اس کا ایک حصہ معاشی مضامین کیلئے مختص کیا جائے۔ ملک کو "حیدرآبادی معاشیات" کے مطالعہ اور "حیدرآبادی معاشیات" کو ملک کے سنجیدہ افراد کے غور و فکر کی سخت ضرورت ہے۔ ممالک کی سیاسی اور آئینی ترقی اور ان کے موقف کا انحصار بڑی حد تک انکی معاشی آزادی پر ہے اور آپ بڑی خدمت کرینگے اگر ہماری جامعہ کے طالب علموں اور طیلسانیین کو اس مسئلہ میں دلچسپی لینے کی ترغیب دلائیں اور ان کی عالمانہ تحقیقات اور ذہنی کاوش سے ایسے تدابیر پیش کئے جاسکیں جو قابلِ عمل ہوں اور جنکے اختیار کئے جانے سے معاشی آزادی نصیب ہوسکے"

نواب علی یاور جنگ بہادر معتمد امور دستوری سرکار عالی

"یہ امر باعثِ مسرت ہے کہ مجلّہ طیلسانیین کے جدید انتظامات کے تحت اس کا ایک حصہ معاشیات کے لئے مختص کر دیا گیا ہے جس میں اس موضوع کے متعلق مقالات اور خاص مضامین

شایع ہونگے۔ میں اسکی کامیابی کے لئے دل سے خواہاں ہوں۔"

میر لایق علی صاحب نایب جنگ ڈائرکٹر نظام شگر فیاکٹری

"جامعۂ عثمانیہ کے قدیم طلبہ نے معاشی کمیٹی قایم کرکے علمی اور عملی طور پر ملک کی جو خدمت شروع کی ہے وہ بفضلہ امید افزا ہے۔ اللہ تعالے اسعی مشکور فرمائے۔ خاص کر اس کمیٹی کے زیر اہتمام جو سالانہ نمایش بلدہ میں منعقد ہوتی ہے، اور نمایش کے سلسلے میں جو کیفیت شایع ہوتی رہی ہے، اس سے کمیٹی کی کارگزاری کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ حالات مساعدت کریں تو عجب نہیں یہ معاشی کمیٹی آیندہ ترقی کرکے ملک کی کوئی مستقل خدمت انجام دے سکے

معاشی نوعیت کے مضامین کا سلسلہ آپ مجلۂ طیلسانین میں شروع کرنا چاہتے ہیں۔ یہ تجویز مفید ہے"۔

مولوی محمد الیاس برنی صاحب ناظم سررشتۂ تالیف و ترجمہ جامعۂ عثمانیہ

"معاش و معشیت کی موجودہ کشمکش میں عامۃ الناس کو اصول معاشیات سے واقف کرانے کی کوشش قابل مبارک باد اور لایق استحسان ہے میری دلی تمنا ہے کہ جن مقاصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے آپ اس مجلہ کو شائع کررہے ہیں ان میں خدا آپ کو کامیاب کرے"۔

جہانگیر جی مہتا صاحب ناظم بندوبست سرکار عالی

"میں اپنے اُن رفقاء کار کی عدیم المثال اور انتھک کوششوں کو کبھی فراموش نہیں کرسکتا جو انہوں نے آج سے تقریباً پانچ سال قبل بغیر کسی سابقہ تجربہ اور سرمایہ کے نہایت ہی مختصر سی مہلت میں سب سے پہلی کامیاب نمایش مصنوعات ملکی کے انعقاد سے نہ صرف سالانہ کامیاب نمایشوں کی تاسیس کی بلکہ اپنی عملی قابلیتوں کے ذریعہ ملک پر یہ بات واضح کردی کہ زیر سایہ ہمایونی اگر ایثار و محنت اور تنظیمی قابلیت سے کام لیا جائے تو دکن کا مستقبل، ماضی سے زیادہ درخشاں ہوسکتا ہے اور یہاں کے معاشی وسائل سے کماحقہ استفادہ کیا جائے تو ہمارا ملک خوش حال اور دولت سے مالا مال ہوسکتا ہے۔

مجھے توقع ہے کہ طیلسانی برادری کا یہ مجلہ ملک کے معاشی مسائل کا بہترین ترجمان ثابت ہوگا۔"

میر محمود علی صاحب صدر اولین معاشی کمیٹی و مجلس نمایش

"کمالِ تخیل و انتہائے تصور کی حد پر پہنچ کر جو علوم یا فنون تکمیل طلب رہ جاتے ہیں انہیں میں فنون لطیفہ کا شمار ہے اور حسن کی قدر بہ صورت نذر کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ ابتذال ہے۔

کسی فن کار کا حُسن کار کا محض مقصد حسن کاری کے حصول میں قنا اور منہمک ہو جانا ضرور ایک اہمیت رکھتا ہے مگر روزمرہ زندگی میں سطحی انسانوں کے لئے کچھ مفید نہیں ہوتا۔ فنون لطیفہ کے احیاؤ ترویج کمال سے تخیل کا امکان اور صحیح ذوق پیدا ہو سکتا ہے جو انفرادی و مجموعی ثقافت کا ضامن ہے۔ لیکن اس کو محض کمائی کا ذریعہ سمجھنا غلطی ہے۔

البتہ دستکاریوں کی مدد سے شکم پروری ہو سکتی ہے۔ جو ایک آرٹسٹ کے خیال میں معاشیات کا مقصد اوّل ہے۔ بعض دستکاریوں میں آرٹ کا مظاہرہ ہو سکتا ہے اور اس قسم کی دستکاریاں ریاست ابد مدت میں کافی موجود ہیں۔ ان قدیم دستکاریوں میں قدیم و جدید آرٹ کے صحیح امتزاج کے ساتھ ایک خوش گوار ہم آہنگی اور زیادہ افادیت کی طرف خاص توجہ کی ضرورت ہے۔

بعید یا بالواسطہ ہی سہی لیکن قوم کی تاریخی عظمت تخیل کا بلند معیار اور قدیم آثار بھی معاشیات کے پیش نظر ہوتے ہیں جس کے مدِ نظر آرٹ سے متعلق صحیح ذوق پیدا کرنے اور معیاری آرٹ کو بلند سے بلند تر کرنے کی کوشش لازمی ہے۔

یہی امور مرکزی مدرسۂ فنون لطیفہ و دستکاری سرکار عالی حیدرآباد کے اساسی اصول ہیں جن پر کارگزار رہ کر ضروری رہبری میں یہ ادارہ مشغول ہے۔ نونہالانِ ملک اور ابنائے وطن کو اس طرف زیادہ سے زیادہ متوجہ ہونا چاہیئے کہ جس کی بدولت ملک میں دستکاری کی ترقی اور بہ حصول معشیت ملک کی ثروت میں اضافہ ہو سکے۔"

خان بہادر سید احمد صاحب پرنسپل مرکزی مدرسہ فنون لطیفہ

"معاشیات کو انسان کی معاشرتی بلکہ ہر جہتی ترقی میں جو دخل ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ اسلئے منتظمین مجلّہ طیلسانیین کا یہ اقدام کہ مجلّہ کا ایک حصّہ "معاشیات" کیلئے مختص کر دیا جائے ہر آئینہ مستحق تحسین ہے۔ اس میں شک نہیں کہ معاشیات کے بحر زخار میں قدم رکھنے سے پہلے اس کے مبادیات اور اصول سے

واقف ہونا ضروری ہے کیونکہ مستحکم اساس کے بغیر قدم قدم پر ٹھوکر کھانے اور نقصان اٹھانے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی نونہالان ملک اس اہم مضمون کے مطالعہ سے ملک کو صرف اسی وقت کوئی مادی فائدہ پہنچا سکتے ہیں جب کہ وہ یہ دکھلائیں کہ عام اصول کا اطلاق ملکی اور مقامی حالات پر کس حد تک اور کس طرح ہوتا ہے اور مقامی مسائل کا تفصیلی اور غائر مطالعہ کرکے ایسا مواد پیش کریں جو ملک کی معاشی ترقی میں ممد و معاون ثابت ہو۔ مقام مسرت ہے کہ جامعۂ عثمانیہ کے طیلسانیین اس فرض کو ایک حد تک پورا کر رہے ہیں۔ لیکن ابھی بہت کچھ کام ہونا باقی ہے جو طیلسانیین کے عزم راسخ اور سعی مسلسل ہی سے طے پا سکتا ہے۔

میں مجلہ کے حصۂ "معاشیات" کا پرجوش خیر مقدم کرتا ہوں اور اسکی کامیابی کا دل سے متمنی ہوں۔"

مولوی خواجہ معین الدین صاحب انصاری بی سی ایس معتمد سیاسیات

"میں رسالۂ معاشیات کی اشاعت کے موقع پر یہ یاد کرتا ہوں کہ کس طرح نہایت کم وقت اور بہت ہی قلیل سرمایہ سے طیلسانیین عثمانیہ نے نمائش کے انعقاد کی ابتدا کی اور بفضل خدا اسے اتنا کامیاب کر دکھایا کہ سرکار عالی نے اسکا اعتراف کیا اور سال بہ سال نمائش مصنوعات اور نمائش باغبانی و مرغبانی کے انعقاد کو مجلس نمائش سے ہی متعلق کر دیا۔ سرکار عالی کے اکثر اعلیٰ عہدہ داروں نے اسکے متعلق یہ قبول کیا کہ یہ کامیابی اسلئے ہوئی ہے کہ طیلسانیین کو اپنے اس قومی و وطنی کام سے محبت ہے۔

توقع ہے کہ اس طرح انشاء اللہ حصۂ معاشیات کی اشاعت اپنی ابتداء کے بعد ترقی کے مراحل کی مسلسل تکمیل کرکے ملک کی اس علمی برادری کی پوری ہمدردی حاصل کریگا کہ جو معاشیات سے دلچسپی رکھتی ہے اور اسکے متعلق غور و فکر کرتی ہے۔

میری توقعات یہ ہیں کہ "معاشیات" کے مباحث کو اتنا وزنی ہونا چاہیئے کہ ملک کے سارے معاشی مسائل میں اس کی رائے کو وقعت ہو۔"

محمد فاروق صاحب بی سی ایس صدر مجلس نمائش معاشی کمیٹی (۱۳۴۹ف)

"مجلۂ طیلسانیین کے حصۂ معاشیات کا خیر مقدم کیا جاتا ہے حیدرآباد اور ممالک محروسہ میں معاشی ترقی کیلئے

اس قسم کی اشاعت نہایت ضروری ہے۔ معاشی کمیٹی کے ارتقاء کے لئے اس کے پاس اس کے خیالات کی ترجمانی اور تمام ملک کے اہلِ قلم کی کوششوں کو جو معاشیات سے متعلق ہوتی ہیں مجتمع کرنے کیلئے رسالہ لازمات سے ہے۔

مجھ کو یقین ہے کہ معاشی کمیٹی کی ہر حرکت کی طرح اس میں بھی برکت اور کامیابی جلد تر نظر آنے لگے گی۔

یہ ناچیز پیر کہن سال گوشہ نشین بھی حیدرآباد کے علمی معاشیات کا ۴۵ سال سے شوقیہ طالب علم رہا ہے ۴۲ سال قبل اس نے "قلمرو آصفی کی دولت" اور "ہندوستان کی صنعت" کے نام سے دو مقالے مرتب کئے تھے۔ اس کی طباعت میں اور نیز اس قسم کے مضامین کے ترتیب کے بعد اشاعت میں جو دشواریاں ہوتی تھیں وہ حد سے زیادہ تھیں۔ آخرالذکر مقالہ کو جو اُردو میں اپنی نوعیت کی پہلی کوشش تھی اخبار وکیل امرتسر کے اداروں نے طباعت کے لئے طلب کیا تھا اور وہ وہاں لاپتہ ہو گیا۔ اپنے دورِ نوجوانی کا جب موجودہ دور سے مقابلہ کرتا ہوں تو موجودہ نوجوانوں کو قابلِ تبریک و توصیف خیال کرتا ہوں کہ انہوں نے ملک کی معاشی ترقی کے لئے قوت پیدا کر لی ہے۔

اس ملک میں بہ حیثیت مجموعی معاشی ترقی کے جو امکانات ہیں وہ دوسرے صوبہ جات اور ریاستہائے ہند میں مجموعی طور پر کم پائے جائیں گے۔ تھوڑی توجہ اور صحیح قوت کا استعمال ہم کو کدھر سے کدھر پہونچا دے سکتا ہے۔ اس کی تفصیل بارہا ہو چکی ہے۔

کھیتیوں کو دے لو پانی اب بہہ رہی ہے گنگا ؂ کچھ کر لو نوجوانو اُٹھتی جوانیاں ہیں

"ان اللّٰہ لا یضیع عمل عامل منکم"

مولوی حافظ محمد مظہر صاحب اعزازی معتمد ایجوکیشنل کانفرنس

"میں اس موقع پر اپنی دلی تبریک پیش کرتا ہوں کہ مجلّہ طیلسانیین میں ایک مفید حصہ معاشیات کیلئے مختص کیا گیا ہے۔ ماہران علم انسانیات نے حضرت انسان کی تعریف صحیح طور پر بیان کرنے کی بڑی کوشش کی ہے بالآخر ایک مکتب وخیال نے انسان کو "معاشی ہستی" سے موسوم کیا ہے

ایک زمانہ تھا کہ اورنگ آباد اور اس کے نواح اپنے خاص صنایع کے لحاظ سے تمام ہندوستان میں شہرت رکھتے تھے۔ اب یہ حالت ہے کہ صرف نام ہی نام رہ گیا ہے۔ اورنگ آباد نہ صرف اپنے مصنوعات میں

بلکہ اپنی اراضی کی زرخیزی اور خاصیتہً میوہ کی پیداوار میں بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ اگر تفصیلی نظر پرانے واقعات پر ڈالی جائے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دریائے گوداوری کا بالائی حصہ اپنے تیرتھ گاہوں اور اپنے مصنوعات کے سبب قدیم دُنیا میں کافی شہرت رکھتا تھا۔

تاریخ یونان میں پلی ٹھن اور ٹیگیرا ہندوستان کے جو مشہور مقامات مذکور ہوئے ہیں اور جنکو فتح کرنے کا سکندرِ اعظم نے ارادہ کیا تھا وہ پٹن اور دولت آباد سے منسوب کئے جاتے ہیں۔ میں نے اپنے مشاہدہ سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ دریائے گوداوری کے اکثر مقامات قدیم زمانہ میں پارچہ بافی کے اہم مرکز تھے۔ چنانچہ شاہ گڑہ ایک مقام دریائے گوداوری پر واقع ہے۔ جہاں چند سال پیشتر ایک خوبصورت پُل تعمیر ہوا ہے اور جہاں دربار اکبری کی مشہور ہستی ابوالفضل کا قیام رہا ہے۔ وہاں قدیم آبادی میں میں نے تہ خانے دیکھے جہاں مُہین سوت تیار ہوتا تھا۔ قصبہ ناندیڑ میں اس وقت بھی سو بلکہ ایک سو بیس کونٹ کا سوت تیار ہوتا ہے۔ اور افسوس ہے کہ یہ چند مٹھی جوار کے معاوضہ میں فروخت کیا جاتا ہے۔ یہ سمجھا جاتا ہے کہ مصر کے مومیاؤں پر جو ململ لپٹا گیا ہے وہ ناندیڑ ہی کی پیداوار ہے۔ مجھے حال میں پٹن کے کمخاب کا ایک ٹکڑا دیکھنے کا اتفاق ہوا جس کی نسبت تحقیق سے یہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ تخت طاؤس کی گدی کے غلاف کا ایک حصّہ ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار! ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا۔

شہر اورنگ آباد میں اب خالص ریشم سے ہمرو اور مشروع تیار کرنے کے چند ہی کارخانہ رہ گئے ہیں مصنوعی ریشم جو قیمت میں نسبتہً بہت ارزاں ہوتا ہے۔ اُس نے اس صنعت کو بہت نقصان پہنچایا۔ دراصل واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کا تمول اسقدر کم ہوگیا اور بیرونی ساخت کے مال کی سرپرستی اتنی زیادہ ہونے لگی کہ اصل ریشم کے تیار کردہ مال کا بازار بالکل دھندلا ہوگیا۔ یہ ماحول کا نتیجہ تھا کہ مصنوعی ریشم کا استعمال ہونے لگا اور جو اصلی خوبی اورنگ آباد کے مصنوعات کی تھی وہ جاتی رہی۔

یہی حال زر کے تار کا ہے۔ اب بھی اورنگ آباد میں زر کا تار کھینچنے والے لوگ کچھ باقی ہیں۔ قصبہ پٹن کی یہ صنعت بہت مشہور تھی لیکن احمد آباد اور سورت کی مشنری سے جو زر کا تار تیار ہونے لگا اُس نے اس صنعت کو بھی سخت نقصان پہنچایا۔

قصبہ پٹن میں اس وقت بھی کئی سو جولاہوں کے مکان ہیں اور یہ لوگ بیکاری میں مبتلا ہیں۔ میں نے کوشش کر کے سررشتہ کوتوالی اضلاع و کروڑگیری وغیرہ میں شملے تیار کرنے بھیجے۔ لیکن یہ ایک عارضی صورت تھی

ان مصنوعات کو مستقل بنیاد پر قائم کرنے کے لئے ایک اسکیم سرکار عالی نے منظور فرمایا ہے جس کا آغاز میرے زمانۂ قیام صوبہ داری میں ہو چکا تھا۔ اس ادارہ کا طریقہ یہ تھا کہ ہر صنعت کے متعلق خام مال خرید ا جائے وہ اور کاریگروں کو دیا جائے جب مال تیار ہو جائے تو ان کی اُجرت اور منافع ساتھ ہی ساتھ ادا کرکے ادارہ میں یہ مال رکھ لیا جائے اور ادارہ کی جانب سے فروخت کا انتظام کیا جائے۔ یہ طریقہ کار بظاہر آسان معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے دیسی مال کی خریدی کا ماحول باقی نہ رہنے سے وقت پر فروخت میں بڑی دشواری ہوتی ہے جن صاحبوں کو اس خصوص میں دلچسپی رہی ہے۔ ان کے لئے دیہی ہفتہ وار بازار کا یہ معمولی مشاہدہ ہے کہ دور دور سے غریب لوگ اپنا تیار کردہ مال مثلاً کھادی کمبل بازار میں لاتے ہیں اور اونے پونے فروخت کر دیتے ہیں۔ دولت آباد سے قریب ایک مقام ہے جو کاغذی پورہ کہلاتا ہے۔ قدیم زمانہ سے یہاں کاغذ تیار ہوتا ہے۔ خود ان لوگوں کا خیال ہے کہ یہ شہنشاہ تغلق کے زمانہ میں یہاں منتقل ہوئے تھے۔ اس موضع کے کھنڈروں سے یہ ثابت ہے کہ کسی زمانہ میں یہ ایک آباد اور مرفہ الحال مقام رہا ہے۔ چند سال پہلے تو یہ صنعت بالکل مردہ ہو چکی تھی۔ اورنگ آباد کیلئے جو اسکیم صنعتی ترقی کا سرکار سے منظور ہوا اُس میں ایک بڑا امکان ان لوگوں کے کام کرنے کیلئے تیار کرایا گیا اور کاغذ سازی کے حوض اس میں تیار کئے گئے ہیں اب کچھ کام ان غریب کاریگروں کو مل رہا ہے۔

ہندوستان کیلئے بڑی ضرورت اس کی ہے کہ گھریلو صنعت کا رواج جہاں تک ہو سکے دیا جائے۔ اس سے میرا مطلب یہ نہیں کہ میں مشنری کی مخالفت کر رہا ہوں اگر مشنری استعمال کرنا ہو تو سویٹ روسیہ کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ سب سے پہلے وہاں مشنری بنانے کی مشنری قائم کیگئی اور جب اسکا انتظام ہوا تو مقامی طور پر مشنری اور اُس کے کل پرزے تیار کئے جانے لگے۔ باہر سے مشنری کو حاصل کرنا اور سرمایہ داری کے تحت ان مشنری کے کارخانوں کو چلانا اور ہماری غریب آبادی کی کثیر تعداد کو گرانی کے مزدور بنا دینا موجودہ تہذیب کی رجعت قہقری ہے۔ ہزارہا کی تعداد میں غریب عورتیں اس وقت موجود ہیں جنکی معاش کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ خلد آباد جو ایک اُجڑا ہوا دیار ہے۔ وہاں سوت کاتنے کا کام اس ادارہ صنعت اورنگ آباد کے تحت آغاز کیا گیا اور روزانہ ایک ٹنکہ عورت معمولی طور پر کمانے لگی۔ بڑے سے بڑے کارخانہ کی رسائی ان غریب گھروں تک نہیں ہو سکتی اور مشنری کے کل پرزوں کی خریدی میں جو ہزارہا روپیہ صرف ہوتا ہے وہ باہر چلا جاتا ہے۔ ملک کے معاشی حالات کیلئے یہ تباہ کن ہے۔

دیسی صنعت کو فروغ دینے کیلئے اورنگ آباد کی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں کے روایات اسکی تائید میں ہیں اور مختلف قسم کے صنایع کا یہ مقام حامل رہا ہے۔ اس جنگ عظیم کے بعد دنیا کے حالات بدلنے والے ہیں۔ آئندہ گھریلو صنعت کا موقف کیا ہوگا؟ اور غریب سے غریب اور بے سہارا شخص کو بیکاری سے بچانے کیلئے کیا تدابیر اختیار کئے جائینگے؟ ان پر غور کیا جائے۔ صورتِ حال یہ ہے کہ ملک کی آبادی میں روز افزوں اضافہ عمل میں آرہا ہے۔ ۱۹۳۹ء کی مردم شماری میں چودہ فیصد اور حالیہ مردم شماری میں بارہ فی صد کا اضافہ ہوا ہے۔ اس کے مقابل تدراعتی رقبہ میں صرف چند فی صد کا اضافہ ہوا ہے اور صنعتی پیداوار کا اضافہ اسکے مقابل جو ہوا ہے وہ بہت کم ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے ممالک میں صرف چار پانچ سال کی مسلسل محنت و توجہ سے اپنے ملک کی بیکاری کو قطعاً مٹا دیا گیا ہے۔ ہندوستان اور خاصتہً ملک دکن میں جو گنجائش صنعتی ترقی کی ہے اور جو امکانات ممالک محروسہ سرکار عالی میں قوت برقی پیدا کرنیکے ہیں ان کے لحاظ سے ملک کے ہر ایک گوشہ میں صنعتی ترقی کو نافذ کرنا غیر معمولی دشوار نہیں ہے۔ ہم اپنے ملک دکن سے بس یہی خطاب کرسکتے ہیں۔

بال بکشا و صفیر از شجر طوبیٰ زن ؛ حیف باشد چو تو مرغے اسیر قفسے

مولوی غلام احمد خاں صاحب سید مجلس طبی یگانہ نواب بہادر یار جنگ بہادر

"مجھے مجلۂ طیلسانیین کے حصۂ معاشیات کیلئے پیام دیتے ہوئے بے انتہا مسرت ہے مجلۂ طیلسانیین ملک کے اچھے لکھنے والوں کے ٹھوس اور علمی مضامین شایع کرنے میں اپنے دیگر ہمعصروں سے ممتاز رہا ہے۔ اس مجلہ میں "معاشیات" کا اضافہ بلاشبہ اپنے اندر بہترین مقاد رکھتا ہے۔

کسی ملک کی معاشی ترقی ہی حقیقی معنوں میں ترقی کہلانے کی مستحق ہے۔ انجمن طیلسانیین عثمانیہ کی معاشی کمیٹی ہر سال نمایشوں کے انعقاد سے ملکی صنعتوں کو پھلنے پھولنے کا بہترین موقع فراہم کررہی ہے اور یہ بہتر کام ملک سے خراج تحسین حاصل کرچکا ہے۔ اس عالمگیر اور ہولناک جنگ نے ہمیں معاشی اور صنعتی ترقی کے بھی خاص مواقع فراہم کردئیے ہیں۔ جبکہ سابقت کا امکان بھی کم ہوگیا ہے۔ ہماری صنعتیں بہت جلد قائم اور مستحکم ہوسکتی ہیں۔ جنگ کے زمانہ میں صنعتوں کا قیام نہ صرف فتح حاصل کرنے میں مدد دیتا ہے بلکہ اس سے ہمہ جہتی ترقی کی ایک مستقل اور مضبوط بنیاد پڑسکتی ہے۔

مجلۂ طیلسانیین کے حصۂ معاشیات کو ملک کی معاشی اور صنعتی ترقی میں بہت زیادہ کام کرنا چاہیئے۔

ک

"مجھے ملک کے ترقی پسند اور سرگرم عمل طیلسانیین سے توقع ہے کہ وہ ملک کے وافر وسائل کو کام میں لاتے ہوئے ہمارے ملک کو فائدہ پہنچانے کے اس زرین موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیں گے۔ مملکت حیدرآباد کی موجودہ قابلِ رشک علمی اور ذہنی ترقی کے ساتھ صنعتی ترقی نہایت ضروری ہوگئی ہے جسکے بغیر کوئی ملک ترقی کرسکتا ہے نہ کوئی قوم اپنا بچاؤ کرسکتی ہے۔ ہماری مشترکہ اور متحدہ کوششیں اس میدان میں جاری ہیں تو وہ دن دور نہ ہوگا جبکہ ایک عظیم تر حیدرآباد اور اُسکے باشندوں کے مستقبل کو درخشاں بنانے میں ہمارا حصہ بھی شاندار رہے۔"

نواب دوست محمد خاں صاحب جاگیردار

"معاشیات ایک ایسا فن ہے جسکے مقررہ اصول انسان کی مادی زندگی سے متعلق ہیں جسطرح کہ اخلاقیات کے قوانین انسان کی روحانی زندگی سے متعلق ہیں۔ معاشیات کے اصول ماحول کے سانچے میں ڈھلتے ہیں ہر ملک کا معاشی نظام اس ملک کی جغرافی کیفیت، ضروریات زندگی اور زمانہ کے مطابق ہوتا ہے۔ اس عالمگیر جنگ نے دُنیا کی معاشی زندگی کو درہم برہم کردیا ہے، جنگ کے بعد کے حالات شاید اور بھی تباہ کن ہوں۔ حیدرآباد کے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ آج ہی حالات حاضرہ کے تحت اپنا معاشی نظام مستحکم کرلے اور کل کے لئے ایک ایسا لائحہ عمل تیار کرے کہ آنے والی دوڑ میں ہم کسی سے پیچھے نہ رہیں۔

معاشی کمیٹی انجمن طیلسانیین عثمانیہ نے معاشیات کے ایک جزو یعنی صنعت و حرفت کو فروغ دینے میں جو عملی کام کیا ہے وہ مصنوعات ملکی کی سالانہ نمایش سے اور اسکے سلسلہ میں جو "رہبر" (گائڈ) شائع ہوتا ہے اس سے صاف ظاہر ہے۔ معاشی کانفرنس بھی منعقد ہوتی ہے۔ ملک کے معاشی سروے اور پلاننگ کا کام بھی جاری ہے اور اب مجلۂ طیلسانیین کا ایک حصہ جو آئے دن کے معاشی مسائل پر احتیاط کے ساتھ غور و فکر کرکے بہ شکل مضامین تجاویز پیش کرنے مختص کیا گیا ہے ایک مبارک اقدام ہے۔

مجھے قوی اُمید ہے کہ ماہرین معاشیات اور ملک کی معاشی ترقی سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس مفید اور ضروری کام میں عملی حصہ لینگے۔"

مولوی سید محمد علی صاحب موسوی سابق صدر معاشی کمیٹی و مجلس نمائش

خطبۂ استقبالیہ

از جناب مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی ایم-اے-ایل-ایل-بی
پروفیسر کلیۂ جامعۂ عثمانیہ

خواتین و حضرات!

ملک کے اس معاشی اجتماع میں جو آج ایک اہم مقصد کیساتھ منعقد ہو رہا ہے، میرا کام صرف اسقدر ہے کہ میں آپ حضرات کو اس کی اہمیت اور مقاصد سے روشناس کراؤں، یہ اپنی نوعیت کی اہم اور نئی کانفرنس ہے جو اس وقت چوتھی مرتبہ نمایش مصنوعات ملکی کے آغوش میں منعقد ہو رہی ہے۔ یہ درصل ملک کے معاشی مفاد سے متعلق ایک دعوت غور و فکر ہے، اس کا مقصد یہ ہے کہ ملک کے ارباب بصیرت جو ملک کی حیات سیاسی و معاشی سے وابستہ ہیں ایک جگہ جمع ہو کر اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیں اور ماضی کی روشنی میں حال و مستقبل کے متعلق مشورہ دیں تاکہ ملک اور حکومت کے سامنے معاشی زندگی کا ایک اچھا لائحہ عمل تیار ہو جائے۔ ایسے سنجیدہ اجتماعوں کی ہر جگہ ضرورت سمجھی گئی اور حیات معاشی کی صحیح تعمیر کا یہی طریقہ ہے۔ آج چار سال سے یہ کانفرنس اس بات کی کوشش کر رہی ہے کہ ملک کی حیات معاشی کے مختلف شعبوں پر سیر حاصل مقالے لکھوائے، مبصرین کی قیمتی رائیں جمع کرے اور بحث و تمحیص کا بیش بہا مواد فراہم کرے تاکہ اس طریقے سے ملک اور حکومت کے سامنے غور و فکر کا ایک اچھا سرمایہ جمع ہو جائے اور

ملک کی خاطر خواہ معاشی رہنمائی ہوسکے۔

معاشی کمیٹی جس کے اہتمام سے یہ کانفرنسیں منعقد ہو رہی ہیں، بڑی امنگوں کیساتھ قائم کیگئی اور اس کا بست وکشاد لایق طیلسانیین کے دامن خلوص کے ساتھ وابستہ کیا گیا کہ یہ ملک کے سچے خدمت گزار ہوں اور ملک کی خوشحالی کے لئے انتھک کوشش کریں، اس کمیٹی کا نصب العین ملک کے تمام معاشی حالات پر نظر رکھنا اور لائحہ عمل بنانا اور پیچیدہ مسائل سلجھانا ہے تاکہ پیدائش تقسیم اور صرف دولت کے خوشگوار وسائل دریافت ہوسکیں اور ملک کو وہ معاشی اطمینان نصیب ہو جو ہونا چاہئیے۔ ہر متمدن مملکت کا معیار ترقی یہ ہے کہ وہ ایک طرف افراد مملکت کے ذہنی واخلاقی قوتوں کی تربیت کا خاطر خواہ سامان کرے، دوسری طرف ملک کے قدرتی وسائل کا جائزہ لے کر اُن سے پورا فائدہ اٹھائے، دنیا کی تمام ترقیوں کی یہی مختصر تفسیر ہے۔ جن ممالک نے ہمارے سامنے ترقی کی انھوں نے درصل انہیں دو ذرائع سے کام لیا۔ جو ممالک ان سے غافل رہے وہ شاہراہ مسابقت میں بہت پیچھے پڑگئے۔ حیدرآباد کی مملکت بھی اسی غور وفکر کی طالب ہے جس طرح اس کی سیاست خاص ہے اسی طرح اس کے معاشی مسائل بھی جداگانہ نوعیت رکھتے ہیں، ان کے سلجھانے کے لئے اس ملک کی طبعی جغرافی خصوصیات اور تاریخی روایات کو پیش نظر رکھنا چاہئیے جو صدیوں سے چلی آرہی ہیں، اگرچہ معاشی حالات پرسکون زمانے میں بھی بدل جاتے ہیں اور ہر وقت ایک نئے غور وفکر کی ضرورت ہوتی ہے لیکن جنگ عالم کے انتشار میں ان کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے اسی بین الاقوامی تلاطم میں جس کی تاریکی بحر اوقیانوس سے لیکر بحر الکاہل تک پھیلی ہوئی ہے مستقبل کا پتہ لگانا بہت مشکل ہے کہ یہ کارروان کس منزل پر دم لیگا لیکن ارباب بصیرت پیشین گوئی کر رہے ہیں کہ یہ دنیا کا بہت بڑا انقلاب ہے جس میں سیاست ومعاشرت کے پرانے تصورات ٹوٹ پھوٹ جائیں گے اور عجب نہیں کہ حیات معاشی بھی ایک نیا قالب اختیار کرے، اور ظاہر ہے کہ ہماری معاشی زندگی کا موجودہ طریقہ کار اُن بدلتے ہوئے حالات کا جواب نہیں

ہوسکتا بلکہ ہمیں اپنے جدید سرمایہ پر غور و خوض کے ساتھ مقابلہ کے لئے تیار رہنا چاہئے۔

جب معاشی کمیٹی نے ملک کی معاشی خدمت اپنے ذمہ لی تو اُس نے ایک طرف نمائش مصنوعات ملکی کا آغاز کیا جو مخلص کارکنوں کی انتھک کوششوں سے پروان چڑھ رہی ہے' اس نمائش کی بدولت نہ صرف تمام ملک کی مصنوعات بہ یک وقت اہل ملک کے سامنے آگئیں اور ان کے استعمال کی جایز ترغیب ہونے لگی بلکہ صناعوں کی خاطر خواہ حوصلہ افزائی ہو رہی ہے' دوسری طرف معاشی کانفرنسیں منعقد کرکے بحث و تمحیص کا دروازہ کھول دیا گیا۔

حضرات! دکن ایک وسیع سرزمین کا نام ہے جس کے طول و عرض میں جو ست پڑا کے پہاڑوں سے لیکر جنوب میں دریائے کاویری تک پھیلے ہوئے ہیں اور مشرقی و مغربی گھاٹوں سے اس کے ڈانڈے ملتے ہیں بڑی دولت چھپی ہوئی ہے جو اس ملک کی طبعی اور جغرافی خصوصیات کی پیداوار ہے۔ ان دلکش مناظر کے ساتھ جو سرسبز وادیوں اور شفاف ندیوں میں پائے جاتے ہیں اس کے گھنے جنگلات زرخیز مزرعوں اور سونے اور جواہر کے معدنوں میں بیش بہا معاشی ذخائر موجود ہیں۔ انہی طبعی خصوصیات اور اس کے معاشی ذخیروں نے اس ملک کی تاریخ بنائی اور اس کے تمدن کو سنوارا۔ دکن کے قدیم اور وسطی سلاطین نے جس طرح اس ملک کی سیاسی خدمت کی اسی طرح اپنے جذبۂ وطنیت کے ساتھ اس کی معاشی خدمت بھی انجام دی' بہمنی بادشاہوں نے اس ملک کی معاشی ترقی کے لئے مختلف معاشی وسائل اختیار کئے' زراعت کی خاص پرداخت کیگئی اور مختلف طریقوں سے کاشتکاروں کو خوشحال بنایا گیا کیونکہ اس زمانہ میں بھی شعبۂ معاش سلطنت کے مالیہ کا سرچشمہ تھا۔ اس کے علاوہ صناعوں کی حوصلہ افزائی کیگئی۔ اپنے خاص ذوق سے مصنوعات میں لطافت اور شگفتگی پیدا کی گئی۔ خطۂ دکن کی مصنوعات ایشیاء اور یورپ کے بازاروں میں فروخت ہوتی تھیں جب سترھویں صدی میں دکن کی سیاست ملک عنبر کے ہاتھ آئی تو

اس محسن اعظم نے دکن کی معاشی ترقی کے لئے ایک عظیم الشان لائحہ عمل تیار کیا۔ پہلی مرتبہ
زمینات کی پیمائش کروائی، بندوبست کا انتظام کیا، آب رسانی اور آبپاشی کے لئے بڑی
بڑی نہریں دوڑائیں، اوزان اور پیمانوں کا تعین کر کے تجارت میں خوش اسلوبی پیدا کی۔ تلنگانہ
میں قطب شاہیوں نے زراعت کی ترقی کے لئے بڑے بڑے تالاب بنائے اور مسولی پٹم
اور مدراس کی بندرگاہیں کھول کر تجارت خارجہ میں جان ڈال دی۔

سلطنت آصفیہ ایک وسیع مملکت ہے جو اسلاف سے ہمیں ورثے میں ملی ہے۔ یہ
بڑے فخر کی بات ہے کہ اس سلطنت نے دکن کی قدیم روایتوں کی حفاظت کی۔ اس کی
تاریخی یاد ہمیں بتاتی ہے کہ ایک زمانہ میں اسی سلطنت ابدمدت کے حدود دریائے تاپتی
سے شروع ہو کر دریائے کاویری پر ختم ہوتے تھے اور مشرق میں تمام ساحل کارومنڈل
اس کے زیر نگیں تھا۔ سلاطین آصفیہ نے اپنے خون دل سے اس کی آبیاری کی اور یہ مقدس
امانت آئندہ نسلوں کے لئے چھوڑی، اس بات کی ضرورت تھی کہ ہر زمانہ میں پوری وفاداری
کے ساتھ اس کی سیاسی و معاشی خدمت کی جاتی لیکن افسوس ہے کہ اس سلطنت کی
یہ خدمت نہیں ہوئی اور بجائے اضافے اس کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ اٹھارویں صدی
کے وسط میں اس سلطنت کو مشرق اور جنوب کے زرخیز اضلاع سے ہاتھ دھونا پڑا جو مقطع
شمالی اور مفوضہ کہلاتے ہیں اب نہ صرف ان اضلاع کی بازیافت بعید از قیاس معلوم ہوتی
ہے بلکہ اُن کے معاوضہ کی بھی توقع نہیں ہے۔ ہم برار کے زرخیز صوبے سے محروم ہو گئے
جو آصف جاہی دولت کا سرچشمہ تھا۔ ۱۸۰۰ء کے معاہدہ کی رو سے حیدرآباد کو
مسولی پٹم کی بندرگاہ سے استفادہ کرنے کا پورا حق حاصل ہے جو تجارت خارجہ کا
بہت بڑا دروازہ ہے۔ چنانچہ سولہویں اور سترھویں صدی میں قطب شاہی سلطنت
اس بندرگاہ سے کام لیتی تھی اور اپنی قومی دولت میں بیش بہا اضافہ کرتی تھی لیکن
معاہدہ کی تاریخ سے آج تک اس سلطنت کو اس بندرگاہ سے فائدہ اٹھانے کا

موقع نہیں دیا گیا۔ سکندرآباد کنٹونمنٹ کے محاصل آبکاری پر سے حیدرآباد محروم ہے۔
ان کے علاوہ اکثر اندرونی مسائل بھی ایسے ہیں جو کس مپرسی کے عالم میں پڑے ہوئے ہیں اور اُن کی وجہ سے معاشی مشکلات ہر روز بڑھ رہے ہیں بعض مصنوعات پر جو جنگ کے زمانے میں بہت ضروری ہیں' بیرونی قیود عائد ہیں تعلیم یافتہ بے روزگاروں کا ابتک دیانتداری کے ساتھ حل نہیں کیا گیا بے روزگاروں کے لئے جو سررشتہ تحصیل معیشت قائم ہے وہ صرف مخصوص لوگوں کا ذریعہ معیشت بنا ہوا ہے مجھے یہاں یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ ہم ان مسائل کی عقدہ کشائی سے گریز نہیں کرسکتے۔ اگر ان سے بے پروائی کی جائیگی تو ملک کو بے شمار معاشی مشکلات کا سامنا کرنا پڑیگا۔

حضرات! بڑی خوشی کی بات ہے کہ اس کانفرنس کو آج ملک کی دو بڑی شخصیتوں کی صدارت کا فخر حاصل رہا ہے۔ مولوی عبدالرحمٰن خان صاحب کے کسی تعارف کی ضرورت نہیں ہے۔ موصوف نہ صرف طبیعیات کے بہت بڑے عالم ہیں بلکہ ایک بڑے ماہر تعلیم بھی ہیں جن کے ساتھ تعلیم و تربیت کا دیرینہ تجربہ ہے ملک کی علمی و اخلاقی خدمت موصوف کا ہمیشہ حقیقی نصب العین رہا ہے۔ جامعۂ عثمانیہ کی تعمیر میں مولوی عبدالرحمٰن خان صاحب کا جو حصہ ہے وہ اس مختصر صحبت میں ظاہر نہیں کیا جاسکتا موصوف نے دس سال جامعہ کی خدمت کی اور سچ پوچھیے تو موصوف نے ہی اس جامعہ اور اس کے تمام شعبہ ہائے حیات کی حقیقی تعمیر کی ہے۔ جامعۂ عثمانیہ کے فرزند جو اس وقت علم کی مشعلیں لئے ہوئے حیدرآباد کے طول و عرض میں پھیل رہے ہیں وہ سب موصوف کے خوشہ چیں ہیں' میں کہہ سکتا ہوں کہ ابھی ملک کو موصوف کی علمی رہنمائی کی ضرورت ہے۔

مولوی لیاقت اللہ خان صاحب معتمد فینانس کی صدارت بھی ہمارے لئے

باعث فخر ہے معاشیات موصوف کا خاص مضمون رہا ہے اور موصوف نے وقتاً فوقتاً ملک کی معاشی و سیاسی حالات کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور آپ میں ملک کا صحیح احساس ہے اور اس وقت موصوف کو ملک کے اہم شعبہ ہائے نظم و نسق کے ساتھ جو گہرا تعلق ہے وہ ہماری رہنمائی کے لئے بہت ضروری ہے اور میں....... سمجھتا ہوں کہ اس زمانہ میں جب کہ سیاسی حالات ہر روز بدل رہے ہیں، موصوف اپنے بیش بہا عملی تجربوں سے ملک کی صحیح رہنمائی کر سکتے ہیں۔ جب معاشی کمیٹی کی طرف سے صدارت کی درخواست کی گئی تو صاحبان نے نہایت فراخدلی کے ساتھ درخواست منظور کر لی جس کے لئے یہ کمیٹی شکرگزار رہے۔

آخر میں یہ خطبہ اعلیحضرت بندگان عالی خلد اللہ ملکہ، کی دعائے عمر و اقبال پر ختم کرتا ہوں فقط

از عالیجناب مولوی محمد عبدالرحمن خان صاحب بی ایس سی آنرز لندن
اے آر سی ایس ایف۔ بی ایس ایل ایف آر اے۔ ایس

اجلاس اول

حیدرآباد کی معاشی ترقی کے مبادیات پر تبصرہ!

عثمانی طیلسانئین کی معاشی کمیٹی نے ازراہِ محبت مجھ کو اپنے اس سال کے پہلے اجلاس کی صدارت کے لئے جو منتخب فرمایا ہے اس کا میں تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں میں بخوبی یہ جانتا ہوں کہ معاشیات کے متعلق میری معلومات غیر فنی ہیں میرے پاس نہ تو معاشیات کی کوئی ڈگری ہے اور نہ میں نے اس کا درسی نصاب ختم کیا ہے اس مضمون سے مجھ کو جو بھی واقفیت ہے وہ محض مشاہدہ اور ذاتی تجربہ پر مبنی ہے۔ اگر میری زندگی ملک اور اہل ملک کی خدمت میں صرف نہ ہوتی اور سائنس کی تحقیقات اور ایجادات سے دائمی وابستگی نہ ہوتی تو میں کبھی اس صدارت کے فریضہ کو انجام دینے کی جسارت نہ کرتا۔ سب سے بڑا محرک اس دعوت کے قبول کرنے میں عثمانین سے میرا گہرا تعلق ہے جو جامعۂ عثمانیہ کے قیام سے ایک نہ ایک طریقہ پر ابتک چلا آرہا ہے۔ اگرچہ سرکاری حیثیت سے اس کو ختم ہو کر کئی سال گذر چکے جب تک انسان کے دل کی حرکت موقوف

نہ ہو جائے خلوص و محبت کا احساس برقرار رہتا ہے۔

طالب علمی کی جنت سے نکلکر نوجوان جب کسب معاش کی دنیا میں قدم رکھتے ہیں تو دنیاوی امور کے متعلق ان کے سابقہ کتابی تصورات نقش برآب کی طرح ٹوٹ کر بہہ جاتے ہیں۔ مسابقت کی کشمکش بسا اوقات اراکان اور خود ان کی نگاہ کے زاویوں میں اختلاف، اہل اثر کا اپنے محصل فوائد پیدائشی اور موروثی قبضہ قائم رکھنے کی کوشش اور سب سے بڑھکر نوجوان کی ناتجربہ کاری یہ سب ملکر ان کو اتنا پریشان کرتے ہیں کہ وہ اکثر اوقات سوسائٹی اور تمدن کو اپنا بدخواہ سمجھنے لگتے ہیں اور اس کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ وہ جماعت جس کی تکوین دنیا کو جوان سرسبز اور خوشحال رکھنے کے لئے قدرت کا بنایا ہوا فطرت کا یہ عظیم الشان قانون ہے معطل اور ماؤف ہو جاتی ہے اور دنیا اسی قدر ترقی کے راستے میں پیچھے پڑ جاتی ہے۔

اس میں ذرا بھی کلام نہیں کہ نوجوانوں کو ان کی ناتجربہ کاری کی وجہ سے تجربہ کار بوڑھوں و پیشروؤں کی نیک نیت اور پرخلوص ہدایتوں کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی کہ بوڑھوں کو اپنی جانشینی کے لئے بلند ہمت مستعد اور سعادتمند نوجوانوں کا تیار کرانا۔ ان دونوں ضرورتوں کے صحیح توازن کے ساتھ جو کوئی کام کئے جاتے ہیں منشائے فطرت کے موافق انجام پاتے ہیں اور دنیا ترقی کے راستے پر بغیر کسی رکاوٹ کے چلنے لگتی ہے۔

میں نے اس مسئلہ کا ذکر اس لئے کیا کہ بعض لوگوں کو یہ کہتے سنا ہے کہ عثمانی طیلسانئین سے پہلے بھی نوجوان دوسرے جامعات سے طیلسان لیکر نکلتے تھے۔ کبھی انہیں ایسی انجمن بنانے کی ضرورت نہیں ہوئی اور نہ معاشی اور متمدن دنیا کے دیگر مسائل پر ان کو دماغ لڑانا پڑا۔ اس کے جواب میں سردست اتنا کہنا کافی ہے کہ جامعۂ عثمانیہ کا قیام اور اس میں قوت عمل پیدا ہونے سے پہلے اس ملک میں گنتی کے چار پانچ گرائجویٹ سالانہ پیدا ہوتے تھے اور چند مخصوص خدمات کو چھوڑ کر سعی اور سفارش کے ذریعہ انکو ملازمت مل جاتی تھی جو گرائجویٹ

ہوتے تھے انھیں بھی تحصیل معیشت یا ملازمت میں کوئی دقت نہیں محسوس ہوتی تھی بلکہ بعض اوقات کلیۃً اتفاقات یا اثرات کے تحت (کچھ مدت تک امیدواری کرنے کے بعد) فارغ التحصیل اشخاص بہت سے پیچیدہ اور بہتر عہدہ جات پر مامور ہو جاتے تھے لیکن اب طیلسانیین کی بڑھتی ہوئی تعداد اور ان کا احساس خودی اور دنیا کی عام بیداری کی تیز ترفتاری یہ سب انکو مجبور کرتے ہیں کہ تحصیل معاش کے بہتر اور بیشتر ذرائع دریافت کئے جائیں اور حکومت کا ہاتھ بٹایا جائے کیونکہ اس میں طرفین کا فائدہ ہے۔ میں معاشی کمیٹی کے خیالات وجذبات کی صحیح ترجمانی کرنے سے قاصر رہونگا اگر محض تحصیل معاش وملازمت کو ان کا نصب العین یا محرک عمل قرار دیا جائے جب وطن انسانی ہمدردی شوق ریاضت اور ایثار کو بھی اس میں بہت کچھ دخل ہے۔ انسان کا کوئی کام جو محض حصول منفعت کی خاطر کیا جاتا ہے کبھی ایسی کامیابی اور عام مقبولیت حاصل نہیں کر سکتا جو ایثار کے لئے قدرت کا عطیہ ہے۔ اس کانفرنس کے عملی کوششوں کی کامیابی خود اس کی صداقت کا بین ثبوت ہے۔

جب تعلیم یافتہ اشخاص ہی نے تعلیم یافتہ بیروزگاری کے انسداد کی کوشش شروع کردی ہے اور تعمیری تجاویز پیش کیجارہی ہیں تو قوی امید ہے کہ حکومت بھی اسکی طرف کافی توجہ کرے گی۔

میرا روئے سخن اس مقالہ میں زیادہ تر بلکہ اوراں میں بھی طیلسانیین کی طرف رہیگا اس وجہ سے کہ میں چاہتا ہوں کہ طیلسانیین نے جس خدمت کا بار اپنے اوپر آپ خود عائد کرلیا ہے وہ زیادہ تر انھیں کی کوششوں اور ہمت سے پورا ہو سکے۔ مصنوعات ملکی کی نمائش کے ذریعہ آپ حضرات نے ملک میں جو معاشی بیداری پیدا کردی ہے تعریف سے بالاتر ہے اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ آپ کی ان کوششوں سے ملکی صنعتیں نہ صرف اپنے پیروں پر آپ کھڑی ہو جائیں بلکہ ان کی مسلسل ترقی سے ملک کے صناعوں کی تعداد اور انکی خوشحالی

میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

یورپ اور امریکہ کے ممالک کی صنعتی ترقیوں کو دیکھ کر یقیناً آپ پر واضح ہو گیا ہوگا
کہ جس پیمانے پر یہ کام وہاں ہو رہے ہیں سالہا سال کی منفرد و متفقہ کوششوں کا نتیجہ ہے
حالیہ زمانے میں حکومت کی ساری قوت اس کے ذرائع پیداوار و سائل حمل و نقل اور
ماہر انسانوں کی متفقہ دماغی محنت جب تک منظم طریقہ پر متحد ہو کر خاص اغراض کو پیش نظر رکھے
ہوئے کام نہ کریں وہ حیرت انگیز نتائج حاصل نہیں ہو سکتے جو یورپی ممالک میں دیکھے اور سنے
جا رہے ہیں۔ جرمنی اور جاپان کے حالات تو اس وقت تک راز میں رہے جب تک کہ
انھوں نے اپنے ظالمانہ اچانک حملوں سے دنیا کو مصیبت اور تباہی میں نہ جھونک دیا۔
انگلستان اور امریکہ ان کے رد عمل میں دن رات مصروف ہیں اور خدا سے دعا ہے کہ ان کے
مساعی جلد سے جلد ظلم و ستم کی قوتوں کو شکست دیں ان مساعی میں برطانوی امپائر کے
تمام ممالک بشمول اقلیم ہند شریک ہیں۔

اس ضمن میں روس کی قبل جنگ کوششوں کا حال جو پروفیسر برنال نے حال میں نیچر
کی ایک اشاعت میں مختصراً بیان کیا ہے دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ اگر سوویٹ روس مذہب
سے منحرف نہ ہوتا تو دنیا اس سے بدظن نہ ہوتی ہمیں خذ ما صفا دع ما کدر پر
عمل پیرا ہونا چاہئے۔ انگلستان کا عمل بھی روس کے ساتھ یہی ہے۔ روس کو ان دنوں
جرمنی کے مقابل میں جو فتح نصیب ہو رہی ہے بالکلیہ اس کی سابقہ و حالیہ معاشی تنظیم
ہی کا نتیجہ ہے ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء کی جنگ سے پہلے روس میں صرف گنتی کے ماہران
سائنس پیدا ہوئے انیسویں صدی تک روس کی ایک سو ملین آبادی میں سے
لومونوف، چیبیکاف، منڈیلیف، پاولوف، لوباچیفسکی، میڈام کوالیوسکی اور
کلاوس کے سوا کوئی بڑی ہستی دنیائے سائنس سے خراج تحسین حاصل نہ کر سکی۔
سامنے روس میں ۱۹۱۹ء میں صرف چالیس تربیت یافتہ طبیعیات کے عالم

جب اس کو اپنی علمی پسماندگی کا احساس ہوا تو نئے مدارس کھلے جامعات (علاوہ لینن گراڈ
موسکو اور کازان کے جو ۱۹۱۷ء سے قبل قائم ہو چکے تھے) کھولے گئے اور ان میں سائنس کے
آلات کی تیاری کا بھی انتظام ہونے لگا اور اس طرح بیس سال کے اندر اس کے
مختلف الاقوام باشندے تعلیم اور علی الخصوص سائنس سے ایسے مانوس ہوگئے کہ اس وقت
وہاں کی پانچ فیصد آبادی جامعات کے نصاب تک تعلیم پا رہی ہے۔ درآں حالیکہ
برطانیہ جیسے دیرینہ تعلیم کے حامی ملک میں صرف دو فیصد آبادی اس درجہ تک پہنچی ہے
اب حکومت کی پنجسالہ تنظیموں کے سلسلہ میں تقریباً تمام رعایا سائنس کے انکشافات
سے مستفیض ہو کر زراعت، صحت عامہ، میکانیات اور برقی انجینیری اس قدر عام کر دی گئی
ہے کہ سائنس ہر روسی متنفس کی روزمرہ زندگی کا جزو لاینفک بن گئی ہے (کاپٹسا کے نام
سے کون واقف نہیں ہے)۔ ایسے چند اور ماہران سائنس کے علاوہ روس میں متوسط
قابلیت کے بے شمار سائنس دان ملک کے صنعتی، زرعی اور رفاہی مسائل کی تحقیق میں
جا بجا اپنے معملوں میں کام کئے جا رہے ہیں یہی وجہ ہے کہ روس باوجود جرمنی کی میکانی
قوت اور تجربہ کار سپاہ سے شدید ترین نقصان اٹھانے کے بالآخر اس کو شکست دے سکا۔

ہمارا ملک بھی اگر سائنس کی تحقیقات سے استفادہ کرے تو کوئی وجہ نہیں کہ
قلیل المدت میں دنیا کے منظم سے منظم ملک کے ساتھ دوش بدوش نہ چل سکے۔ اس کیلئے
جامعاتی تعلیم میں سائنس کو حالیہ مقام سے بہت زیادہ بلند مقام دے رکھنے کی ضرورت
ہوگی تاکہ موجودہ تعداد سے زیادہ طلباء اور حالیہ معیار سے بالاتر معیار کی تعلیم و تربیت
کا انتظام ہو سکے تعلیم عملی ہو نہ کہ کتابی۔ اس عالمگیر جنگ کے زمانے میں مشنری اور دیگر
سائنٹفک سامان کی فراہمی ناممکن ہے کیونکہ باہر سے درآمد مشکل ہے اور خود ہمارے
ملک میں ان کی تیاری صنعتی ماہرین کے فقدان کی وجہ سے ناممکن ہے سردست ہمیں
چاہئے کہ قدرت سے جو ذرائع زراعت، جنگلات اور معدنیات کی پیداوار سے

دستیاب ہوتے ہیں انھیں کو سائنٹفک طریقے پر استعمال کرنے کی کوشش کریں۔
ہمیں پاور الکحل اور چوبی اسپرٹ کی تیاری، برقی طاقت کی تحصیل اور دیاسلائی سازی، پارچہ بافی اور معدنیات کی فراہمی پر اجتماعی حیثیت سے عمل پیرا ہونا چاہیے۔ تعلیم یافتہ نوجوانوں کو ایسے کاموں پر متعین کرنے سے تھوڑی ہی مدت میں نمایاں ترقی محسوس ہونے لگے گی اور بیروزگاری کا مسئلہ آپ سے آپ حل ہو جائیگا۔

سرکار عالی کی مالی امداد سے سمنٹ، پارچہ بافی، اور شکر سازی کے جو کارخانے قائم ہوئے ہیں ان سے ملک کو براہ راست اور بالواسطہ جو فائدہ پہنچ رہا ہے محتاج صراحت نہیں۔ اگر برقی طاقت کی فراہمی کی اسکیم سرکار سے منظور ہو جاوے تو برقی کیمیائی ذرائع سے ہمارے ملک میں روزمرہ استعمال کی بہت سی چیزیں کافی مقدار میں سستے داموں مہیا ہو سکیں گی مثلاً سوڈا، پوٹاش، کلورین اور ان کے مرکبات، الومنیم وغیرہ۔ اور باہر سے ان کا منگوانا کم ہو جائیگا۔ امید کیجاتی ہے کہ جب یہ کارخانے قائم ہونگے تو ان میں ملک کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی روز افزوں تعداد شرکت حاصل کرتی جائیگی۔ مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اگر بعض شریر اقوام نے سائنس جیسے متبرک علم کو، جو بنی نوع انسان کے لئے فی الحقیقت اللہ تعالےٰ کے قادر مطلق ہونے کی سب سے زیادہ موثر دلیل ہے تعمیری اور مستحسن کاموں پر استعمال کرنے کے بجائے تخریبی اور شیطانی افعال کا آلہ بنا رکھا ہے نفس یا ذات سائنس پر اس کی ذمہ داری عائد نہیں کیجا سکتی بلکہ شریر اقوام ہی پر جو ایسے افعال کے مرتکب ہیں۔ معہذا سائنس کے برے استعمال کا انسداد سائنس ہی کی طاقتوں سے ہو سکتا ہے۔ زمانہ جنگ میں چند مثالیں یا اہم سے نہیں۔

بڑی خوشی کی بات ہے کہ حکومت اب صنعت کی تعلیم کی طرف متوجہ ہو گئی ہے۔ آج کل جامعہ عثمانیہ میں بمقام قریب زراعت کی کلیہ قائم کرکے ایک ہو رہی ہے جس سے طلبا کو

حاصل کرنے والوں کو مناسب زمینات دیگر تقاوی اور چند سالہ معافی محصول کے ساتھ بنات خود بمشورہ محکمۂ متعلقہ زراعت کرنے کی ترغیب دلائی جائے تو یقیناً بڑے فوائد حاصل ہونگے۔

مجھ کو بزمانۂ صدارت کلیہ جامعۂ عثمانیہ ایک کمیٹی کے اجلاس میں جو زراعت کی فیکلٹی کے قیام پر غور کرنے کے لئے منعقد ہوا تھا۔ بعینہٖ یہی مشورہ دینے کا موقع ملا تھا۔ افسوس ہے کہ اس کے بعد جامعہ کی طرف سے میرے زمانے میں کوئی مزید کارروائی عمل میں نہیں آئی۔ اب بھی اس خصوص میں کام ہوسکتا ہے اور بڑی کامیابی کے ساتھ ہوسکتا ہے۔

میں اپنے آپ کو بڑا ہی خوش نصیب سمجھتا ہوں کہ میرے زمانۂ صدارت میں مجھ کو طیلسانین جامعۂ عثمانیہ کو اعلیٰ تعلیم دلانے اور دنیائے علم میں نام آور بنانے کا موقع ملا نہ صرف جامعۂ عثمانیہ ہی کے طیلسانین کو بلکہ نظام کالج وغیرہ کے بھی قابل افراد کو بتوسط اسکالرشپ کمیٹی یورپ کی جامعات میں اعلیٰ سے اعلیٰ طیلسان حاصل کرانے میں کامیابی نصیب ہوئی۔

آج جن نوجوانوں کے علمی کارناموں پر حیدرآباد کو فخر ہے۔ اُن میں سے اکثر و بیشتر میرے طالب علم اور میرے ہی سفارشی ہیں۔ میں جانتا تھا کہ جامعہ کو خصوصاً اور ملک کو عموماً کن شعبوں کے ماہروں کی ضرورت ہوگی اور میں نے ان کو تیار کرانے میں دل کھول کر کوشش کی اور بالآخر کامیاب ہوا۔ اس قسم کے مواقع ہر شعبہ میں اب بھی موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ اچھے کام کرنے والوں کو بہتر توفیق عطا فرمائے۔

۱۹۳۵ء میں جب مجھ کو جامعۂ عثمانیہ کی طرف سے یونیورسٹی کالج لندن کے صد سالہ جشن میں بطور نمائندہ شریک ہونے کے لئے انگلستان بھیجا گیا تھا۔ میں نے

بطور خود آکسفورڈ کیمبرج اور لندن کی جامعات کے سرآوردہ اساتذہ و منتظمین سے ملاقات کرکے عثمانیئن کی اعلیٰ تعلیم کے لئے موزونیت بتاکر بیرونی جامعات میں صرف ان کی شرکت بلکہ انکو تحقیقاتی کاموں پر متعین کرانے کے وعدے لئے۔ اس طرح جامعۂ عثمانیہ کے اکثر یورپی وظیفہ یاب بہترین تعلیم و تربیت حاصل کرسکے جیسا کہ میری سرکاری رپورٹ ڈیپوٹیشن (مندوبیت) جس کی نقل اُس وقت کے مجلۂ کلیہ جامعۂ عثمانیہ کی ایک اشاعت میں طبع ہوئی ہے پڑھنے سے معلوم ہوسکیگا۔

اب بھی جامعۂ عثمانیہ سے ایسے ہونہار نوجوان تیار کرائے جاسکتے ہیں جو اپنے لائق پیش رؤں کے قدم بقدم چل سکینگے۔

سر علی امام مرحوم کی صدارت عظمیٰ میں جبکہ میں نظام کالج کی سائنس لابوریٹریوں کو بحیثیت پروفیسر سائنس کے عملی جامہ پہنا چکا تھا۔ ان کے ایک دوست نے مجھ سے غیر رسمی طور پر مشورہ کیا کہ حکومت کے پیش نظر بعض فنی شعبوں کے لئے چند ہونہار طلباء کو یورپ بھیجکر اعلیٰ تعلیم دلانا مقصود ہے۔ کن مضامین کا انتخاب موزوں ہوگا میں نے فوراً مٹلرجی کاغذسازی گلاس ٹکنالوجی اور میکانیکل انجینئرنگ کی عملی تعلیم کی طرف توجہ مبذول کرائی۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ حکومت نے اس تجویز سے اتفاق کیا اور چند ہی سال میں ان فنون کے مستند قابلیت کے افراد تعلیم پاکر واپس ہوئے اور کام پر لگائے گئے چنانچہ آج بھی وہ اپنے اپنے دائرۂ عمل میں ملک کی مفید خدمات انجام دے رہے ہیں۔

زراعت کی ترقی کا میدان بہت وسیع ہے۔ ہمارے ملک میں نواب علی نواز جنگ بہادر اور ان کے شرکاء کار کی کوششوں اور حکومت کی مالی امداد سے بڑے بڑے تالاب موجود ہیں جن کی وجہ سے زراعت کو بہت ترقی دیجاسکتی ہے۔ میرے زمانہ صدارت میں شعبہ حیاتیات کے ایک لکچرار صاحب کے لئے دوران تعلیم میں اسی جامعہ سے ایم۔ ایس۔ سی کی ڈگری حاصل کرنے کی سہولتیں مہیا کیجاسکیں۔ اب وہ محکمہ سمکیات (فیشریز ڈپارٹمنٹ) میں منتقل ہوئے ہیں۔

امید ہے کہ ان کی کوشش سے بنگال کی طرح یہاں بھی مچھلیاں افراط سے ملنے لگیں گی عثمانیہ کے ایک سابق طالب علم نے جامعہ لندن سے انٹومالوجی میں ریسرچ ڈگری لی ہے۔ اگر زراعت کا ایک باضابطہ ریسرچ انسٹیٹیوٹ قائم کیا جائے تو اس کے مشورے سے آلات زراعت کی تیاری کے ساتھ نباتات کے مہلک جراثیم کا استیصال، مقامی ذرائع ہی سے کھاد کی تیاری، چوپایوں کی افزائش اور اجناس کی بیشتر پیداوار کا خاطر خواہ انتظام ہو سکتا ہے۔

قدرت نے ہمارے ملک کو بعض میووں سے مالا مال کر رکھا ہے لیکن ہم ان کی قدر نہیں جانتے مثلاً آم۔ لیمو۔ موسمبی۔ شریفہ۔ کرونده۔ املی وغیرہ۔ ان سب کی کاشت کے لئے صرف بیج کا بو دینا اور معمولی سی دیکھ بھال کافی ہے۔ آخری تین کے تو جنگل ہی جنگل دکھائی دیتے ہیں اور تقریباً خودرو ہیں نہ صرف اپنے پھلوں سے حیدرآباد کی تقریباً مفت خدمت بجا لاتے ہیں بلکہ اس کے پہاڑوں کی چٹانوں کو خاموش طریقہ پر ہزارہا سال سے مسلسل مٹی میں تبدیل کئے جا رہے ہیں جو بارش سے نیچے بہہ کر اجناس کی کاشت کا سامان قدرتی طریقہ پر بہم پہنچاتی چلی آ رہی ہے۔ ان درختوں کی سنبھال اور نگہبانی ملک کی آمدنی میں معتد بہ ترقی پیدا کر سکتی ہے سب لوگ جانتے ہیں کہ ہمارے جنگلوں میں آملہ، چرونجی، تاڑ اور کویٹ وغیرہ کے درخت بھی بکثرت موجود ہیں۔ ان کے پھلوں کی پیدائش اور افادیت میں وافر اضافہ ہو سکتا ہے۔ اگر سائنس سے مدد لی جائے۔

حیدرآباد فارمر کی ایک سابقہ اشاعت میں ایک مقامی مفکر نے بے تخم شریفہ کی کاشت کا کامیاب طریقہ بتایا ہے۔ تخم والا ہو یا بے تخم شریفہ کو اس ملک میں جس بے اعتنائی اور حقارت سے دیکھا جاتا ہے قابل افسوس ہے اس کے برخلاف بلاک بیری، ڈمسن وغیرہ انگلستان کے جنگلی پھلوں کی خود وہاں اور پھر ہمارے پاس یہاں آنے پر جو قدر ہوتی ہے ہر شخص بخوبی اس سے واقف ہے۔ اگر میوہ جات سے مربہ سازی اور اس کے تحفظ کا معقول انتظام کیا جائے (جو ذرا سی محنت سے لیکن غور و فکر کے ساتھ آسانی کیا

ہو سکتا ہے) تو اس کو نہ صرف سال بھر دیگر لذیذ غذاؤں کی طرح استعمال کیا جا سکتا ہے بلکہ بیرون ملک بھی تجارتی اشیا کے ساتھ بھیجا جا سکتا ہے۔

ارواح و عطریات کی بھی سائنٹفک طریقہ پر تیاری ہو سکتی ہے سینتھک (تالیفی) طریقوں کے جاری ہونے سے پہلے ملک میں نامیاتی کیمیا کے ماہروں اور معدنی زنغال کے مختلف کیمیائی الملاقات کا خیر مقدم کرنا ہوگا۔ سر دست ذرا سی توجہ سے کشید کے موزوں ترکیبیں اگر اختراع کئے جائیں تو ہمارے باغات کے پھولوں ہی سے نہ صرف مختلف قسم کے قیمتی اور حقیقی عطر بلکہ بعض مفید دوائیں بھی کشید کئے جا سکیں گے اور پھول کا مصرف جو زمانہ دراز سے شادی اور موت کے موقعوں پر محض موقت زینت اور نمائش چلی آ رہی ہے مستقل اور دیرپا کاموں میں تبدیل ہو سکیگا۔

ہماری ارضیاتی پیمائش بتاتی ہے کہ دکن کے تاریخی جواہر اور قیمتی فلزات یا تو اب ختم ہو چکے ہیں یا زیر زمیں ایسے مدفون ہیں کہ ان تک رسائی بڑی جد و جہد اور صرفہ کثیر کی محتاج ہے۔ انڈیاس منرل ویلتھ (ہندوستان کی معدنی دولت) مصنفہ کاگن براؤن ۱۹۳۶ء کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہٹی کے سونے کے معادن پر ۱۹۰۳ء میں کام آغاز ہوا اور ۱۹۲۰ء میں تین ہزار پانچ سو فٹ کی گہرائی تک پہنچنے کے بعد بند کر دیا گیا اس اثنا میں ایک لاکھ دس ہزار سات سو ستاون پونڈ اسٹرلنگ کا سونا برآمد کیا گیا نہیں معلوم کمپنی کے حصہ داروں کو کس شرح سے منافع تقسیم کیا گیا۔ ہٹی میں از سر نو حکومت کی طرف سے کام جاری ہوا ہے۔ امید کہ اس سے ملک کو حقیقی اور گرانقدر فائدہ حاصل ہوگا۔ اسی کتاب کے حوالے سے کہتا ہوں کہ گارنیٹ (ایک قسم کا یاقوت جو تامڑا بھی کہلاتا ہے شفاف اور سرخ رنگ کا غریب پیٹھ تعلقہ کھم سے کوئی پندرہ سال پہلے کافی مقدار میں یورپ بھیجا گیا جو زیورات کی تیاری میں استعمال ہوا۔ اگر مزید تلاش کی جائے تو کیا عجب دوسرے مقامات پر بھی اس کا پتہ چلے۔ سنگ زنغال اور سنگ مرمر کی کانیں اور سنگ سیلو کے طبقات اب بھی

برابر کام کر رہے ہیں - اپنے ذاتی مشاہدہ سے کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے ملک میں صحراؤں کے بطن اور پہاڑوں کی جیبوں میں اگیٹ، امیتھسٹ بلور اور کیلسا ئیٹ کی اچھی قسمیں موجود ہیں جو ڈھونڈنے والوں کو ملجاتی ہیں یا فیرائٹز کی قلمیں بھی جو پتھر کا پھول کہلاتی ہیں ملک کی تہوں میں چھپی ہوئی ہیں لیکن میرا ذاتی تجربہ ہے کہ وہ اس مقدار میں نہیں ملتی ہیں کہ ان سے گندھک یا اس کے مرکبات کی تیاری سود مند ہو - سرسری معائنہ اور باضابطہ تفتیش میں بہت فرق ہے اگر منظم تحقیق کی جائے تو شاید صورت حال اس سے کہیں بہتر ثابت ہو -

سلیکا کی جن شفاف اور نیم شفاف رنگین اور بے رنگ اقسام کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے ان سے اکثر ممالک میں نگینہ کا کام لیا جاتا ہے - ہندوستان میں کمبائت اور راجپوتانہ وغیرہ اس کے لئے مشہور ہیں - امریکہ میں تو والڈو نامی کمپنی نے اس کو بطور صنعت استعمال کرنے کے لئے کم داموں کے حکاکی کے آلات بھی بنا رکھے ہیں اور وہ فروخت کئے جا رہے ہیں - ہمارے صناع ان آلات کو رواج دیکر نام نہاد جڑاؤ زیورات کی جھوٹی جھلک سے مستورات کو نجات دلا سکتے ہیں - مسٹر میکڈونالڈ سے ایک مرتبہ میں نے اس بارے میں بطور نمونہ جات اشیاء صنعتی پر گفتگو کی تھی -

جنگلات کے محکمہ کی رپورٹوں سے پتہ چل سکتا ہے کہ ہمارے ملک میں چوبینہ اور دیگر اقسام کی لکڑی کی پیداوار کیسے ترقی کر سکتی ہے - میں نے چند سال قبل میسور سے درخت صندل کے بیج لائے اور اپنی مختصر زمین میں ان کو بویا - جب تک ان کی معاونت کیلئے کوئی میزبان درخت ان کا ساتھ نہ دے صندل اچھی طرح نشو و نما نہیں پاتا - میں نے دیکھا ببول ان کی میزبانی کے لئے تیار ہے اور ہمارے ملک میں اس کی کمی نہیں - اگر تجربہ کے طور پر ببول کے جنگلوں میں صندل کی کاشت کی کوشش کی جائے تو ذاتی معلومات کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ یقیناً کامیاب ثابت ہوگی -

طبیعیات سے طبیعی ہئیت (اسٹروفزکس) اور طبیعی ارضیات (جیوفزکس) کا قریبی تعلق ہے۔ جامعہ کے معملوں سے دور ہونے پر میں نے اپنا وقت زیادہ تر انھیں علوم کی تحقیقات پر وقف کر دیا ہے۔ احساس ہے علم کی کچھ خدمت کر لی ہے اور کر رہا ہوں۔ باغ سے انسان توان سے بھی دور رہتے ہوئے شعبوں تک پہنچ سکتا ہے۔ اسی لئے میں ان مختلف امور کے متعلق کچھ کہہ سکا۔ اپنے اتفاقیہ مشاہدات سے چند مفید معلومات جو مجھ کو حاصل ہو سکیں میں نے ان کو اہل ملک کی خدمت میں پیش کر دیا۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ ان تمام علوم و فنون سے واقفیت کا اظہار مقصود ہے۔ من آنم کہ من دانم۔

اگر مجھ کو اجازت دی جائے تو میں آپ حضرات کو مشورہ دونگا کہ اپنے ذوق رضا کاری میں آپ حیدرآباد کے چھوٹے کاریگروں مثلاً پارچہ بافوں، چرم کی دباغت کرنے والوں اور تل، مونگ پھلی اور ارنڈی وغیرہ کا تیل نکالنے والوں سے دریافت کریں کہ انھیں کس قسم کی مدد چاہئے۔ روپیہ پیسہ کی یا سرکاری مراعات کی یا کاروان ملازمین کی یا تیار شدہ سامان کے خریداروں کی۔ اکثروں کو غالباً روپیہ کی ضرورت دائمی ہوگی۔ ان کو بلند ہمت سرمایہ داروں سے (جو صنعتی کاموں سے مربیانہ طریقہ پر نہیں بلکہ تجارتی اصول پر دلچسپی رکھتے ہوں) روشناس کرایا جائے تاکہ کافی اطمینان کے بعد قرضہ وغیرہ کا انتظام ہو سکے اور طرفین کو ایک دوسرے پر اعتماد ہو جائے۔ اگر آپ کی کوئی ذیلی کمیٹی اس کار خیر کے انجام دہی کے لئے قائم ہو جائے اور باقاعدہ رجسٹروں کے ذریعہ پیشہ وروں اور ارباب سرمایہ داروں کے صحیح پتے درج کر کے انھیں ایک دوسرے سے متعارف کرایا جائے (بغیر خود اپنے پر کوئی ذمہ داری لئے) تو امید ہے کہ کئی ایک چھوٹی صنعتیں چلنے لگیں گی۔ محکمۂ امداد باہمی کے توسط سے روپیہ بطور قرض تقویتاً مل سکتا ہے۔ لیکن شاید اس کے شرائط کی تکمیل چھوٹے پیشہ وروں کے لئے مشکل ہے۔ ممکن ہے آگے چل کر حکومت ایسے کاروبار کے لئے آسان شرائط نافذ کر سکے۔ ساہوکار تمام کو روپیہ فوراً دیتے ہیں لیکن قرضہ کے ساتھ بیچارے غریب سود اور کفالت کی زنجیروں میں اس بری طرح

سے پھنس جاتے ہیں کہ مرکر یا دیوالیے ہوکر ہی نجات پاتے ہیں۔

جہاں تک مجھے علم ہے دستی پارچہ بافوں کو ان دنوں روپیہ کے بعد روئی کے دھاگے اور خام ریشم کی بڑی ضرورت ہے۔ ان کی فراہمی کے لئے حکومت کی امداد اور ماہران فن کے مشورہ کے ساتھ اگر چھوٹے پیمانے پر اقل سرمایہ کی کمپنیاں قائم ہوکر کام کرنے لگیں تو مقامی پارچہ باف اپنے مالیہ افلاس سے ایک گونہ چھٹکارا حاصل کر سکیں گے اسی طرح شیشہ سازی، چرم سازی اور تیل نکالنے کے لئے چھوٹے سرمایہ کی کمپنیوں کے قیام پر بھی فنی نقطۂ نظر سے غور ہو سکتا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ حکومت کے بعض محکمہ جات اس قسم کی اطلاعیں اور مشورے پبلک کے مواد کے خاطر از راہ استحسان بہم پہنچا سکیں یا بہم پہنچانے کا آگے چلکر انتظام کر سکیں۔

شیشہ کی ایک صنعت کو حیدرآباد میں جو کامیابی ہوئی ہے اس سے ہر شخص واقف ہے محنت و استقلال اور حساب و کتاب کی صحیح جانچ اور سب سے بڑھکر کارپردازوں کی ایمانداری فنی مہارت کی کمی کو بھی بالآخر پورا کر دیتے ہیں شاید اس کے بتانے کی ضرورت نہیں کہ ہمارے ملک میں کار کا پتھر جو شیشہ کی تیاری میں سب چیزوں سے زیادہ شریک ہوتا ہے جا بجا بافراط ملتا ہے خود بلدہ کے قرب و جوار میں اس کی کئی پہاڑیاں اور ٹیلے ہیں کار کا پتھر ۹۹ فیصد خالص سلیکا ہے اور اس کو ۸۰۰ درجے مئی تک گرم کرنے پر اس قدر بھربھرا ہو جاتا ہے کہ تقریباً آٹے کی طرح پیس لیا جا سکتا ہے سوڈا اور پوٹاش وغیرہ بیرون ہند ممالک سے خریدنا پڑتا ہے لیکن جب برقی طاقت سستی ہو جائیگی تو جیسا کہ قبل ازیں اوپر ذکر آچکا ہے نمک طعام سے سوڈے کی تیاری آسانی اور سستی ہو جائیگی۔ میں یہاں تاج گلے ورکس کی کامیاب صنعت کا ذکر کئے بغیر رہ نہیں سکتا۔ یہ کامیابی تعاون دولت و دماغ کے منافع کی درخشاں دلیل ہے اور ثابت کرتی ہے کہ اس تعاون سے مٹی بھی سونا بن جاتی ہے۔

ایک زمانہ سے میرا خیال تھا کہ دیہات کے باشندوں کے لئے تیل اسٹوو کی کم پہنچے
اور مٹی کے تیلوں کا ایک ایسا آمیزہ تیار کیا جائے جو بغیر دھواں دیے ہاتھ کی بنائی
ہوئی دیسی بتی میں بلا تکلف اچھی طرح جل سکے اور معمولی مٹی گروں کے تیار کردہ لیکن صحیح اصول پر
جلنے والے چراغوں میں بلا خوف آتش زدگی دیر تک جل سکے۔ میری دانست میں اسوقت یہ
مسئلہ جنگ کے اقتصادی مسائل کے ساتھ شہری و دیہاتی امیر و غریب سب کے لئے اہم اور
حل طلب ہو رہا ہے۔ کیا ہی اچھا ہوگا اگر کوئی نوعمر سائنس دان مقامی صناعوں کے ساتھ
ملکر اس کے حل میں مصروف ہو جائے۔ ہندوستانی دماغ سائنٹفک ایجاد کے لئے کسی طرح
ناموزوں نہیں متعدد ہندوستانی موجد حکومت ہند سے اپنے ایجادات کے تحفظ کے متعلق
پیٹینٹ حاصل کئے ہیں۔ جامعہ عثمانیہ اور نظام کالج اور بعض مدارس کے طالب علم بھی
ورنیل اسپیکل بینچ کے بیطالوی پیٹنٹ سے واقف ہونگے۔ کیا اس کی یاد کو تازہ کرانے سے
انھیں اس قسم کے آلات کی ایجاد کا شوق نہ ہوگا۔

(مجھے افسوس ہے کہ حال ہی میں لفٹننٹ کرنل ای۔ ڈبلیو۔ سلاٹر ایم۔ بی۔ ای نے انسٹیٹیوٹ
آف انجینئرز حیدرآباد کے سامنے مملکت آصفیہ کی صنعتی ترقی کی تجاویز و تدابیر پر جو مقالہ پڑھا
اس کے سننے کا موقع نہ ملا مجھے یقین ہے کہ اس مقالہ میں انھوں نے فنی نقطہ نظر سے نہایت
دلچسپ اور مفید باتیں بیان کی ہونگی۔ اگر یہ جلد طبع ہو جائے تو پبلک اس سے بہت فائدہ
اٹھا سکیگی) اس عالمگیر جنگ کے دوران میں ہندوستان کو صناعی ملکوں کے ساتھ دوش
بدوش اپنا ہوگا ہمیں توقع ہے کہ سلطنت حیدرآباد بھی میکانیات و برقیات میں بہت
ترقی کریگی۔ ہمارے سرکاری ٹیکنیکل کالج اور مدارس نوجوانوں کو مشین کا کام سکھائے چلے
جا رہے ہیں امید ہے کہ ان اداروں میں امیدوار بکثرت شریک ہونگے اور یہاں سے تربیت
پاکر بیرونی ماہروں کی طرح ملک کی صنعتوں کو ترقی کے راستہ پر چلا سکیں گے۔ اگر گلائیڈرز کے
استعمال اور اون کی صنعت کی تعلیم کا بھی سرکار انگریزی سے انتظام ہو جائے تو ہمارے

نوجوانوں کو فن پیمائش کی بہت جلد رغبت ہوگی۔ لاعلمی کی وجہ سے اس کی جو وحشت دلوں میں بیٹھی ہوئی ہے دور ہوجائیگی۔ سرکار عالی سرکار عظمت مدار کی امن اور جنگ کے تمام کاموں میں جانتے ہیں اس جنگ میں فن پیمائش کو جو اہمیت حاصل ہے محتاج شرح نہیں۔

اس موقع پر میں معاشی کمیٹی کے ارکان صاحبان کو خصوصاً اور جمیع باشندگان حیدرآباد کو عموماً یاد دلانا چاہتا ہوں کہ کسی فن یا علم یا پیشہ میں اگر صرف معدودے چند کارکن ہوں تو اُن کے بعض ماہر شہرہ آفاق ہونے پر بھی ملک کی ضرورت کسی طرح پوری نہیں ہو سکتی اس کے لئے متعدد اور مستقل کارکنوں اور ماہروں کا ہونا لازمی ہے۔ یہ خیال کہ قابل اشخاص کی افراط سے علم و ہنر کی قدر و منزلت کم ہو جائیگی یا ان کے لئے نوکریاں مہیا نہ ہو سکیں گی درست نہیں۔ لایق لوگ ملازمت سے مستغنی ہونگے بلکہ اپنے کاموں کی بنا ڈالیں گے جن سے ملک کی پیداوار بڑھ جائیگی اور نئی ملازمتیں از خود پیدا ہونے لگیں گی۔

خالص علمی کاموں میں بھی جو ترقی جامعہ عثمانیہ کے توسط سے گذشتہ پندرہ سال کے اندر ہوئی ہے محتاج بیان نہیں۔ کلیۂ جامعہ عثمانیہ کے ریسرچ جرنل کی اجرائی کا میں نے جب (اپنے صدارت کے زمانہ میں) خیال ظاہر کیا تو بہت کم اصحاب اس کے حامی نظر آئے تاہم میں نے کافی گنجائش نکال کر اساتذہ کا ایک ریسرچ بورڈ اپنی نگرانی میں قائم کیا چند ہی ماہ میں اس جرنل کی شہرت جاپان سے لوس انجیلوس تک ہوگئی جس کی دلیل وہ خطوط ہیں جو میرے نام ان مقامات کے محققین نے روانہ کئے۔ حیدرآباد اکیڈیمی جس کا علمی ہفتہ چند ماہ قبل اس نے حضرت شہزادہ والاشان اعظم جاہ ہزہائینس پرنس آف برار کی سرپرستی میں منایا اس بات کی تازہ دلیل ہے کہ ملک میں بین الاقوامی شہرت کے حامل افراد کی کمی نہیں۔ اس کے علاوہ بیرونی علمی کانفرنسوں میں حصہ لینے والے حضرات بھی کافی تعداد میں موجود اور پیدا ہوتے جارہے ہیں یہ کام حکومت کی توجہ سے انجام پارہے ہیں اور مزید ترقی کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

اب میں ان تعلیم یافتہ بیروزگار حضرات کی خدمت میں ایک مشورہ پیش کرتا ہوں جو اگرچہ بیروزگاری کا فوری علاج متصور نہیں ہوسکتا تاہم اس پرکار بند ہونے سے سکون قلب ضرور پیدا ہوسکیگا۔ وہ یہ کہ جو صاحب کسی خاص پیشہ یا صنعت یا ملازمت کے لئے کوشاں نہ ہوں اپنے فرصت کا وقت عبادت اور جسمانی ورزش کے بعد کتب خانۂ آصفیہ یا اس کے مماثل اداروں میں صرف کریں۔ کتب خانۂ آصفیہ کے موجودہ اہتمام سے اوقات و ایام مطالعہ میں اتنا اضافہ ہوگیا ہے کہ ہر نوع کا جویائے علم اس سے خاطر خواہ استفادہ کرسکتا ہے۔

اس کے بعد میں ارکان معاشی کمیٹی کا مکرر شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے مجھ کو اس جلسہ کی صدارت کا اعزاز بخشا اور جو کچھ میں نے کہا اس کو توجہ سے سنا۔ آخر میں اپنی تقریر کو اس دعا پر ختم کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہمارے آقائے ولی نعمت حضور پرنور ہزاگزالٹیڈ ہائینس دی نظام حیدرآباد وبرار اور شاہزادگان بلند اقبال وشاہزادیان فرخندہ فال کے عمرو اقبال میں ترقی عطا فرمائے اور ہمارے ملک کو اس عالمی جنگ کی ہولناکیوں سے محفوظ رکھے۔ آمین

از جناب مولوی محمد لیاقت اللہ خان صاحب ایچ سی ایس معتمد فینانس سرکار عالی

اجلاس دوم

معاشی کمیٹی نے کانفرس کے آج کے اجلاس کی صدارت مجھ ہیچمدان کے تفویض کرکے جو عزت بخشی ہے اُس کے لئے میں بدل ممنون ہوں! اور بلا کسی تمہید کے اپنے ناچیز خیالات کو ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں آپ کے آگے پیش کرتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ ہر ملک کے معاشیات اُس ملک کے جملہ طبقوں پر محیط ہوتے ہیں خواہ وہ اہل حرفہ ہوں یا زراعت پیشہ ملازم پیشہ ہوں یا خانگی پیشہ ور پس معاشی پستی کے رفع کرنے کے لئے ہر طبقۂ ملک کے حالات کا مطالعہ ضروری ہے۔ جب اسباب دریافت ہوجائیں تو اُن کا حل مشکل نہ ہوگا چنانچہ ایک طبیب نسخہ تجویز کرنے سے پہلے مرض کی تشخیص کرتا ہے ورنہ اگر تشخیص صحیح نہ ہو تو علاج غلط اور نتیجہ سود مند ہونے کے بجائے نقصان رساں ہوگا۔

آپ حضرات واقف ہیں کہ زمانۂ قدیم میں جب کہ رسل و رسائل کے ذرائع موجود نہ تھے مختلف قطعات عالم معاشی حیثیت سے ایک دوسرے سے بالکل بے تعلق اور اپنی ایک علحدہ دنیا میں زندگی بسر کرتے تھے۔ چنانچہ ممالک محروسہ سرکار عالی کی قدیم دیہی تنظیم بھی یہی تھی کہ ہر گاؤں میں بلوتہ وار مقرر تھے۔ مثلاً بڑھائی۔ لوہار۔ کمار۔ موچی وغیرہ

جن کا یہ فرض تھا کہ کاشتکاروں کے جملہ ضروریات کی تکمیل بلا رقمی معاوضہ کے کریں اور جب کھیت تیار ہو جائے تو اپنا بلوتہ بشکل اناج حاصل کرلیں۔ گویا خدمت کا بدل خدمت سے ہوتا تھا۔ جیسے جیسے رسل و رسائل کے ذرائع مہیا ہوتے گئے شہریوں کی زندگی دیہاتیوں کی زندگی پر اثر انداز ہونے لگی۔ حتیٰ کہ ریلوں، جہازوں موٹر کاروں اور طیاروں کے عالم وجود میں آنے کے بعد مختلف ممالک ایک دوسرے سے اس قدر متصل ہو گئے کہ وقت اور فاصلہ کوئی چیز نہ رہے اور تمام دنیا گویا ایک خطہ بن گئی! اور مختلف ممالک کے تمدن میں اختلاط ہو گیا۔ بالفاظ دیگر دنیا کے مختلف ممالک کی اب وہی شکل ہو گئی ہے جو زمانۂ قدیم میں ایک موضع کی تھی اور افراد کے مابین خدمات کے بدل کے بجائے اب ممالک اور اقوام کے درمیان اپنی اپنی پیداوار کے بدل کا طریقہ رائج ہو گیا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اُس وقت انسانیت کا یہ اصول کارفرما تھا کہ خود بھی جیو اور دوسروں کو بھی زندہ رہنے دو! اور اب بربریت کا دور دورہ ہے کہ صرف ہم زندہ رہیں گے۔ دوسروں کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ چنانچہ جو ہولناک جنگ اس وقت جاری ہے وہ اس کا بیّن ثبوت ہے۔ آج ہی کی تمدن سوز تہذیب کے متعلق ہندوستان کے مایۂ ناز شاعر اقبال مرحوم نے کہا تھا۔

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

جن ممالک میں قدرتی ذرائع بافراط موجود تھے اور جن کے باشندوں نے ان سے استفادہ کی صلاحیت حاصل کرلی وہ قدرتاً اُن ممالک پر سبقت لے گئے جہاں ایسے قدرتی ذرائع نہ تھے یا اگر تھے تو ان سے استفادہ کی کافی صلاحیت وہاں کے باشندوں میں پیدا نہیں ہوئی تھی بدقسمتی سے حیدرآباد کو ان دونوں کوتاہیوں کا سامنا ہے۔ صنعت و حرفت کے کارخانوں کے قیام کے لئے سستی قوت برقی جس پیمانہ کا بڑا

دارومدار ہے یہاں مفقود ہے کیونکہ میسور کے مماثل یہاں کوئی قدرتی آب شار نہیں ہیں جس سے برقابی قوت حاصل کیجا سکے۔ نظام ساگر کی تعمیر کے بعد تھوڑی مقدار میں برقابی قوت کی تولید کے امکانات پیدا ہو گئے ہیں اور حکومت نے ماہرین کی ایک کمیٹی اس بارے میں تجاویز مرتب کرنے کے متعلق مقرر کر دی ہے۔ دوسرے آبپاشی کے کارہائے سرمایہ بھی مثلاً تنگبھدرا پراجکٹ وغیرہ جیسے جیسے تعمیر پائیں گے برقابی قوت کو ان سے حاصل کرنیکے مواقع دستیاب ہو سکیں گے۔ دوسری کمی ہمارے پاس اس چیز کی ہے کہ ہماری اپنی کوئی بندرگاہ نہیں ہے جہاں سے مال کی درآمد برآمد میں سہولت ہو سکے۔ ریلوے کی حد تک بھی ہمارا جغرافیائی محل کچھ ایسا واقع ہوا ہے کہ چاروں طرف سے ہم دوسرے علاقہ کی ریلوں سے گھیرے ہوئے ہیں اور ان ریلوں سے نرخوں کے متعلق معاہدہ کئے بغیر جدید ریلوے لائن قائم نہیں کر سکتے مثال کے طور پر اگر ہم کوئی لائن ایسی قائم کریں جس سے بمبئی یا مدراس کے بندرگاہوں سے مسافت کم ہوتی ہو تو معاہدہ کے وقت ہمارا حصہ ریلوے پر جو کرایہ مال اور مسافروں کو لے جانے کے لئے مقرر ہوگا وہ ایسا ہوگا کہ ہم ان ریلوں سے مناقبت نہ کر سکیں جو ہماری سرحد سے بندرگاہوں تک جاتی ہیں۔ ایک طریقہ بیرونی ریلوں کا یہ ہے کہ اگر مال ہماری ریلوں کے زیادہ حصہ پر سے گزرتا ہو تو وہ اپنے کمتر حصۂ ریلوے کا کرایہ اسقدر زیادہ مقرر کر دیتے ہیں کہ مال بھیجنے والے کے لئے یہ زیادہ کفایت آمیز ہوتا ہے کہ وہ ہمارے قریب تر راستہ سے مال روانہ کرنے کے بجائے بیرونی ریلوں کے بعید تر راستہ سے جن کا مجموعی کرایہ کمتر ہے روانہ کریں ظاہر ہے کہ کوئی ملک اپنا سرمایہ ایسی ریلوں کی تعمیر پر صرف نہ کریگا جن سے خسارہ ہونے کا اندیشہ ہو۔ بریں ہم کم سے کم منافعہ پر بھی حکومت سرکار عالی نے بعض ریلوے لائن قائم کر دی ہیں۔ جو اصحاب اس کی تبلیغ کرتے ہیں کہ ملک میں ریلوں کا جال بچھا دیا جائے وہ اس نقطۂ نظر کو پیش نظر نہیں رکھتے۔

معدنی ذخائر کے معاملہ میں بھی حیدرآباد میں سوائے کوئلہ اور سونے کی کانوں کے کوئی بڑی کانیں موجود نہیں ہیں۔ رائچور میں سونے کی قدیم کانوں کو کھولنے کا کام سرکار عالی نے شروع کر دیا ہے جس کے لئے اسوقت تک ۵۵ لاکھ کی رقم منظور کی جا چکی ہے اور توقع ہے کہ تجارتی اصول پر سونے کی برآمدگی ممکن ہوسکے گی۔
حکومت سرکار عالی نے بڑے ماہرین سے کریم نگر اور دوسرے مقامات پر جہاں لوہے کے موجود ہونے کا امکان معلوم ہوا تفتیش کرائی مگر یہ سب اس نتیجہ پر پہنچے کہ نہ صرف لوہا گھٹیا قسم کا ہے بلکہ اس کی مقدار اتنی نہیں ہے کہ تجارتی اصول پر اس سے کوئی فائدہ اٹھایا جاسکے۔ ہیرے کے کان کی دریافت میں بھی سرکار عالی نے بہت تجسس کیا مگر کوئی قدرتی کان دریافت نہ ہوسکی۔ بریں ہم رائچور میں ہاسپیٹ کے مقام پر کچھ ہیرے سطح زمین پر پائے گئے اور امتحاناً ایک کمپنی کو وہاں پراسپکٹنگ کا لائسنس دینے کی کارروائی جاری ہے۔ اس کے برخلاف ہمسایہ ریاست میسور کو لیجئے وہاں ایک زبردست قدرتی آبشار سے قوت برقی کی وافر تولید ہو رہی ہے اور بہت سستے نرخ پر وہاں کے کارخانے برقی قوت حاصل کر رہے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہاں کے مصنوعات پر لاگت نسبتاً کم آتی ہے۔ علاوہ سونے کی زرخیز کان کے وہاں لوہے کی کان بھی موجود ہے اور ریاست میسور کی ترقی کا بڑا راز یہی ہے کہ وہاں سونا اور لوہا جیسے قیمتی دھاتوں کے ساتھ برقآبی قوت بھی دستیاب ہے۔
یہ صحیح ہے کہ مملکت حیدرآباد میں ہر قسم کی معدنی اشیاء اور دیگر اشیاء خام پائی جاتی ہیں اور سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیوں نہیں ان سے استفادہ کیا جاتا محض خام اشیاء کی موجودگی کسی کارخانۂ صنعت کے قیام کے لئے کافی نہیں ہے اولاً خام اشیاء کا اتنی مقدار میں ہونا ضروری ہے کہ ایک کارخانہ کے تجارتی اصول پر چلانے کے لئے جس اقل مقدار کی ضرورت ہے وہ موجود ہو۔ دوم یہ کہ تیار شدہ اشیاء کی لاگت اس

قیمت سے نہ بڑھے جس قیمت پر بیرون ملک کی تیار کردہ اشیاء یہاں آکر فروخت ہوتی ہوں۔ اگران دو شرطوں میں سے کوئی ایک شرط بھی پوری نہ ہو تو سمجھنا چاہئے کہ ایسی صنعت نفع آور طریقہ پر ملک میں قائم نہیں ہوسکتی۔ کسی خام پیداوار کا بڑھانا جو معدنی ہے انسان کی قدرت سے باہر ہے۔ البتہ ایسی خام پیداوار جو انسانی محنت سے پیدا ہوسکتی ہے وہ بڑھائی جاسکتی ہے۔ چنانچہ حکومت سرکار عالی نے حال ہی میں سررشتۂ زراعت کی تقسیم شعبۂ تحقیق اور شعبۂ اشاعت میں کردی ہے تاکہ ہمارے ہاں کی زرعی پیداواروں کی اقسام کو ترقی دینے اور مختلف قسم کی کھاد کے طریقوں اور اچھے بیج کے فراہم کرنے سے متعلق تجربات کئے جائیں اور ان کی تشہیر گاؤں گاؤں کیجائے۔

معدنی ذخائر کی دریافت اور ان کے استعمال سے متعلق بھی ایک خاص پروگرام مرتب کیا گیا ہے اور ڈاکٹر ہیرن وظیفہ یاب ڈائرکٹر جنرل سروے آف انڈیا کے خدمات دو سال کے لئے حاصل کئے گئے ہیں۔ تاکہ پیمائش طبقات الارض کے کام کی تکمیل جلد سے جلد ہوجائے۔ جہاں تک معدنی ذخائر کی دریافت اور تحسس اور صنعتوں کو فروغ دینے کے لئے سستی قوت برقی کی سربراہی کی ذمہ داری حکومت پر عائد ہے اس کی تکمیل مختلف صورتوں میں ہورہی ہے۔ مگر محض حکومت کی کوشش کافی نہیں ہیں تاوقتیکہ مختلف طبقات ملک بھی اپنے اپنے دائرۂ عمل کو حالات وقت کے مطابق نہ کرلیں۔ سرمایہ دار طبقہ کا یہ فرض ہونا چاہئے کہ وہ ملک میں صنعتی کارخانے محدود ذمہ واری کی کمپنیوں کی شکل میں فوراً قائم کریں۔ حالیہ تلخ تجربہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں کے سرمایہ دار ایک جمود کے عالم میں ہیں۔ نظام شوگر فیکٹری اور کارخانہ کاغذ سازی میں اس طبقہ نے کوئی قابل لحاظ حصہ نہیں لیا اور اگر حکومت کی جانب سے ان کمپنیوں کے حصص نہ خریدے جاتے تو یہ کارخانے عالم وجود میں نہ آتے معاشی کمیٹی

کے پروگرام میں اگر ملکی سرمایہ داروں کے ذریعہ چھوٹے بڑے کارخانوں کے قیام کی جدوجہد بھی شامل کی جائے تو مناسب ہوگا۔

ایک اہم کمی ہمارے ملک میں کاریگروں یعنے میکیانکس اور آرٹیسنس کی ہے جن کے بغیر کوئی صنعتی کارخانہ قائم نہیں ہو سکتا۔ اس کمی کو محسوس کرکے حکومت نے ایک ماہر فن تعلیم صنعتی مسٹر ایبٹ کے خدمات حاصل کئے تھے اور ان کی سفارشات کے بموجب سررشتہ تعلیم صنعتی قائم کرکے ممالک محروسہ میں صنعتی تعلیم کے مدارس کھولے جارہے ہیں اور کارہائے جنگ کے ضمن میں بھی ٹریننگ سنٹرس قائم کرکے اُن میں تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے۔ مگر اسوقت تک اہل ملک کماحقہ ان شعبوں سے استفادہ نہیں کررہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل ملک کا رجحان ملازمت سرکاری کی طرف زیادہ ہے! ور یہ سمجھا جاتا ہے کہ سرکاری ملازمت ایک باوقعت پیشہ ہے اور ایک مقررہ ماہوار بلاکم وکاست ملجاتی ہے اس کے علاوہ وظائف حسن خدمت اور ان کے پسماندوں کو ان کے بعد وظائف رعایتی بھی ملتے ہیں جس کی وجہ سے وہ آئندہ کی فکر سے سبکدوش ہوجاتے ہیں یہ خیال ایک حد تک صحیح ہے مگر ساتھ ہی اس کا دوسرا رُخ بھی ذہن نشین رہنے کے لائق ہے وہ یہ ہے کہ سرکاری ملازمتیں محدود ہیں گزیٹیڈ وغیر گزیٹیڈ خدمات کی جملہ تعداد (۸۰,۰۰۰) کے قریب ہے اور ملک کی آبادی ڈیڑھ کروڑ سے زائد ہے۔ بالفاظ دیگر آبادی کی صرف (۰,۵) فیصد کی کھپت ملازمت سرکاری میں ہوسکتی ہے اگر ملک کے ہر نوجوان کا نصب العین ملازمت سرکاری ہو اور والدین بھی اس خیال سے اپنے بچوں کو تعلیم دلوائیں تو لازم ہے کہ ان کی بہت بڑی تعداد بالآخر ملازمت حاصل کرنے سے محروم رہیگی اور جو روپیہ ان کی تعلیم پر صرف کیا گیا نہ صرف وہ رائیگاں جائیگا بلکہ یہ سب نوجوان بے روزگاری کی مصیبت میں مبتلا ہوجائینگے۔ اس کا ایک علاج یہ ہوسکتا ہے کہ معاشی کمیٹی اس جزو کو بھی اپنے

لائحہ عمل میں شریک کرکے اہل ملک کو ترغیب دے کہ وہ اپنی اولاد کو پیشہ ورانہ تعلیم دلائیں جس کے لئے ملک میں وسیع میدان موجود ہے۔ ساتھ ہی میرا ذاتی خیال ہے کہ ملازمت سرکاری میں جو دلکشی ہے وہ دور کردی جانی چاہئے اور ان کے شرائط ملازمت بھی وہی ہونی چاہئیں جو کارخانوں کے ملازموں کے ہوتے ہیں جنگ کی وجہ سے بیرون ملک سے اشیاء کی درآمد رک گئی ہے اور یہی موقع ہے کہ حیدرآباد میں مختلف کارخانے فوراً قائم کئے جائیں۔ چنانچہ سرکار عالی نے بھی حیدرآباد ڈیولپمنٹ کارپوریشن کے نام سے ایک بہت بڑے ادارہ کے قیام کی منظوری دیدی ہے۔ جس کے زیر نگرانی مختلف کارخانے قائم کئے جائینگے۔ جن میں پچاس فیصدی سرمایہ حکومت کا ہوگا۔ اب یہ اہل ملک کا کام ہے کہ ان کمپنیوں کے قیام میں حصہ لیں جس سے نہ صرف ملک کی ضروریات زندگی ملک ہی میں مہیا ہو جائینگی۔ بلکہ اہل ملک کے لئے روزی کے ذرائع کھل جائینگے اور بے روزگاری کا مسئلہ بڑی حد تک حل ہو جائیگا۔ معاشی کمیٹی کا شعبۂ اشاعت اگر چاہے تو اس کو بھی اپنے ہاتھ میں لے سکتا ہے۔

اسوقت تک جو میں نے عرض کیا وہ مختصراً صنعت و حرفت سے متعلق تھا اب میں زراعت پیشہ طبقہ کی معاشی حالت سے متعلق کچھ عرض کرونگا۔ سب سے پہلے یہ امر ذہن نشین رکھنے کے قابل ہے کہ حیدرآباد ایک زرعی ملک ہے اور زراعت کو پس پشت ڈالکر محض صنعت و حرفت ہی پر ساری توجہ منعکس نہیں کیجا سکتی۔ سب سے بڑی مصیبت جس میں یہ طبقہ مبتلا ہے وہ قرضہ ہے جس کے بوجھ میں وہ دبے ہوئے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ رفتہ رفتہ کاشتکاروں کی زمینات قرضخواہوں کے ہاتھ میں چلے گئے ہیں اور ان کی حیثیت اب صرف ایک قولدار کی رہ گئی ہے۔ قولدار کو زمین میں دلچسپی اس لئے نہیں رہتی کہ اس کا قول دوامی نہیں ہے۔ اس طرح زمینات کی حالت دن بدن گرتی جارہی ہے اور نتیجتہً ملک کی زرعی پیداوار کی مجموعی مقدار

گھٹ رہی ہے۔

کاشت کاروں کو قرضہ سے نجات دلانے کی غرض سے حکومت سرکارعالی نے قانون مصالحت قرضہ کو نافذ کرکے مصالحتی مجالس قائم کردی ہیں اور ایسے مصالحت شدہ قرضوں کی سبیل کے لئے زمین گروی بنک کے قیام کے لئے بھی قانون منظور فرمایا ہے جس کے (۵۰) لاکھ کے ڈبنچر کی ذمہ داری حکومت نے اپنے سر لی ہے۔ اس کے علاوہ حکومت سرکارعالی نے قانون انتقال اراضی بھی نافذ کرکے کاشت کار طبقوں کا تعین کردیا ہے تاکہ کسی کاشت کار طبقہ کی اراضی غیر کاشت کار کے دوامی قبضہ میں نہ جاسکے TENANCY-ACT بھی مرتب کیا جارہا ہے تاکہ قولداروں اور شکمیداروں کے حقوق کی حفاظت ہوسکے۔ یہانتک تو حکومت نے کاشتکاروں کے مرض کی تشخیص اور اس کا قانونی بندوبست کردیا مگر اس کی کیا ذمہ داری ہے کہ آئندہ پھر یہ کاشت کار جدید قرضے کرکے اپنے لئے پھروہی مصیبت پیدا نہ کرینگے۔ اس کا حل حکومت کے اقتدار سے باہر ہے لیکن آپ اگر چاہیں تو اس حصہ میں کاشت کار طبقہ کی مدد کرسکتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ تبلیغ کے ذریعہ اس طبقہ میں کفایت شعاری کی عادت پیدا کرائیں۔ شادیوں اور دوسرے تقاریب پر جو فضول خرچی ہوتی ہے اس کو روکیں۔ انجمن ہائے امداد باہمی سے جو قرضہ کاشتکار حاصل کرتے ہیں ان کو تخم اور جانوران کی خریدی یا زمینات کی استواری وغیرہ پر صرف کرنے کی نگرانی کا انتظام کریں۔ ایک اور چیز جو آپ مقامی معاشی انجمنوں کے ذریعہ کرسکتے ہیں وہ یہ ہے کہ کاشت کار اپنے فرصت کے اوقات میں جبکہ فصل کی درو ختم ہوجائے اور دوسری فصل کی تیاری کا وقت آئے یہ لوگ گھریلو صنعتوں کا کام کریں۔ اہل دہ کو یہ بھی ترغیب دیجاسکتی ہے کہ اپنے مکانات کے صحن میں ایک یا دو میوہ دار درخت لگائیں جن کے لئے کسی خاص اہتمام کی ضرورت نہیں ہے

کھاد ان کے ہاں موجود رہتا ہے اور روزمرہ پانی کا جو استعمال وہ کرتے ہیں اسی سے دو ایک میوہ کے درخت پل سکتے ہیں۔ ترکاری کی ایک آدھ بیل وہ اپنے مکان یا صحن کی دیوار پر چڑھا سکتے ہیں۔ اگر ہر موضع میں ہر شخص اس پر عمل کرے تو نہ صرف اس کو کھانے کے لئے ترکاری اور معمولی میوہ مل سکیگا بلکہ گاؤں کی صحت اور خوشنمائی میں بھی اضافہ ہوگا۔ غرض کہ دیہاتی کاشتکاروں کی معاشی حالت کو سدھارنے کا دارومدار بہت کچھ خود اُن کی توجہ پر منحصر ہے اور یہ بہت آسانی سے ہو سکتا ہے بشرطیکہ وہ اپنی معاشرت کو درست کرلیں۔

اب میں ملازم پیشہ طبقہ کے حالات سے مختصراً بحث کرونگا۔ اس طبقہ کی حالت بظاہر اچھی معلوم ہوتی ہے مگر سطح کو اگر کھروچا جائے تو آپ دیکھیں گے کہ ان کی حالت کچھ زیادہ قابل رشک نہیں ہے۔ یہ سفید پوش مفلس ہیں۔ ان کی آمدنی معین مگر اخراجات غیر محدود ہیں ان میں کم از کم پچھتر فیصدی ایسے ہیں جو آمدنی سے بہت زیادہ ہر مہینے صرف کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کا طرز زندگی اپنی حیثیت سے بہت زیادہ بلند ہے اور جب سے سینماؤں اور چائے خانوں کی بہتات ہوگئی ہے ان کی کم از کم ایک ربع تنخواہ ان کے نذر ہوجاتی ہے۔ کثرت چاء خوری اور سینماؤں کی حاضری سے ان کی صحت علٰحدہ متاثر ہو رہی ہے۔ کوئی چھوٹی سی چھوٹی تقریب پر بھی یہ طبقہ بے حد وحساب روپیہ صرف کردیتا ہے۔ ان سب عادتوں کا نتیجہ یہ ہے کہ آئے دن قرضخواہوں کا تقاضا اور عدالتی ڈگریوں سے یہ پریشان رہتے ہیں اور تعجب نہیں کہ ان پریشانیوں کی وجہ سے ان کی کارکردگی بھی متاثر ہوتی ہو اس طبقہ کی اصلاح کے لئے میرے خیال میں دفتر واری معاشی کمیٹیاں قائم کرنے کی ضرورت ہے تاکہ غیر ضروری رسم و رسومات پر قرض لے کر روپیہ صرف کرنے سے اُن کو باز رکھا جائے اور ان کے لئے معاشی کلب گھر مہیا کئے جائیں جہاں کفایت آمیز طریقہ پر ان کی تفریح کا

سامان مثلاً ریڈیو اخبارات رسائل وغیرہ رکھے جائیں تاکہ سینماؤں اور چائے خانوں میں ان کو جا کر روپیہ اور صحت ضائع کرنے کی ضرورت نہ رہے۔

میں آخر میں ہمارے ہاں کے طبقۂ اناث کا ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکتا ہمارے ملک کا یہ طبقہ جو سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے بہت زیادہ فراموشی کی حالت میں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے ہاں اناث کی تعلیم کا بہترین انتظام ہے مگر اس سے صرف متوسط اور اعلیٰ طبقے کے لوگ استفادہ کر رہے ہیں اور یہ استفادہ بھی اس حد تک ہے کہ شادی سے پہلے لڑکیاں مدرسوں میں جا کر لکھنے پڑھنے اور سوزن کاری کی تکمیل کر لیتی ہیں۔ مگر بیاہ کے ساتھ ہی ان کی ایک نئی زندگی شروع ہو جاتی ہے۔ کوئی کام جسمانی محنت کا یہ نہیں کرتیں اور متعدد ملازمین کی ان کو ہر آن محتاجی رہتی ہے جیسے کہ کسی مریض کو نرس کی۔ گھر کا کاروبار سب ملازمین کے تفویض رہتا ہے اور ہر قسم کی فضول خرچی ہوا کرتی ہے۔ بچے آیاؤں کے تفویض ہو جاتے ہیں۔ ماں باپ کے ساتھ یہ اٹھتے بیٹھتے نہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ماں کی ذاتی توجہ و تربیت سے یہ محروم ہو کر بڑے ہوتے ہیں۔ رسم و رواج کو ہماری مستورات اس درجہ اہمیت دیتی ہیں کہ چاہے کل اثاث البیت فروخت ہو جائے یا قرضہ لیا جائے مگر مقررہ تقاریب نہ ٹلیں۔ ان کی اصلاح مردوں کے بس سے باہر ہے اس لئے ان ہی کے ہاتوں انکی اصلاح کا انتظام ہونا چاہئے اگر سر برآوردہ مستورات کی ایک معاشی کمیٹی قائم کر کے اس بارے میں اصلاح کی کوشش کی جائے تو مناسب ہوگا فقط

حیدر آباد میں دیہی تنظیم

از جناب مولوی رضی الدین صاحب شریک ناظم سررشتۂ امداد باہمی سرکار عالی

۱۔ ہندوستان ایک زرعی ملک ہے اور حیدر آباد اس کا ایک حصہ ہے۔
اس لحاظ سے اس ملک کی آبادی کا بڑا حصہ دیہاتیں رہتا اور کاشتکاروں پر مشتمل ہے
یہاں بھی ہندوستان کے اور حصوں کی طرح شہروں اور دیہات میں بڑا فرق ہے۔ ہم
شہر کے رہنے والے ہر قسم کی ترقیوں سے مستفید ہو رہے ہیں۔ ہم میں تعلیم زیادہ ہے
ہمارے گھر صاف ستھرے اور سڑکیں اور گلیاں پاک صاف ہیں ہم کپڑے اچھے پہنتے
ہیں۔ ہماری آمدنیاں نسبتاً زیادہ مستحکم ہیں۔
ورزش اور تفریح کے طرح طرح کے اسباب مہیا ہیں۔ طبی امداد ہمیں ہر وقت حاصل
ہے اس کے برعکس ان شہروں سے دور مواضعات میں رہنے والوں کی حالت کیا ہے!
ان پر جہالت چھائی ہوئی ہے۔ مقروضیت کے بار سے دبے ہوئے ہیں۔ ان کے مکانات
اور بستیاں غلیظ، ان کے کپڑے میلے کچیلے، غذائیں نہایت خراب طرح طرح کے نشہ کے
وہ عادی۔ اگر ملک کی آبادی کا اتنا بڑا حصہ ایسی خراب حالت میں ہو تو پھر شہروں کی
رونق بھی نمائشی چیز ہوگی۔ اس لئے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ ہم حقیقت میں اسی وقت
اپنے ملک کو ترقی یافتہ ملک سمجھ سکتے ہیں جب ہم ان دیہات کے رہنے والوں کی

زندگی کا معیار بلند کرسکیں۔ ان کے افلاس کا حل معلوم کریں انکی زندگی کو زیادہ خوشگوار اور زیادہ صحت بخش بنائیں۔ چونکہ ان تمام خرابیوں کا ایک بنیادی سبب افلاس ہے، بہتر ہوگا کہ پہلے کاشتکار کی زندگی کے معاشی پہلو ہی پر روشنی ڈالی جائے۔

۲۔ گو حیدرآباد کا کاشتکار اپنے اطراف کے بیرونی ممالک کے کاشتکاروں سے کسی قدر زمین زیادہ ہی رکھتا ہے لیکن معاشی حالت اس کے پڑوسی سے بہتر نہیں۔ وجہ کیا ہے؟ ہمارے کاشتکار زمین رکھتے ہیں اور محنت میں بھی کسی سے پیچھے نہیں لیکن بڑا سوال سرمایہ کی فراہمی کا ہوتا ہے۔ بغیر سرمایہ فراہم کئے نہ تو کاشتکار ہل جوت سکتا ہے اور نہ تخم بو سکتا ہے۔ سرمایہ کی فراہمی بھی کسی نہ کسی طرح ہو جاتی ہے لیکن ایسے کٹھن شرائط پر کہ اس کو اپنی محنت کے معاوضہ میں غیر واجبی طور پر محروم ہو جانا پڑتا ہے۔ ایک تو وجہ یہ ہوئی۔ دوسرے کاشت کے ناقص طریقے، خراب تخم کا استعمال کھاد کا صحیح طریقہ پر تیار نہ کرنا، اپنی زمین پر ایک ہی جنس کا سالہا سال تک کاشت کرنا اور جب فصل تیار ہو جائے تو اس کو بازار کا اتار چڑھاؤ دیکھے بغیر من مانے داموں پر مقامی ساہوکاروں اور اڑتیوں کے ہاتھ فروخت کر دینا۔ ان چیزوں نے مدت سے ہمارے کاشتکار کے بجٹ کو اتنا متاثر کیا ہے کہ مشکل ہی سے کوئی خاندان ایسا ملیگا جو ساہوکاروں کے پنجوں میں نہ پھنسا ہوا ہو۔

۳۔ حکومت سرکار عالی نے مختلف تعمیری سررشتہ جات کے ذریعہ ان خرابیوں کو دور کرنے کی کوشش کی۔ مثلاً سررشتہ جات زراعت، علاج حیوانات، تعلیمات، صحت عامہ وغیرہ عرصہ دراز سے دیہات سدھار کی تدابیر اختیار کر رہے ہیں لیکن ان تمام سررشتہ جات کی کوشش حال حال تک ایک دوسرے سے الگ تھی اور ہر سررشتہ کی کوشش محدود تھی۔ کاشتکار کی زندگی کے اس

مخصوص پہلو تک جو اس سے متعلق تھا مثلاً لاکھوں روپیہ سالانہ سررشتہ مال سے تقاوی تقسیم کیجاتی تھی۔ باوجود اس کے کاشتکاروں کی معروفیت میں قابل لحاظ کمی نہیں ہوئی۔ سررشتۂ زراعت کی جانب سے ہزارہا آزمائشی مزرعہ جات قائم ہوئے لیکن ان مواضعات کے بجز چند کاشتکاروں کے دوسرے کاشتکاروں نے بہتر طریقہ زراعت کو اختیار نہیں کیا۔ اسی طرح علاج حیوانات کے ڈاکٹر مواضعات میں دورہ کرکے مختلف قسم کی بیماریوں اور ان سے بچنے کی تدابیر کا پروپگنڈا کرتے رہتے ہیں لیکن جیسی چاہیے کامیابی مشکل تھی۔ کسی چیز کا پروپگنڈا اسی وقت خاطرخواہ کامیاب ہوسکتا ہے جب وہ مسلسل اور بڑے پیمانہ پر کیا جائے ان سررشتہ جات کی کوششوں میں ایک طرح سے عوام سے براہ راست تعلق پیدا کرنے کی کمی تھی اس کو دور کرنے کے لئے پہلا قدم سررشتۂ امداد باہمی کا قیام تھا۔ جس کے ذریعہ کاشتکار کو یہ بتلانے کی کوشش کی گئی کہ اس کو اپنے مسائل پر انفرادی طور پر غور کرنا نہیں ہے بلکہ دیہی طبقہ کے ایک رکن کی حیثیت سے مشترکہ مفاد کو پیش نظر رکھکر کام کرنا ہے۔ چونکہ قرضہ کا سوال سب سے اہم تھا فطرتاً پہلے بڑی تعداد میں اتحادی اصول پر قرضہ کی انجمنیں دیہات میں قائم کیگئیں جہاں کفایت شعاری اور اپنی آپ مدد اور ایک دوسرے کی مدد کے زرین اصولوں پر ہر رکن کو کاربند کرنے کی سعی کیگئی۔ یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ ہر انجمن کامیاب رہی لیکن کامیاب انجمنوں کی اتنی کافی تعداد ہے کہ اس سے یہ نتیجہ ضرور اخذ کیا جاسکتا ہے کہ جب ان انجمنوں کے اراکین نے کامیابی حاصل کی ہے تو دوسری انجمنوں میں بھی ایسے نتائج کا حاصل کرنا ناممکن نہیں۔ اسوقت تقریباً (۳۵۰۰) زرعی انجمنوں میں کوئی (۴۳۰) زرعی انجمنیں ایسی ہیں جو بالکل اپنے ذاتی سرمایہ سے کام کرنے لگی ہیں جن کا سرمایہ زیر استعمال (۱۵) لاکھ سے زیادہ ہے۔ علاوہ ازیں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان انجمنوں کے گیارہ ہزار سے زیادہ اراکین نے

بیرونی مقروضیت اور ساہوکار سے بالکلیہ نجات حاصل کرلی ہے۔ جب امداد باہمی کے اصول پر کاربند ہونے سے قرضہ اور فراہمیٔ سرمایہ کی حد تک یہ کامیابی حاصل ہوئی تو یہ ایک فطرتی بات تھی کہ انہی اصول کو دیہی زندگی کے دوسرے مسائل پر بھی منطبق کیا جاتا۔ اسی مقصد کے پیش نظر آج سے چار سال قبل ۱۳۴۷ف میں حکومت سرکار عالی نے دیہی تنظیم کی ایک اسکیم کو منظور فرمایا۔ جو اسی بنیاد پر پیش کیگئی تھی کہ حتی الامکان یہ کام ایسے ادارے کی نگرانی اور ہدایات کے بموجب کئے جائیں جو مختلف تعمیری سررشتہ جات میں ہم آہنگی و ربط پیدا کرسکے اسلئے یہ طے کیا گیا کہ انجمن ہائے امداد باہمی کے ذریعہ دیہی مسائل کو حل کرنے اور مشکلات کو دور کرنے کی کوشش کیجائے اور ان انجمنوں پر مجالس تعلقہ و اضلاع اور پھر مرکزی مجلس حیدرآباد کی نگرانی رہے۔

۴۔ ایک مرکزی مجلس تنظیم دیہی کا قیام زیر صدارت ہز اکسلنسی صدر اعظم بہادر باب حکومت عمل میں آیا جس کے تمام معزز ارکان باب حکومت کے علاوہ صدر ناظم و معتمد صاحب مال صوبہ دار صاحبان اور تمام تعمیری سررشتہ جات کے نظماء صاحبین ارکان ہیں۔ ہر ضلع میں زیر صدارت اول تعلقدار صاحب ایک بورڈ قائم ہے جسکے ارکان مقامی عہدہ دار صاحبان سررشتہ جات تعمیری کے علاوہ کچھ مقامی غیر سرکاری اصحاب بھی ہیں جن کو دیہات سدھار سے دلچسپی ہے۔ اسی طرح ہر تعلقہ میں ایک کمیٹی ہے جس کے صدر تحصیلدار ہیں اور مقامی عہدہ داران سررشتہ جات تعمیری اور کچھ غیر سرکاری مقامی حضرات رکن ہیں۔ اب تک ۱۶ اضلاع میں بورڈ اور ۹۰ تعلقات میں کمیٹیاں قائم ہوچکی ہیں اور ہر تعلقہ میں ایک موضع کا انتخاب کیا گیا ہے تاکہ اس موضع میں پوری توجہ سے کام کرکے اس کو نمونہ کا موضع بنایا جاسکے۔ ہر ایسے منتخب موضع میں انجمن تنظیم دیہی کا قیام اتحادی اصول

پر عمل میں آچکا ہے ۔

۵ ۔ چونکہ ایک ضلع کے حالات دوسرے ضلع سے مختلف ہوتے ہیں بلکہ یہ کہنا بھی بیجا نہ ہوگا کہ ہر تعلقہ اور ہر موضع کے حالات دوسرے موضع سے جدا ہوتے ہیں اس لئے یہ مناسب سمجھا گیا کہ ہر موضع میں اس کی اپنی مخصوص ضروریات و مسائل کے لحاظ سے دیہی تنظیم کا پروگرام مرتب ہونا چاہئے۔ مگر تجربہ یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ اگر کوئی پالیسی بنیادی مسائل کی حد تک ہی کیوں نہ ہو معین نہ کی جائے تو کام میں تسلسل اور استقلال باقی نہیں رہتا۔ مثلاً ممکن ہے کہ کسی ایک سال انجمن تنظیم دیہی کے اراکین آبنوشی کے کنوئیں کھودنے پر اپنا روپیہ پیسہ اور محنت صرف کریں تو دوسرے سال مکانات کی صفائی اور روشندان بنانے پر یا تیسرے سال اسپورٹس پر۔ اسی لئے یہ ضروری خیال کیا گیا کہ کم از کم ایسے بنیادی مسائل کی حد تک جو عام طور پر پائے جاتے ہیں کسی پالیسی کا معین ہونا ضروری ہے ۔ مرکزی مجلس تنظیم دیہی نے اس بات پر زور دیا ہے کہ معاشی ترقی کو دیگر مساعی اور سرگرمیوں پر ترجیح دینی چاہئے اور اس کے لئے مجالس اضلاع و تعلقات زرعی ترقی کو سب سے مقدم تصور کریں یہ بات بہت واضح کر دیگئی کہ ہر موضع کے مقامی حالات کا مطالعہ کرنے کے بعد ایسا لائحہ عمل تیار کرنا چاہئے جس سے دیرپا نتائج حاصل ہوسکیں۔ اس کام سے احتراز کیا جائے جس سے صرف عارضی اور دکھاوے کی چیزیں حاصل ہوں یہ بہت ہی اہم ہے کہ ہر دیہات کے رہنے والے پر ترقی یافتہ طریقہ کاشت کی اہمیت واضح کیجائے ۔ عمدہ مویشی رکھنے کے فوائد بتائے جائیں ۔ اتحادی اصول پر نکاسی پیداوار کی ترغیب دیجائے اور سب سے بڑھ کر کفایت شعاری اور اپنی آپ مدد کرنے کے زرین اصولوں پر کاربند کیا جائے ۔

۶ ۔ ابتک (۱۲۰) انجمنہائے تنظیم دیہی قائم ہوچکی ہیں جن کے اراکین کی تعداد (۱۲۶۲۶) ہے۔ انھوں نے [illegible] میں (۱۱۹۴۰) روپیہ چندہ جمع کیا تھا۔ جس میں سے

(۱۰۵۶۰) روپے مختلف دیہی اغراض پر صرف کیا۔

۷۔ (۱۲۰) انجمنہائے تنظیم دیہی میں سے (۹۲) مواضعات میں قرضہ کی انجمنیں قائم ہیں۔ اور اس بات کی کوشش کیجا رہی ہے کہ بقیہ مواضعات میں بھی قرضہ کی انجمنوں کا قیام عمل میں آجائے تاکہ ان مواضعات کے رہنے والوں کو کم شرح سود پر قرضہ اتحادی اصول پر مل سکے۔ ان قرضہ کی انجمنوں کا سرمایہ زیر استعمال تقریباً تین لاکھ روپے ہے۔ جس میں سے ان کا ذاتی سرمایہ ایک لاکھ ۳۵ ہزار روپے ہے۔ اور یہ انجمنیں اب زیادہ سے زیادہ ساڑھے چھ فیصد شرح سود سے قرضہ حاصل کر رہی ہیں۔

۸۔ ترقی یافتہ تخم علاوہ تخم پنبہ جس کی سفارش سررشتہ زراعت نے کی تھی کوئی (۱۴۰۰) من ان (۱۲۰) منتخب اضلاع میں ۴۹ف میں تقسیم کیا گیا۔ کپاس کے اچھے بیجوں میں گورانی نمبر (۶) کو ضلع ناندیڑ میں کافی اہمیت حاصل ہے۔ انجمن نکاسی پیداوار ناندیڑ کے ذریعہ اس تخم کی اشاعت اتحادی اصول پر ہو رہی ہے۔ اس تخم سے کاشتکار کو جو فائدہ ہو رہا ہے وہ صرف اس بات کے ظاہر کرنے سے معلوم ہوگا کہ مقامی کپاس کی قیمت سے تقریباً (۲۰) روپے فی کھنڈی زیادہ قیمت گورانی (۶) کو ۱۳۴۹ف و ۱۳۵۰ف میں ملی۔

سررشتہ انجمن ہائے امداد باہمی اور سررشتہ زراعت باہم کوشاں ہیں کہ کاشتکاروں کو کھاد کے استعمال کی ترغیب دیں اور کھاد کے گڑھے کھدوا کر گاؤں کے تمام کچرے وغیرہ سے صحیح اصول پر کھاد تیار کرائیں۔ اب تک (۳۰۰۰) کھاد کے گڑھے ان منتخب مواضعات میں کھدوائے جا چکے ہیں ان کے علاوہ تقریباً ہر سال پانچ سو تھیلے مصنوعی کھاد کے بھی تقسیم کئے جاتے ہیں۔ اس قسم کا کھاد زیادہ تر ضلع نظام آباد کے منتخب مواضعات میں فروخت ہوتا ہے۔ جہاں نیشکر کی کاشت ہوتی ہے۔ گذشتہ دو سال میں آہنی آلات زرعی تقریباً چھ ہزار روپے کے انجمنہائے تنظیم دیہی نے خریدے جو ایسے اراکین کو جو خود ایسے آلات نہیں خرید سکتے نہایت معمولی شرح پر کرایہ پر دئے جاتے ہیں۔

۹۔ بہتر نسل کے مویشی حاصل کرنے کے لئے (۳۲) سانڈ سررشتہ علاج حیوانات نے انجمن ہائے تنظیم دیہی کو مفت دیے۔ ہر سال بڑی تعداد میں خراب بیلوں کو آختہ کروایا جارہا ہے اور مختلف امراض سے بچنے کے لئے انجمنوں کی کوشش سے بڑی تعداد میں جانوروں کو مانع امراض ٹیکے دلوائے جارہے ہیں۔

۱۰۔ کاشتکار کو اپنی پیداوار کی پوری پوری قیمت حاصل کرنے کے لئے اس بات کی کوشش کیجارہی ہے کہ انجمنہائے نکاسی پیداوار کے ذریعہ اتحادی اصول پر خرید و فروخت کا انتظام کیا جائے۔ خرید و فروخت میں جو مختلف قسم کی بدعنوانیاں ہوتی تھیں وہ بڑی حد تک قانون مارکٹ کے نفاذ سے دور ہوچکی ہیں۔ اگر کاشتکار اپنی پیداوار انجمنہائے نکاسی پیداوار کے ذریعہ فروخت کریں تو توقع کیجاسکتی ہے کہ ان کو اپنے مال کی پوری قیمت حاصل کرنے میں دشواری نہ ہوگی۔ حکومت سرکار عالی نے ایسی انجمنوں کی امداد اور فروغ کی خاطر وعدہ فرمایا ہے کہ ابتدائی تین سال تک (۳۰) روپے ماہانہ محاسب کی تنخواہ خود ادا کریگی اور ہر ایسی نکاسی پیداوار کی انجمن کو (۵۰۰۰) تعمیر گودام کے لئے قرضہ دیا جائیگا۔ جس میں سے (۱۲۰۰) روپیہ بطور عطیہ متصور ہونگے۔ اسوقت تک (۱۹) انجمنہائے نکاسی پیداوار قائم ہوچکی ہیں جن کا سرمایہ زیر استعمال تقریباً سوا لاکھ روپے ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور اسکیم دیہی بنکوں کے قیام کی ہے جس پر تجربہ کیا جارہا ہے کہ اراکین دیہی بنک کو سیل سوسائٹی سے ملحق کردیا جائے۔ تاکہ دیہی بنک سے اپنی فصلی ضروریات کے لئے قرضہ حاصل کرنے کے بعد وہ لازماً اپنا مال متعلقہ سیل سوسائٹی کے توسط سے فروخت کریں۔

۱۱۔ کاشتکار کی آمدنی میں مختلف چھوٹی چھوٹی ضمنی صنعتوں سے اضافہ کرنے کی کوشش بھی بارآور ہورہی ہیں۔ ایک بات یہاں قابل ذکر ہے کہ صرف انہی صنعتوں کی ترغیب دیجانی مناسب ہے جو زراعت سے قریبی تعلق رکھتی ہیں ہر سال

ان منتخب مواضعات میں کاشتکار تقریباً تین ہزار روپیہ کا گھی فروخت کر رہے ہیں۔ اسی طرح مرغبانی سے کوئی سالانہ آٹھ ہزار روپیہ کی آمدنی ہوتی ہے۔ پھلوں کے درخت بھی زیادہ تعداد میں لگانے کی ترغیب دیجا رہی ہے تاکہ اس سے بھی کچھ نہ کچھ آمدنی ہو یا کم از کم ان کے بال بچوں کے کھانے کے لئے کچھ پھل مل سکیں۔

۱۲۔ بہتر زراعت اور بہتر معاملت کے ساتھ ساتھ بہتر معاشرت کی سرگرمیاں بھی کسی طرح کم نہیں ہیں۔ آبنوشی کے انتظام کو بہتر کرنے کے لئے تقریباً تیس ہزار روپیہ گزشتہ دو سال میں صرف کئے گئے۔ کچھ نئے کنوئیں کھدوائے گئے یا پھر پرانی سیڑھیوں والی باولیوں پر چرخ لگا کر سیڑھیاں بند کی گئیں تاکہ پانی صاف رہے۔ سڑکیں درست کیجا رہی ہیں جس پر نہ صرف لوکل فنڈ سے روپیہ صرف ہو رہا ہے بلکہ خود انجمنوں کے اراکین بھی حصہ لے رہے ہیں۔ خواہ وہ چندہ کی شکل میں ہو یا محنت مزدوری کی شکل میں۔ بچوں کو مانع چیچک ٹیکہ لگانے میں بڑی کامیابی حاصل ہو رہی ہے۔ مکانات کو زیادہ ہوادار بنانے کی کوشش بھی جاری ہے۔

۱۳۔ ان منتخب مواضعات میں تعلیم کی طرف بھی کافی توجہ بڑھ گئی ہے۔ ہر سال ان مواضعات کے مدارس میں طلباء کا اضافہ ہو رہا ہے۔ بچوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ تعلیم بالغاں کی طرف بھی انجمنیں متوجہ ہیں۔ اور اپنے مقدور بھر خرچ کر رہی ہیں۔ تعلیم بالغاں میں اس بات کا کافی لحاظ رکھا جاتا ہے کہ پڑھنے لکھنے سے زیادہ اہم ایسی باتوں کا بتلانا ہے جس سے ان دیہات کے رہنے والوں کو اپنی روزمرہ کی زندگی میں مدد ملے۔ مثلاً بہتر طریقۂ زراعت کا بتلانا یا اتحادی اصول پر نکاسی پیداوار کے فوائد۔ یا یہ مالگزاری کی ادائی کے بعد یا انجمن کے مطالبات کی ادائی کے بعد کس طرح اپنی پاسبک میں تمام رقوم کا اندراج کرا لینا چاہئے۔ کفایت شعاری اور اتحادی اصول سے کیا فوائد حاصل ہوئے ہیں۔ صفائی اور صحت کے عام اصول وغیرہ۔ انجمنیں تنظیم دیہی

تعلیم بالغان کیلئے اپنے فنڈ سے اساتذہ کو الونس دیتی ہیں۔ اور روشنی وغیرہ کے معمولی اخراجات بھی برداشت کرتی ہیں۔

۱۴۔ تقریباً ہر تعلقہ میں سال میں دو تین مقامات پر اتحادی میلے منائے جاتے ہیں۔ جہاں نمایش اطفال و اسپورٹس اور نمایش مویشی و آلات زرعی وغیرہ میں کافی انعامات دیئے جاتے ہیں تاکہ تحریک تنظیم دیہی زیادہ سے زیادہ مقبول ہو۔ صدر جمعیتہ اتحاد امداد باہمی کی جانب سے ناشرین اضلاع میں متعین ہیں جو انجمنہائے تنظیم دیہی کے کاروبار پر نگرانی کرتے ہیں۔ اور تحریک کی اشاعت و تعلیم کا انتظام کرتے ہیں۔ ادارۂ مذکور کی جانب سے ایک رسالہ گاؤں سدھار تمام ملکی زبانوں میں جاری ہے۔ جو اتحادی انجمنوں کو ہزاروں کی تعداد میں مفت تقسیم کیا جاتا ہے۔ اس کی اشاعت میں مرکز تنظیم دیہی پٹنچرو کے انتظامات کے لئے حکومت سرکار عالی نے سالانہ پندرہ ہزار روپیہ کا عطیہ عنایت کیا ہے۔ اور صدر جمعیتہ خود اپنے فنڈ سے (۳۰۰۰) روپیہ سے زیادہ رقم انھیں اغراض کے لئے دیتی ہے۔ طبی امداد کی غرض سے انجمنہائے تنظیم دیہی اپنے سرمایہ سے سالانہ کوئی ہزار ڈیڑھ ہزار روپیہ مختلف ادویہ پر صرف کر رہی ہیں۔ حال میں آپ نے اخبارات میں ملاحظہ کیا ہوگا کہ مرکزی مجلس تنظیم دیہی کی درخواست پر ہر ہائینس شہزادی صاحبہ برار نے دیہات کی دایاؤں کی ٹریننگ کے لئے چندہ کی اپیل فرمائی تھی۔ توقع ہے کہ شہزادی صاحبہ کی اس دلچسپی اور ہمدردی سے دیہات کی دایائیں سرکاری دواخانوں اور زچگی خانوں میں ٹریننگ پا سکیں گی۔

۱۵۔ جیسا کہ اس سے قبل بھی میں نے ذکر کیا ہے کہ تحریک تنظیم دیہی کے بنیادی اصول کفایت شعاری اور اپنی آپ مدد کرنا ہیں۔ اس مقصد کے پیش نظر ہر انجمن تنظیم دیہی کے ساتھ غلہ گودام کا قیام عمل میں آرہا ہے تاکہ غریب کاشتکار اپنی قلیل آمدنیوں سے کچھ نہ کچھ آئندہ کے لئے بچا سکیں۔ کاشتکار کے لئے بجائے نقد کے ہر سال تھوڑا بہت

غلہ محفوظ کرنا آسان ہے اسوقت تک ان (۱۲۰) مواضعات میں تقریباً (۱۰۰) غلہ گودام قائم ہو چکے ہیں۔ جن میں (۵۰۰۰) اراکین نے (۶۶۲۳۰) من غلہ گزشتہ تین سال میں جمع کیا ہے۔ اگر چار روپیہ فی من کے حساب سے اس غلہ کو نقد میں تبدیل کیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان غریبوں نے کوئی (۲۶۵۰۰) روپیہ گزشتہ تین سال میں جمع کئے جس کا فی کس اوسط (۵) روپیہ ہوتا ہے۔ ان غلہ گوداموں کے ذریعہ عمدہ تخم کی تقسیم بھی ہو رہی ہے اور جو غلہ تخم کے لئے لیا جاتا ہے اس پر کوئی منافع نہیں لیا جاتا۔ توقع ہے کہ اس قسم کے گودام دیہی معاشیات میں کافی اہمیت اور کامیابی حاصل کرینگے۔ جیسے ہی ان منتخب مواضعات میں کاروبار تنظیم دیہی صحیح اصول پر کامیابی کے ساتھ چلنے لگیں۔ اس تحریک کو وسعت دی جائیگی! ور دوسرے مواضعات میں کاروبار پھیلائے جا سکینگے۔

غرض یہ کوشش اسی بلند مقصد کو حاصل کرنے کے لئے جاری ہے کہ ہمارے دیہات کے رہنے والے بہتر زندگی بسر کر سکیں۔ انکی آمدنی میں اضافہ ہو۔ ان کا معیار زندگی بلند ہو اور ان میں وہ صحیح شعور پیدا ہو جس سے سارے ملک کے امن وچین اور خوشحالی میں اضافہ ہو سکے فقط

تنظیم دیہی کے بعض معاشی پہلو

از جناب مولوی برہان الدین حسین صاحب بی۔ اے جی

سرکار عالی کی مسلمہ پالیسی کے تحت ممالک محروسہ کے تقریباً ہر تعلقہ کے دو ایک مواضعات میں تنظیم دیہی کا کام گزشتہ چند سال سے جاری ہے۔ یہ حقیقت اب واضح تر ہوتی جارہی ہے کہ مواضعات کی ہمہ جہتی معاشی ترقی کا پروگرام مرتب کرنے سے قبل ہمیں نہ صرف ملک کے مختلف اضلاع اور تعلقات بلکہ چند مواضعات کے مجموعہ کے لئے معاشی تحقیقات عمل میں لانی ضروری ہوگی۔ اس کے بغیر تو یہ ممکن ہے کہ ہم مجموعی طور پر ایک تعلقہ یا ایک موضع کی دولت میں اضافہ کرسکیں۔ مگر یہ قطعاً ناممکن ہے کہ ہر فرد رعایا کے لئے آسودہ حال معیار زندگی فراہم کیا جاسکے۔

گزشتہ ربع صدی سے ہندوستان کے تقریباً ہر صوبہ میں دیہات کی معاشی تحقیقات کا کام سرکاری اور غیر سرکاری طور پر انجام پاتا رہا ہے۔ ممالک محروسہ سرکار عالی میں بھی اضلاع کی معاشی تحقیقات کے لئے مسٹر اینگار کا تقرر بحیثیت اسپشل آفیسر عمل میں لایا گیا تھا۔ انھوں نے ۱۹۲۹ء تا ۱۹۳۰ء میں اضلاع نظام آباد محبوب نگر ورنگل۔ رائچور۔ ناندیڑ اور اورنگ آباد کے منتخب مواضعات کی معاشی پیمائش کا کام مکمل کیا اور اُن کے کام کے نتائج پانچ ضخیم جلدوں میں ....(اکنامک

انوسٹی گیشن ان حیدرآباد اسٹیٹ) کے نام سے منجانب سرکار عالی طبع اور
شائع ہوئے۔ اس سے قبل نواب معشوق یار جنگ بہادر نے ضلع رائچور کے موضع یوگو
کے معاشی تحقیق کے نتائج کو ایک کتابی صورت میں شائع فرمایا تھا۔ نیز جامعۂ عثمانیہ کے
بعض طلباء معاشیات نے اس موضوع پر تحقیقی مضامین مجلۂ عثمانیہ اور دیگر رسالوں میں شائع
کرائے ہیں۔ چندروز ہوئے مجھ میں سے نے بھی جناب مولوی ظہیر احمد صاحب ایم۔ سی۔ ایس
اول تعلقدار ضلع رائچور کی توجہ سے جو مواد موضع اخلاص پور کے متعلق جمع ہوا تھا اُسکی
ترتیب کا کام انجام دیا ہے۔

اس مضمون کا یہ منشاء نہیں ہے کہ مواضعات کی اصلاح اور تعمیر جدید کا ایک لائحہ عمل
آپ حضرات کے ملاحظے کے لئے پیش کیا جائے۔ اسکی ترتیب کے لئے وسیع معلومات اور
اعلیٰ درجہ کی قابلیت درکار ہے۔ اور میں ان دونوں سے محروم ہوں۔ البتہ ان دنوں جو
جو تحقیقی مقالے لکھے گئے ہیں اُنکے مطالعہ اور ایک حد تک ذاتی مشاہدہ و تجربہ سے
مین جن نتائج پر پہنچا ہوں اُس کے پیش نظر تنظیم دیہی کے بعض معاشی پہلو پر نظر
ڈالی جاتی ہے۔ ان پر غور کرنے سے یہ پتہ چل سکیگا کہ مواضعات کی مادی خوش حالی اور
معیار زندگی کی بلندی کے لئے کن کن دشواریوں سے مقابلہ کرنا ہے۔ اور ان پر قابو پانے
کے لئے حکومت اور رفاہ عام سے دلچسپی رکھنے والے اداروں کو کس طرح میدان عمل
میں آنا ہوگا۔

ہمارے دیہات کی جو ناگفتہ بہ حالت ہے اُسکی تفصیلات کے بغیر صرف یہ
کہنا کافی ہے کہ مواضعات کی چالیس فیصد سے زائد آبادی نیم برہنہ اور فقر و فاقہ
کی حالت میں بسر کرتی ہے۔ جب یہ حالت ہو تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے دیہات
اور دیہات میں رہنے والوں کی کس قسم کی معاشی خوشحالی ہمارے پیش نظر ہے
کیا یہ ممکن ہے کہ ہندوستان کے کاشتکاروں بلکہ مزدور پیشہ افراد کی مالی حالت بھی

اس درجہ ترقی کر جائے کہ وہ یورپ اور امریکہ کے معیار زندگی کو اختیار کر سکیں۔ کیا یہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر ہو سکتا ہے کہ امریکہ کی طرح ہندوستان کے کاشتکاروں کے پاس بھی سواری کے لئے موٹر کار اور رہنے کے لئے آراستہ مکان موجود ہوں۔ ہندوستان میں آبادی کی کثرت۔ سرمایہ کی کمی۔ لوگوں کی طبیعت میں قنوطیت اور تعلیم کا فقدان یہ وہ رکاوٹیں ہیں جو ہمیں مجبور کرتے ہیں کہ یورپ اور امریکہ کے معیار زندگی کو لازماً نظر انداز کر دیا جائے۔ اس لحاظ سے مواضعات کی اصلاح اور تعمیر جدید کے لئے ہمارا مطمح نظر صرف یہ ہونا چاہیئے کہ خس پوش جھونپڑیوں کی بجائے پختہ یا نیم پختہ مکانات تعمیر کر دئے جائیں۔ گنجان آبادی کو ہوادار بنایا جائے۔ آمد و رفت کے لئے راستے درست کر دئے جائیں۔ پینے کے لئے پاک و صاف پانی میسر آئے۔ طبی امداد کا انتظام ہو۔ بچوں کو تعلیم دلائی جائے اور تباہ حال اشخاص کے لئے بھی اقل معیار آسودگی پر زندگی بسر کرنے کے مواقع فراہم ہوں۔

واضح ہو کہ اس معمولی نصب العین کی تکمیل بھی تاوقتیکہ ملک کے سرکاری و غیر سرکاری تمام وسائل اسکی جانب متوجہ نہ ہوں مشکل نظر آتی ہے۔ اس کام کی وسعت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ صرف ایک موضع میں مدنی آسائشیں یعنے راستوں اور نیم پختہ مکانوں کی تعمیر حفظان صحت کے انتظام۔ مدرسہ کی عمارت اور بازی گاہ اور ایک پبلک ہال کی تعمیر کے لئے اوسطاً بارہ ہزار روپیہ کی ضرورت ہے۔ ملک سرکار عالی کے مواضعات کی جملہ تعداد (۲۱۶۹۷) ہے۔ اس لحاظ سے ان تمام مواضعات کی جلدی اصلاح کے لئے (۲۵) کروڑ (۳) لاکھ (۶۴) ہزار کا سرمایہ درکار ہوگا! ور اگر اسکی تکمیل کے لئے دہسالہ پروگرام ترتیب دیا جائے تو سالانہ (۲) کروڑ (۵۰) لاکھ سے زائد مصارف عائد ہونگے۔ یہ صرفہ خواہ رعایا بطور خود برداشت کرے یا خزانہ سرکاری سے رقم منظور ہو۔ بہر صورت اندرون ملک ہی سے اسکی پابجائی کرنی ہوگی۔ یا بالفاظ دیگر ملک کی سالانہ آمدنی میں

اسقدر اضافہ کرنا ہوگا کہ سالانہ (۲) کروڑ (۵۰) لاکھ کے صرفہ کا بار آسانی کے ساتھ برداشت کیا جاسکے۔

اضلاع سرکار عالی کی معاشی تحقیقات کی تکمیل کے بغیر وثوق کے ساتھ تو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ملک کی آبادی کا کس قدر حصہ ادنیٰ معیار آسودگی کے ساتھ بھی زندگی بسر کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا۔ البتہ مضافات رائچور کے ایک موضع کی معاشی تحقیق سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ (۱۵۴) خاندانوں کے منجملہ (۶۰) خاندان یا (۴۰) فیصد اس قدر محتاج ہیں کہ اقل معیار پر بھی زندگی بسر کرنا ان کے لئے دشوار ہے۔ حالانکہ جو اقل معیار اخراجات کا اندازہ میں نے قائم کیا تھا وہ (۵) افراد کے خاندان کے لئے جس میں میاں بیوی اور تین بچے شامل ہوں۔ کاشتکار خاندان کی صورت میں علاوہ ضروری اخراجات کاشت کے (۲۴۴ للعہ) اور غیر کاشتکار خاندان کی حالت میں (۲۲۵ للعہ) سالانہ سے زیادہ نہ تھا۔ مجھ کو ملک کی معاشی حالت کے مطالعہ کا جو تھوڑا بہت موقع حاصل ہوا ہے اس کے نظر کرتے یہ عرض کیا جاسکتا ہے کہ موضع اخلاص پور کی معاشی تصویر میں ملک سرکار عالی کے دیگر مواضعات کے خدوخال بھی نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ اندرونی مواضعات کی حالت بیشتر اخلاص پور سے بھی گری ہوئی ہے۔ اور ہمارے ملک میں مجموعی طور پر دیہات کی (۵۵ تا ۶۰) فیصد آبادی اقل معیار آسودگی کے ساتھ زندگی بسر کرنے کی استطاعت نہیں رکھتی۔ یہ حالات کچھ ملک سرکار عالی سے ہی مختص نہیں ہیں بلکہ برطانوی صوبہ جات ہند کا بھی یہی نقشہ ہے۔ ڈاکٹر ہیرلڈ میان نے جو کچھ مدت تک سرکار عالی کے مشیر زراعت بھی رہ چکے ہیں سنہ ۱۹۱۷ء میں ضلع پونہ کے ایک موضع پیپلا سوداگر کی معاشی تحقیق عمل میں لائی تھی۔ اور اس تحقیقات کے نتائج کو (Land and Labour in a Deccan Village) کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع کیا تھا۔ اس موضع کے متعلق ڈاکٹر موصوف نے لکھا ہے کہ (۱۰۴)

خاندانوں کے منجملہ (۸) خاندان مرفع الحال ہیں۔ (۲۸) خاندان اقل معیار آسودگی کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں۔ مگر (۶۷) خاندانوں کی معاشی حالت ابتر ہے یعنی (۶۵) فیصد خاندان اقل سے کمترین زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔

مسٹر کیشو آئنگار کے اندازہ کے بموجب زراعت پیشہ آبادی کا تناسب محبوب نگر میں (۶۰) فیصد نظام آباد۔ رائچور اور ورنگل میں (۸۰) فیصد۔ ناندیڑ اور اورنگ آباد میں (۷۶) فیصد کے قریب ہے مسٹر غلام محمد بی۔ اے عثمانیہ نے موضع چوسالہ ضلع بیڑ میں زراعت پیشہ کا تناسب (۶۶) فیصد قرار دیا ہے اور موضع اخلاص پور میں جو شہر رائچور سے دو ڈھائی میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ زراعت پیشہ آبادی کا تناسب صرف (۵۲) فیصد ہے۔ لہذا بحیثیت مجموعی یہ کہا جا سکتا ہے کہ اضلاع سرکار عالی کی (۷۰) فیصد آبادی کی گزر بسر زراعت پر ہے اور بتمہ (۳۰) فیصد آبادی دیگر ذرائع سے اپنی روزی پیدا کرتی ہے۔ ملک کی ہر جہتی معاشی ترقی کے پروگرام میں ہمیں اس لحاظ سے کہ دو تہائی آبادی کے وسائل معاش زراعت سے وابستہ ہیں اور انسان کی اولین ضروریات یعنے خوراک اور لباس کی پابجائی اسی سے ہوتی ہے۔ سب سے اول زراعتی اصلاح کے لئے ہی کوشش کرنی ہوگی۔ اور ہمارا دائرہ عمل اسی نقطہ سے آغاز ہونا چاہئے۔ بعض وہ بڑی دشواریاں جنکی وجہ سے ملک کی زراعت پیشہ آبادی کی کمر ہمت ٹوٹ چکی ہے۔ انکی تفصیل یہ ہے کہ اول تو (۶۰) فیصد کاشتکار قرض میں زیربار ہیں۔ اور اسکی مقدار سرکاری اندازہ کے بموجب (۴۰) کروڑ روپیہ سے کم نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ ملک سرکار عالی میں اوسط اراضی خشکی فی کس (۲۱) ایکڑ برآمد ہونے کے باوجود تقریباً دو تہائی تعداد کاشتکاروں کی ایسی ہے جن کے قبضہ میں اوسط سے کم زمین موجود ہے۔ اس کے علاوہ ایک افسوسناک حقیقت یہ ہے کہ کاشت کے لئے موجودہ مویشی نہ صرف غیر مکتفی بلکہ ایک حد تک ناکارہ ہیں بعض کاشتکاروں کے پاس تو زراعتی جانور

ضرورت سے کم ہیں۔ اور بعض کی یہ حالت ہے کہ جانور ہی موجود نہیں ہیں۔ آلات زرعی
کا بھی تقریباً یہی حال ہے۔ اور یہ دیکھا گیا ہے کہ بجز بعض مرہٹواڑہ کے اضلاع کے جدید
آہنی آلات تو کجا خود مقامی آلات کشاورزی اور تخم ریزی کی بھی کمی ہے۔ اور کرایہ یا مانگے
کے آلات سے بڑی حد تک کام چلایا جاتا ہے تقریباً (۷۵) فیصد کاشتکاروں کے
پاس بنڈیاں بھی موجود نہیں ہیں۔

نتیجہ اس تفصیل کا یہ ہے کہ اصلاح زراعت کا کام واقعی اتنا سہل نہیں ہے
جیسا کہ بادی النظر میں سمجھا جا سکتا ہے۔ دراصل منزل پر منزل طے کئے بغیر اس
نصب العین کی تکمیل مشکل نظر آتی ہے۔ مگر یہ کام ناممکن نہیں ہے۔ اور ملک کی آئندہ فلاح
و بہبودی کے لئے یہ کام جب ہمیں کرنا ہی ہے تو ہمیں اپنی مسافت جلد طے کرنے کا
عزم کر لینا چاہئے۔

کاشتکاروں کو قرضہ سے نجات دلانے کے لئے قانون مصالحت قرضہ کا
نفاذ نہایت مستحسن سمجھا جا رہا ہے۔ اور یہ امر متوقع ہے کہ اس سے کاشتکاروں کو قرضہ جات
کے تصفیہ میں بہت بڑی مدد ملیگی۔ ڈاکٹر میاں کے بقول اگر کاشتکاروں کے سارے قرضہ
بے باق کر دیئے جائیں تو پھر بھی ملک کے (۵۰) فیصد کاشتکار علی حالہ اقل معیار
آسودگی سے کمتر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہونگے۔ اس بناء پر کاشتکاروں کی معاشی اصلاح
ہی انکو قرضہ کے بار سے سبکدوش کرنے کی بہترین ضمانت ہے۔ بعض ضروریات کی تکمیل
کے لئے کاشتکاروں کا قرضہ حاصل کرنا ناگزیر ہوتا ہے۔ مگر فصل تیار ہونے پر اگر اتنی نقد
پیداوار حاصل ہو کہ اسکی آمدنی سے قرضہ کی رقم بھی بے باق کر دیجا سکے یا سالانہ اقساط
ادا ہو سکیں تو پریشانی کا باعث نہیں ہے۔ اسی طرح کاشتکاروں کے قدیم قرضہ جات
کا بھی آسانی کے ساتھ تصفیہ ہو سکتا ہے۔ بشرطیکہ انکی آمدنی کا معیار بلند کر دیا جائے
اس ایک سبب سے بھی کاشتکاروں کے ذرائع آمدنی کا بڑھایا جانا ملک کی اولین

ضرورت ہے۔

اکنامک ہولڈنگ یا زیر کاشت اراضی کا اسقدر رقبہ جسکی بدولت (۵) افراد کے ایک خاندان کی معمولی آسودگی کے ساتھ پرورش ہو سکے ابھی زیر بحث مسئلہ سمجھا جاتا ہے۔ مسٹر اینگار نے ملک گارعا میں (۱۵) ایکڑ کے خشکی کے رقبہ کو اکنامک ہولڈنگ قرار دینا مناسب سمجھا ہے۔ ڈاکٹر میان کے خیال میں (۲۰ تا ۲۵) ایکڑ کی خشکی اراضی اضلاع دکن علاقہ بمبئی میں اکنامک ہولڈنگ قرار دیجا سکتی ہے۔ میری یہ رائے ہے کہ (۱۵ تا ۲۰) ایکڑ کی متوسط درجہ کی اراضی (۵) افراد کے خاندان کیلئے بشرطیکہ وہ خود محنت کرے اور ذاتی لوازمات کاشت (جانور اور آلات) موجود ہوں اقل معیار آسودگی پر بسر کرنیکے لئے کافی ہو سکتی ہے۔ مگر یہ حقیقت نظر انداز کرنیکے قابل نہیں ہے کہ بعض خاندان جنکے قبضہ میں چالیس پچاس ایکڑ سے زیادہ زمین ہے اور افراد خاندان بھی (۶ یا ۷) سے زیادہ نہیں ہیں نہایت تنگدستی سے بسر کرتے ہیں! اسی کے ساتھ ایسی مثالیں بھی دیکھنے میں آتی ہیں کہ بعض خاندان جنکے قبضہ میں زیر کاشت اراضی (۱۵) ایکڑ سے بھی کم ہے معاشی نقطہ نگاہ سے بہر حال آسودہ حال ہیں۔ مزید وضاحت کیلئے میں دو تین مثالیں موضع اخلاص پور کی آپ کے ملاحظہ کیلئے پیش کرونگا۔ اس موضع میں ایک کوئی خاندان آباد ہے! افراد خاندان (۷) ہیں اور (۵۵) ایکڑ ۱۰ گنٹہ اراضی قبضہ میں ہے اور زیر کاشت ہے۔ قرضہ کا بار صرف (۳۰۰) ہے ۱۳۴۹ف تا ۱۳۵۰ف کے دوران میں اس نے کپاس اور جوار کی کاشت کی تھی۔ کڑبی اور بدر مالگزاری کے قطع نظر صرف (۱۷۸) کی مالیتی پیداوار حاصل ہوئی (یعنے فی ایکڑ ۳ روپئے)۔ زراعتی جانوروں میں ترگاوان کی ایک جوڑی موجود ہے اور زرعی آلات کی کل کائنات صرف ایک چوبی ناگر ہے! اس سے یہ قیاس قائم کیا جا سکتا ہے کہ اس اراضی میں کس پایہ کی زراعت ہوتی ہوگی۔ نتیجہ یہ ہے کہ حقیقی ضروریات کی تکمیل کیلئے بھی اس خاندان کو مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا ہے! وہ تباہ حالی سے گزر بسر ہوتی ہے۔ اسکے بالعکس اسی موضع میں ایک (۶) افراد کا گولر خاندان بھی رہتا ہے! اراضی خشکی بمقدار (۱۰) ایکڑ (۲۲) گنٹہ پر کاشت کی جاتی ہے۔ ایک جوڑ ترگاوان کے لئے علاوہ ایک گائے اور

بھینس بھی موجود ہے۔ زراعت سے علاوہ کرائی اور زر مالگزاری کے (۲۷ روپے) یعنی فی یکہ (۵ روپے) اور گھی اور دودھ کی تجارت سے (۴ روپے) اس طرح (۳۱۸ روپے) کی سال ۱۳۴۹ف تا ۱۳۵۰ف میں آمدنی ہوئی۔ آمد و خرچ اگرچہ برابر ہے۔ مگر آسودہ حالی سے بسر ہوتی ہے! اور ایک کولی خاندان جس میں (۵) افراد شامل ہیں۔ (۱۳ ایکر ۲۵ گنٹہ) اراضی پر کاشت کرتا ہے ایک بیل موجود ہے مگر دوسرے کاشتکار کے ساتھ ساجھا کرلیا جاتا ہے۔ آمدنی علاوہ زر مالگزاری اور کرائی کے (۲۶ روپے) یا (۲ روپے) فی یکر رہی۔ مزدوری سے بھی اس سال (۸ روپے) کی آمدنی ہوئی۔ اسکے باوجود اقل معیار کے ساتھ اس خاندان کی گزر اوقات مشکل ہو گئی ہے حالانکہ طریقہ کاشت قابل اعتراض نہیں ہے۔ ان تمثیلی واقعات پر غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ

(۱) رقبہ زیر کاشت کے مقررہ معیار سے زیادہ ہونے پر بھی تاوقتیکہ بہتر کاشت کیلئے ذرائع عمل آوری موجود نہ ہوں اور فصل کی اچھی طرح دیکھ بھال نہ کیجائے معاشی خوشحالی پیدا نہیں ہوسکتی۔

(۲) زمینات زیر کاشت کا رقبہ اگر معیار سے کم ہو تو اقل درجہ کی آسودگی کا قائم رکھنا باوجودیکہ طریقہ کاشت میں کوئی نقص نہ ہو۔ دشوار ہو جاتا ہے۔

(۳) کمتر رقبہ کی اراضیات سے بھی بعض خاص حالات میں جیسے خشکی اراضی پر باغات کی کاشت کے وسائل مہیا کرنا۔ یا دقیق کاشت کا بندوبست کرنا یا دیگر ذرائع آمدنی کا فراہم کرنا ہر صورت میں فارغ البالی کے ساتھ زندگی بسر کیجا سکتی ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندوستان اور اسی طرح ملک سرکار عالی میں جو ذرائع آمدنی فراہم ہیں انمیں معاشی توازن موجود نہیں ہے! اور یہی سبب ہے کہ ملک کی نصف سے زائد آبادی عسرت اور تنگدستی سے بسر کرتی ہے تاہم خوش قسمتی سے ملک سرکار عالی میں زراعت پیشہ آبادی کی ابھی وہ کثرت نہیں ہے۔ جیسے بعض صوبہ جات ہند میں پائی جاتی

ہے۔ زیر کاشت رقبہ کو مساوی طور پر تقسیم کرنے سے ہر کاشتکار خاندان کیلئے (۲۱) ایکڑ
خشکی زمین فراہم ہوسکتی ہے۔ اس کے علاوہ بعض اضلاع میں افتادہ زمینات کو بھی قابل
کاشت بنایا جاسکتا ہے۔ ذرائع آبپاشی کی بدولت دقیق کاشت کے ذرائع بھی موجود ہیں
بالفاظ دیگر ملک سرکار عالی میں (۷۰) فیصد آبادی کیلئے پیشہ زراعت سے کم از کم اقل ترین
معیار آسودگی فراہم کرنا ناممکن نہیں ہے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ جن کاشتکاروں کے پاس
زمینات تو زیادہ ہیں مگر ذرائع کاشت موجود نہیں ہیں اور اس وجہ سے زراعت کی حالت
ادنی درجہ کی ہے وہ خود صرف اسقدر اراضی پر کاشت کریں جس کا وہ بخوبی انتظام
کرسکتے ہوں اور تتمہ اراضی کو منافعہ پر اُن کاشتکاروں کے حوالہ کردیں جن کے پاس
کافی زمینات موجود نہیں ہیں۔ اس طرح اگر ایک طرف بعض کاشتکاروں کی نااہلی کی وجہ
معاشی اسراف کا سد باب ہوجائیگا وہاں ایسے کاشتکاروں کے لئے جو اراضی کی قلت
کی وجہ آسودہ حالی سے بسر نہیں کرسکتے فارغ البالی کے اسباب فراہم ہوسکیں گے۔ اوپر جو
مثالیں دی گئی ہیں اُن پر غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کاشتکار نمبر (۱) کے پاس
(۵۵) ایکڑ اراضی موجود ہے مگر آمدنی (۱/۱۲) فی ایکڑ سے زیادہ نہیں اگر کسی طرح یہ بندوبست
ہوجائے کہ وہ صرف (۳۵) ایکڑ اراضی پر خود کاشت کرے اور بقیہ (۲۰) ایکڑ اراضی قول پر
کاشتکاران نمبر ۲ و ۳ کے حوالہ کردے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ ان دونوں کاشتکاروں کے پاس
بھی کافی اراضی زیر کاشت ہوگی اور خود کاشتکار اول کے پاس اسقدر زمین موجود
رہیگی کہ اگر وہ ذرا توجہ کرے تو موجودہ پیداوار سے زائد پیداوار حاصل کرنے کے علاوہ
(۲۰) ایکڑ اراضی کے قول پر اٹھا دینے سے کم از کم (۱۰۰) سالانہ کی آمدنی اور ہوسکیگی اور
یہ کاشتکار خاندان نہ صرف ادنی معیار پر بلکہ فارغ البالی سے بسر کرسکیگا۔ اس ایک
سبب سے بھی بڑی حد تک ملک کے کاشتکاروں میں معاشی خوشحالی پیدا کیجاسکتی ہے۔
جن کاشتکاروں کے پاس کافی سے زیادہ زمینات موجود ہیں اور بہتر طریقہ پر کاشت

کیجاتی ہے۔ انکی زمینات انھیں کے قبضہ میں رہنی چاہئے۔ تاکہ انکی آسودگی اور فارغ البالی سے ملک کی عام دولت و ثروت میں اضافہ ہوتا رہے۔

ذرائع آب کے فراہم کرنے اور باغات یا تری کی کاشت میں توسیع دینے سے بھی ملک کے بہت سارے مواضعات میں خوشحالی پیدا کیجا سکتی ہے۔ جہاں زیر زمین پانی کے دستیاب ہونے میں دشواری نہ ہو وہاں معمولی سرمایہ کے مہیا کرنے سے باولیاں کھدوائی جاسکتی ہیں۔ اسی طرح تالابوں اور کنٹوں کی مرمت اور تعمیر سے بھی فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ مگر ہر صورت میں یہ دیکھ لینا چاہئے کہ فلاں علاقہ کے لئے تری یا باغات کی کاشت سود مند ہوسکتی ہے یا نہیں۔ اگر یہ طریقہ سود مند بھی ہو تو اول اسکی جانچ کرلینی چاہئے کہ کاشتکاروں میں خشکی کاشت کی بجائے باغات اور تری کی کاشت کی اہلیت موجود ہے یا نہیں۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ وسیع پیمانہ پر ذرائع آبپاشی قائم کئے بغیر بھی صرف باولیات کی تیاری یا موجودہ منہدم باولیوں کی مرمت اور چھوٹے چھوٹے دیگر ذرائع آبپاشی کے قائم کرنے سے بھی کاشتکاروں کی موجودہ گری ہوئی حالت کی اصلاح اور ذرائع آمدنی میں اضافہ کیا جاسکتا ہے۔

کاشتکاروں کی معاشی حالت کے سدھارنے کا ایک اور ذریعہ لوازمات کاشت Equipment کا مناسب تعداد میں فراہم کرنا ہے۔ ڈاکٹر ٹیلر کے بقول ممالک متحدہ امریکہ میں اوسطاً ہر ایک یکر اراضی زیر کاشت کیلئے (۸) ڈالر یا اندازاً مبلغ (۲۵) کے آلات اور مویشی موجود ہیں۔ ملک سرکار عالی میں کاشتکاروں کے آلات اور مویشی کی مالیت کا ایک سرسری اندازہ (۶) فی یکر سے زیادہ نہیں ہے۔ حالانکہ (۲۵) یکر کسی اراضی کے لئے متوسط درجہ کے نرگاوان کی ایک جوڑ۔ ایک بنڈی اور دیسی آلات جیسے ناگر۔ بکھر وغیرہ لازمی ہیں۔ اسطرح (۲۵) یکر اراضی کیلئے بعض سود مند جدید آلات، جیسے آہنی ناگر کلٹیویٹر وغیرہ کو نظر انداز کرنے پر بھی کم از کم دو سو روپے کی مالیت کے مویشی اور مقامی آلات کی ضرورت ہے

اسطرح ان لوازمات زراعت کی فراہمی کیلئے اوسطاً (۸ ۱۵) فی ایکر کا مزید صرفہ ناگزیر ہے گویا مجموعی طور پر بحساب فی موضع (۱۵۰۰) (۲۱ ۶۹۷) مواضعات کیلئے (۳ کروڑ ۲۵ لاکھ) کا سرمایہ فراہم کرنا ہے۔ جسکے بغیر اصلاح زراعت کا کام ادھورا رہ جائیگا۔ اگر ایک پنجسالہ پروگرام کے تحت اسکی پابجائی کیجائے تو سالانہ (۶۵) لاکھ کے صرفہ کی ضرورت محسوس ہوتی ہے بہر طور ملک کے کاشتکاروں کی اصلاح کیلئے جو معاشی پروگرام ترتیب دیا جائے اسمیں اس سرمایہ کی فراہمی بھی اولین درجہ رکھتی ہے۔ کیونکہ عاملین پیدائش یعنے زمین مختلف محنت اور لوازمات کاشت میں جبتک توازن نہ موجود ہو زراعت پیشہ افراد کی معاشی اصلاح نہایت دشوار ہے۔ ہمارے ملک میں محنت کی کمی نہیں ہے۔ ضرورت اسکی ہے کہ جملہ کاشتکاروں کیلئے اکنامک ہولڈنگ اور مکمل طور پر لوازمات کاشت فراہم کرد‌ئے جائیں اس میں شبہ نہیں کہ ہمارے کاشتکار صدہا سال کے تجربہ کی بنا پر فن کاشتکاری سے بخوبی واقف ہیں۔ یہ علحدہ بات ہے کہ بعض دفعہ سرمایہ کی کمی یا کبھی اپنی سستی اور کاہلی سے جو کچھ وہ خود جانتے ہیں اسپر عمل نہیں کرتے۔ ضرورت ہے کہ ان کا بھلایا ہوا سبق پھر انھیں یاد دلایا جائے۔ یہ کام ہمارا ہے کہ سائنس کی ترقی کی وجہ سے جو جدید اور موثر طریقے انسان کے علم میں آئے ہیں اُس سے کاشتکاروں کو بھی مستفید ہونیکا موقع دیا جائے۔ صرف ترقی یافتہ تخم کی اشاعت اور امراض فصول کی انسدادی تدابیر کی تعلیم سے ہی بیش بہا نتائج حاصل ہو سکتے ہیں۔

اگر یہ حالت پیدا ہو جائے تو توقع ہے کہ ملک کی (۷۰) فیصد آبادی پیشۂ زراعت کی بدولت آسودہ حال زندگی بسر کر سکتی ہے۔ اگر ان تدابیر کے اختیار کرنیکے باوجود ہماری ساری زراعت پیشہ آبادی کیلئے معاشی خوشحالی پیدا نہ ہوسکے تو ساتھ ہی ساتھ دیگر ذرایع آمدنی کی طرف توجہ کرنی مناسب ہوگی۔ اور معمولی سرمایہ فراہم ہوسکے تو ہر غیر فارغ البال خاندان۔ دودھ اور گھی کی تجارت سے بھیڑ بکری کی پرورش سے یا فرصت کے اوقات میں بعض آسان گھریلو صنعتوں کے اختیار کرنے سے اپنی آمدنی میں کافی اضافہ کر سکتا ہے۔

کاشتکاروں کی معاشی حالت کی اصلاح اور درستی کے ساتھ دیہات کی تتمہ (۳۰) فیصد آبادی کی طرف بھی یہی توجہ کرنی ہے۔ غیر زراعت پیشہ آبادی کی اس تعداد میں مسٹر آئنگار کے اندازہ کے بموجب اوسطاً (۲۲) فیصد مزدور پیشہ افراد ہیں۔ اور وثوق کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اندرونی مواضعات میں انکی حالت بہت گری ہوئی ہے۔ اور باوجود کوشش اور تردد کے ان کو روزگار ملنا دشوار ہوتا ہے۔ میرا یہ خیال ہے کہ بحالت موجودہ اچھوت اقوام کے مقابل اونچی ذات کے ہندو اور مسلمان جو مزدور پیشہ ہیں انہی کی حالت زیادہ سقیم پائی جاتی ہے۔ (۷۰) فیصد زراعت پیشہ کی خوشحالی کے پیدا ہونے سے اگرچہ مزدوروں کی مانگ بھی بڑھ جائیگی تاہم مزدور پیشہ کی ایک ثلث آبادی کی کھپت کیلئے بھی ایک موثر لائحہ عمل تیار کرنا لازمی ہے دستی پارچہ بافی اور دیگر خاص قسم کی گھریلو صنعتوں کی ترویج اور تعمیرات عامہ کے آغاز کرنے سے انکے لئے ذرائع معاش پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ یا ملک میں بڑے پیمانہ پر کارخانے قائم کئے جاکر انکی بے روزگاری کا ازالہ کیا جا سکتا ہے۔

زراعت پیشہ اور مزدور پیشہ کے علاوہ دیہات کی تقریباً (۸) فیصد آبادی صنعت و تجارت، ملازمت اور دیگر ذرائع سے اپنی معاش حاصل کرتی ہے۔ مزدور پیشہ اور بعض صورتوں میں کاشتکاروں کے مقابل اگرچہ انکی معاشی حالت نسبتاً اچھی ہے مگر آسودہ حال اور فارغ البال لوگ کم ہیں۔ اور صنعت پیشہ افراد خصوصاً پارچہ بافوں کی حالت عموماً ادنی معیار سے گری ہوئی ہے بڑے پیمانہ پر پارچہ سازی کے کارخانوں کے قائم ہو جانیکے باوجود دستی پارچہ سازی کی صنعت ہندوستان میں ہنوز قائم اور زندہ ہے۔ اگر خاص قسم کی پارچہ سازی اور پارچہ بافوں کی تنظیم کیجانب توجہ کیجائے تو آسانی کے ساتھ انکی معاشی حالت کو بھی سنوارا جا سکتا ہے۔ اسکے علاوہ زراعت پیشہ اور مزدور پیشہ کی معاشی اصلاح سے جو نتائج مرتب ہونگے اور صنعت و تجارت کو جو فروغ حاصل ہوگا اسکی بدولت مواضعات کی تتمہ (۸) فیصد آبادی بھی معاشی فوائد حاصل کر سکتی ہے۔

اس نمائش کے افتتاح کے موقع پر جناب صدر نے اپنے سپاسنامہ میں اس امر کا اظہار فرمایا
تھا کہ اسوقت دنیا میں معاشی سوال وقت کا سب سے بڑا سوال بنگیا ہے! اور موجودہ جنگ کی
ہولناک حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ زبردست اور منظم اقوام کمزور اور غیر منظم قوموں
کو اقتصادی اور معاشی محکومیت میں رکھنا چاہتی ہیں۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس ہیبت انگیز اور عالمگیر
جنگ کے شعلے آج چوطرف بھڑک رہے ہیں اور دنیا کی ہر چھوٹی بڑی سلطنت اسکی زد میں ہے
تاہم حق اور صداقت کی فتح بہر طور لازمی ہے مگر یہ صاف دکھائی دیرہا ہے کہ اس جنگ عظیم کے
اثرات بھی بڑے ہی انقلاب انگیز ہونگے اور ہندوستان بھی اسکی زد سے محفوظ نہ رہیگا اسلئے ضرورت ہے کہ
ملک کی ہر جہتی معاشی ترقی کا ایک قابل عمل اسکیم ابھی سے تیار کرلیا جائے کہ بعد از اختتام جنگ ہم اپنی
پوری قوت کے ساتھ اسپر عمل پیرا ہوسکیں۔ گزشتہ معاشی کانفرنس کے صدر مولوی حبیب الرحمن صاحب
کا یہ ارشاد بالکل درست ہے کہ موجودہ زمانہ میں حکومت کا اثر افراد کی زندگی کے ہر شعبہ پر روز بروز
گہرا ہوتا جارہا ہے عدم مداخلت کا قدیم مسلک اب فرسودہ ہوچکا ہے۔ سوسائٹی کی زندگی کا
کوئی شعبہ اب ترقی نہیں کرسکتا جبتک کہ اسمیں حکومت کا ہاتھ نہ ہو۔ مگر یہ واضح رہے کہ ملک کی
ہر جہتی معاشی ترقی کے نصب العین کی ساری تکمیل خود حکومت کے بھی بس کی بات نہیں ہے۔ ملک کے
رفاہ عام کے کام انجام دینے والے غیر سرکاری اداروں کو بھی تعاون عمل کیلئے تیار رہنا ہوگا ضرورت
ہے کہ ممالک محروسہ کے با اثر اور متمول اشخاص "خوار دیدن خویش را از خواری ابنائے جنس" کے
اصول پر عمل کریں۔ مگر اس سے بھی اہم ترین مسئلہ خود افراد رعایا میں اپنی حالت آپ سدھارنے اور
معاشی خوشحالی میں اضافہ کرنے کے صحیح جذبات کا پیدا ہونا ہے معلمین اخلاق اور مذہب کیلئے
بھی کام کرنیکا وسیع میدان موجود ہے۔ ترک مسکرات ہی کے پرچار سے دیہی آبادی خصوصاً مزدور
پیشہ طبقہ کی معاشی حالت کے سدھارنے میں حیرت انگیز کام انجام دیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح اخراجات
شادی کے کم کرانیکی کوشش کیجائے تو نہایت ہی بہتر اثرات مترتب ہوسکتے ہیں! اور آیندہ کیلئے قرض
حاصل کرنے کی ایک بڑی مد کو حذف کیا جاسکتا ہے۔

میں نے اس مضمون میں یہ عرض کیا ہے کہ ملک سرکار عالی کے دیہات میں مدنی آسائشیں فراہم کرنیکے لئے کم از کم (۲۵) کروڑ روپئے کے سرمایہ کی ضرورت ہے۔ آلات اور مویشی کی خریدی کے لئے سوا تین کروڑ کے اخراجات ناگزیر معلوم ہوتے ہیں۔ ذرایع آبپاشی کی فراہمی کے لئے بھی ایک خطیر رقم کی ضرورت ہے۔ طبی امداد اور تعلیم کے لئے بھی کثیر متوالی اخراجات برداشت کرنے ہونگے۔ مگر یہ سوال بھی تو پایا جاتا ہے کہ اگر پانچ یا دس سال کی مدت اس پروگرام کی تکمیل کیلئے مقرر کیجائے تو پھر بھی کئی کروڑ سالانہ کے اخراجات کس طرح برداشت کئے جاسکتے ہیں۔ اس سوال کا حل درحقیقت ایک کٹھن معاملہ ہے! اور ملک کے ارباب اقتدار اور ماہرین معاشیات ہی اس گتھی کو سلجھا سکتے ہیں مگر اس مضمون کے ختم کرنے سے قبل میں ایک خیال آپ کے غور و فکر کے لئے چھوڑتا ہوں۔ مدنی آسائشیں جیسے سڑکوں اور مکانات کی تعمیر و ترمیم۔ باؤلیوں کی کھدوائی نالوں اور بدرو کی تیاری۔ بازی گاہوں کا قیام یہ چیزیں ایسی ہیں جنکی تیاری کا مال مسالہ بڑی حد تک خود مواضعات میں قدرتی طور پر دستیاب ہوتا ہے۔ انکی تعمیر کیلئے نہ بڑے ماہرین فن کی ضرورت اور نہ خاص قسم کے کاریگر درکار ہیں۔ بلکہ خود مواضعات کے رہنے والے اسکی انجام دہی کرسکتے ہیں۔ ہمارے کاشتکار جو خشکی اراضی پر کاشت کرتے ہیں سال میں دو مہینے تقریبا بیکار رہتے ہیں بعض متمدن ممالک کی رعایا کی طرح جنکو جبری طور پر سال میں چند مہینے فوجی تعلیم حاصل کرنا لازمی ہوتا ہے اسی طرح مواضعات کی اصلاح اور درستی کے لئے ہمارے زراعت پیشہ اور دیگر افراد سال میں کچھ دنوں کیلئے اپنی خدمات مفت پیش کریں تو امداد باہمی کے اصول پر رفتہ رفتہ مکانات بھی درست ہوسکتے ہیں۔ مواضعات میں سڑکیں بھی تیار ہوسکتی ہیں۔ حفظان صحت کا بھی انتظام کیا جاسکتا ہے۔ اور بڑی حد تک سرمایہ کی فراہمی کا سوال خود بخود حل ہوجاتا ہے۔ صرف شوق اور ہمت کی ضرورت ہے۔

کوانگی کے ذریعہ کھیت کے کونوں کی مٹی نرم اور کھوکھلی کیجاتی ہے۔ کھرپے سے اُن جنگلی پودوں کو نکال دیا جاتا ہے جو تمباکو اور مرچ کے کھیتوں میں اُگ آتے ہیں۔ اسی طرح دیگر آلات بھی مختلف کاموں میں استعمال کئے جاتے ہیں۔[۱]

یہاں تک تو ہم نے اقسام آلات کا حال بتلایا۔ اب ہم متذکرہ آلات کی تعداد دریافت کرینگے۔[۲]

اقسام آلات	تعداد	اقسام آلات	تعداد
ناگر (ہل) بڑے اور چھوٹے	۳۹۴	درانتیاں	۴۲۲
بکھر	۱۰۳	سبل	۶۵
دو وسے بڑے اور چھوٹے	۱۲۱	پھاوڑے	۱۵۱
دانتریاں	۱۲۴	کھرپیاں	۶۳
دوسشیا	۱۰	کونکیاں	۳۵۴
تیتھن	۶۷	کلہاڑیاں	۲۱۵
سینڈیاں (چھکڑے)	۲۶	تپائیاں	۳۶
کولہو	۴	سوپ و چھبیاں	۳۹۹

بحیثیت مجموعی جملہ دیہات میں ہل، بکھر، دورے اور دانتریوں کی تعداد زیادہ ہے۔ کیونکہ جملہ رقبہ مزروعہ مختلف غیر معاشی اراضیات میں منقسم ہے۔ زمین خواہ معاشی ہو یا غیر معاشی ہر اس شخص کو جو زراعت

---

[۲] آلات شماری بذات خود کی گئی ہے۔

کرتا ہے ہل ۔ پکھر ۔ دوراا اور دراتری رکھنا پڑتا ہے ۔ اس طرح بلحاظ مجموعی ان آلات کی تعداد بہت بڑھ جاتی ہے

درکشیا تعداد میں اس قدر کم اس لئے ہیں کہ زیر بحث موضع میں ماہودی جوار بہت کم بوئی جاتی ہے

موضع ہذا کی مزروعہ خشک زمینات کا لحاظ کرتے ہوئے چھکڑوں کی یہ تعداد بھی زیادہ ہے جہاں تک کہ بنڈیوں کا تعلق ہے ان کی تعداد بہت ہی کم ہے ۔ وجہ یہ ہے کہ دیگر زرعی آلات کے مقابل بنڈی بہت قیمتی ہوتی ہے جس کو ہر کسان آسانی کے ساتھ نہیں خرید سکتا ۔ حالانکہ ہر کسان کے ہاں بنڈی کا رہنا ضروری ہے کیونکہ اس کے ذریعہ مکان سے کھیتوں تک کھاد لیجانے، کھیت سے پیداوار مکان لانے اور پھر اس کو منڈی لیجانے میں غیر معمولی مدد ملتی ہے ۔ یہاں اکثر کسان اپنا غلہ مقامی طور پر اس لئے بھی فروخت کر دیتے ہیں کہ ان کے ہاں ذاتی بنڈی نہیں ہوتی ۔

یہ سوال ہو سکتا ہے کہ کولہو کی طرح بنڈی بھی مشترکہ طور پر کیوں نہیں خریدی جاتی ۔ سوال بالکل معقول ہے ۔ کسانوں کو مشترکہ طور پر بنڈیاں خریدنا چاہئیے لیکن اس طرف وہ بہت کم توجہ کرتے ہیں گو کہ بنڈی کے نہونے کی وجہ سے انہیں آئے دن مختلف دقتیں اور قابل لحاظ نقصان اٹھانا پڑتا ہے ۔

متفرق آلات میں دراتیوں ۔ کونکیوں ۔ سوپ اور چھبوں کی تعداد بہت زیادہ معلوم ہو رہی ہے لیکن فی نفسہ یہ زیادہ نہیں ہے کیونکہ ان کی اہمیت کی مد نظر ہر کسان کے ہاں ان کی ضروری تعداد موجود رہتی ہے ۔

زرعی آلات کی مذکورہ تشریح سے ہمیں دو باتیں معلوم ہوئیں ۔ ایک یہ کہ موضع ہذا میں کس قسم کے آلات مستعمل ہیں ۔ دوسرے یہ کہ ان کی تعداد کیا ہے ۔

قسم آلات کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ کولہو کے سوائے جملہ آلات متعلقہ وہی قدیم اور پرانے ہیں جو آج سے کئی نسل قبل مروج تھے ۔

جب ہم یہ سوال کرتے ہیں کہ ہمارے کسان قدیم آلات کیوں استعمال کرتے ہیں تو ہمیں اسکے چند وجوہ نظر آتے ہیں ۔ سب سے اہم وجہ یہ ہے کہ جدید آلات کی قیمت قدیم آلات کے مقابل زیادہ ہوتی ہے اور کسان انہیں نہیں خرید سکتے ۔ چنانچہ چند آلات کی تقابلی قیمتوں سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ قدیم آلات کے مقابل جدید آلات کی قیمتیں کس قدر زائد ہوتی ہیں ۔

قدیم آلات	قیمت کلدار	جدید آلات	کلدار قیمت	قیمتوں میں فی صد فرق
ہل	۴ روپیے	ہل	۷ روپیہ ۸ آنے	۴۷
بکھر	۳ "	بکھر	۹۵ "	۹۷
پتھن	۸ "	پتھن	۶۰ "	۸۷
دورا	۴ "	دورا	۴۵ "	۴۱
دانتری	۳ "	دانتری	.. ..	-

مانا کہ جدید آلات کے مقابل قدیم آلات ارزاں ہوتے ہیں۔ انہیں آسانی کے ساتھ منتقل کیا جاسکتا ہے۔ مقامی بیلوں کی استطاعت کے موافق ہیں اور انکی مرمت بھی بہ آسانی ہوسکتی ہے لیکن محض ان خصوصیات کی بنا پر یہ خیال کرلینا کہ ہماری زراعت کیلئے پرانے آلات ہی موزوں ہیں ٹھیک نہیں۔ یہ خیال درست ہے کہ کسانوں کے موجودہ افلاس اور جانوروں کی ناگفتہ بہ حالت کے تحت مروجہ آلات کے سوا جدید آلات کا استعمال کرنا بہت وقت طلب ہے لیکن اگر ہم اپنی زراعت کو بہتر بنانا چاہیں تاکہ زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل ہوسکے تو ہمیں نہ صرف مویشیوں کی حالت کو بہتر کرنا ہوگا بلکہ جدید اور مناسب حال آلات کا استعمال بھی ضروری ہے۔

(ج) مصنوعی ذرائع آبپاشی ——— زرعی اصل کام کا تیسرا جزو مصنوعی ذرائع آبپاشی ہیں۔ مصنوعی ذرائع آبپاشی سے ہماری مراد تالاب اور نہریں ہیں۔ واضح رہے کہ موضع ہذا میں ایک بھی باؤلی آبپاشی کے لئے مستعمل نہیں۔

نہر نظام ساگر کی اجرائی سے قبل (سنہ ۱۳۴۰ف مطابق ۱۹۳۱ء) موضع زیر بحث کا جملہ رقبہ کاشت

۱۴۶۲٫۵ ایکڑ تھا۔ اس رقبہ میں ۹۳۶ ایکڑ خشک اراضیات تھے اور ۵۲۶ ایکڑ تر اراضیات پر مشتمل تھے۔ بالفاظ دیگر مجموعی رقبہ کاشت کا لحاظ کرتے ہوئے رقبہ آبپاشی ۳۶ فیصد تھا۔ اس رقبہ کی آبپاشی حسب ذیل تین تالابوں کے ذریعہ ہوا کرتی تھی

تالاب	وسعت		گہرائی		فی تالاب رقبہ آبپاشی	
	ایکڑ	گنٹہ	فٹ	انچ	وسعت ایکڑوں میں	فی صد
تہور تالاب	۸۲	۱۸	۱۶	۶	۲۴۱	۱۶٫۵
اوسرگاپلی تالاب	۸۹	۱۴	۹	۶	۲۲۹	۱۵٫۷
ماسانی تالاب	۲۸	۱۸	۶	-	۵۶	۳٫۸
جملہ	۲۰۰	۱۰	۳۲	-	۵۲۶	۳۶٫۰

سابقہ جدول سے واضح ہو رہا ہے کہ ۳۶ فی صد رقبہ آبپاشی کے منجملہ ۱۶٫۵ فیصد تہور تالاب کے ذریعے ۱۵٫۷ فیصد اوسرگاپلی تالاب سے اور ۳٫۸ فیصد رقبہ ماسانی تالاب سے سیراب ہو سکتا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ مذکورہ تین تالابوں کے ذریعہ فصل آبی اور خصوصاً تابی کی کاشت میں بڑی مدد ملتی تھی لیکن اس امداد کا مدار بالواسطہ طور پر بارش سے تھا کیونکہ اگر بارش ٹھیک ہوتی تو تالابوں میں بھی خوب پانی جمع رہتا تھا۔ اور اس طرح نسبتاً وسیع رقبہ پر تری کاشت کی جا سکتی تھی۔ برعکس اس کے اگر بارش ٹھیک نہ ہوتی تو تالابوں میں بھی پانی کی مقدار قلیل ہوتی جس کی بناء پر رقبہ کاشت کو محدود کرنا پڑتا تھا چنانچہ قلت آب کی وجہ سے

سنہ ۱۳۲۸ف (۱۹۱۹ء)، سنہ ۱۳۲۹ف (۱۹۲۰ء) اور سنہ ۱۳۳۰ف (۱۹۲۱ء) میں فصول تابی کاشت ہی نہیں کئے گئے۔ قلت آب ہی کی بنا پر سنہ ۱۳۱۹ف (۱۹۱۰ء) سنہ ۱۳۲۰ف (۱۹۱۱ء) سنہ ۱۳۲۱ف (۱۹۱۲ء) سنہ ۱۳۳۴ف (۱۹۲۵ء) اور سنہ ۱۳۳۵ف (۱۹۲۶ء) میں پانچ ایکڑ سے بھی کم رقبہ کاشت کیا گیا حالانکہ معمولی سالوں میں فصل ہائے تابی کا رقبہ پچاس سے سو ایکڑ تک کاشت کیا جاتا تھا۔

اجرائی نہر (۱۳۴۳ف مطابق ۱۹۳۴ء میں نہر کی اجرائی عمل میں آئی) کے بعد ذرائع آبپاشی میں دو قسم کی سہولتیں بہم پہنچیں۔ ایک یہ کہ بمقابل سابق رقبۂ آبپاشی میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا۔ یعنی یہ کہ اجرائی نہر سے قبل جملہ رقبہ کاشت ۱۴۵۲ ایکڑ تھا۔ اس میں ۹۲۶ ایکڑ خشک زمین تھی اور ۵۲۶ ایکڑ تر اراضی۔ لیکن اجرائی نہر کے بعد ۱۳۶۰ ایکڑ رقبۂ کاشت[1] میں سے ۹۸۴ ایکڑ تر زمین ہوگئی اور خشک زمین صرف ۳۷۶ ایکڑ رہ گئی۔ گویا نہر جاری ہونے کی بدولت رقبۂ آبپاشی میں فیصد کا اضافہ ہوا۔ نہر کی اجرائی سے قبل مجموعی کاشت کا لحاظ کرتے ہوئے جملہ رقبۂ آبپاشی صرف ۳۶ فیصد تھا لیکن اب ۷۳٫۰ فیصد ہوگیا جن ذرائع سے یہ رقبہ سیراب ہوتا ہے وہ ذیل میں درج ہیں۔

تالاب و نہر	رقبہ آبپاشی بذریعہ نہر و تالاب	
	وسعت ایکڑوں میں	فی صد
تین تالاب (دتھورہ، او سرگاپلی اور ماسائی)	۶۱۵	۴۵٫۲
تین نہر ([illegible])	۳۶۹	۲۷٫۸
جملہ	۹۸۴	۷۳٫۰

---

[1] واضح رہے کہ سنہ ۱۳۴۲ف کے (مطابق سنہ ۱۹۳۳ء) کے مقابل سنہ ۱۳۴۳ف مطابق سنہ ۱۹۳۴ء میں جملہ رقبہ کاشت ۱۴۵۲ ایکڑ سے گھٹ کر ۱۳۶۰ ایکڑ ہوگیا۔

نہر کی اجرائی سے دوسری سہولت یہ ہوئی کہ اب فصل تابی کی کاشت میں بارش کی اہمیت نسبتاً کم ہو گئی کیونکہ اگر ایک آدھ سال قلت بارش کی وجہ سے تالابوں میں پانی کی مقدار کم رہے تو نہروں کے ذریعہ مدد لی جاتی ہے اور فصل تابی کے رقبۂ کاشت میں غیر معمولی کمی نہیں ہونے پاتی جس طرح کہ اجرائی نہر سے قبل ہوا کرتی تھی۔ اجرائی نہر سے اب تک ۱۳۴۳ف تا ۱۳۴۸ف مطابق ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۹ء فصل تابی کی کاشت میں پانی کی قلت کبھی بھی محسوس نہیں ہوئی۔ حالانکہ اجرائی نہر سے قبل فصل تابی کی کاشت بہت ہی غیر یقینی ہوتی تھی۔ چنانچہ ذیل کے اعداد سے ہمیں اس امر کا اندازہ ہوتا ہے کہ نہر جاری ہونے سے قبل کس طرح فصل تابی کا رقبہ ایک سال میں بہت زیادہ ہوتا تھا تو دوسرے سال میں بہت ہی کم۔

سال فصلی	مزروعہ فصل تابی		سال فصلی	مزروعہ فصل تابی		سال فصلی	مزروعہ فصل تابی	
	ایکر	گنٹے		ایکر	گنٹے		ایکر	گنٹے
۱۳۳۴	۳	-	۱۳۳۷	۳	۳۱	۱۳۴۰	۷	۲۴
۱۳۳۵	۳	۱	۱۳۳۸	۱۱۹	۱۷	۱۳۴۱	۲	۱۰
۱۳۳۶	۲۴	۱۴	۱۳۳۹	۱	۳۶	۱۳۴۲	۷۲	۱

لیکن نہر کی بدولت فصل تابی کے رقبۂ کاشت میں اگر ایک طرف بہت اضافہ ہو گیا تو دوسری طرف قلت بارش کی وجہ سے سابقہ غیر یقینی صورت حال بھی باقی نہیں رہی چنانچہ ۱۳۴۳ف مطابق ۱۹۳۴ء کے بعد سے فصل تابی کی کاشت حسب ذیل رہی۔

سال فصلی	مزروعہ فصل تابی		سال فصلی	مزروعہ فصل تابی		فصلی سال	مزروعہ فصل تابی	
	ایکر	گنٹے		ایکر	گنٹے		ایکر	گنٹے
۱۳۴۳	۳۲۶	۳۱	۱۳۴۵	۳۰۲	۲۳	۱۳۴۷	۳۰۶	۳۲
۱۳۴۴	۲۹۹	۱	۱۳۴۶	۳۱۶	۳۳	[illegible]	[illegible]	[illegible]

بہرطور موضع ہذا کے ذرائع آبپاشی کے متعلق ہم یہ رائے قائم کرسکتے ہیں کہ وہ بہت تشفی بخش ہیں۔

لیکن جب ہم اس امر پر غور کرتے ہیں کہ یہاں کے کسان مذکورہ ذرائع آبپاشی سے کس طور پر اور کیونکر استفادہ کررہے ہیں تو حالات بہت ہی مایوس کن نظر آتے ہیں اکثر کسان ذرائع آبپاشی کی مزید سہولتوں سے خوش نظر آنے کی بجائے اس امر کے شاکی پائے گئے کہ نہر کی اجرائی سے انہیں بجائے فائدے کے نقصان ہورہا ہے[۱]۔

جب ہم کسانوں کی زبان سے یہ سنتے ہیں تو ہمیں تعجب ہوتا ہے کہ ایک زرعی مقام کے باشندے ذرائع آبپاشی جیسی اہم سہولتوں کی شکایت کریں!! اس شکایت کی وجہ یہ بتلائی جاتی ہے کہ چونکہ خشک اراضیات کے مقابل تر اراضیات کی مالگزاری زیادہ ہوتی ہے لہٰذا تر زمینات کی کاشت میں اسقدر گنجایش نہیں ہوتی کہ مصارف پیدائش اور مالگزاری کی منہائی کے بعد قابل لحاظ آمدنی ہوسکے بعض مرتبہ یہ آمدنی اسقدر قلیل ہوتی ہے کہ اس سے مصارف پیدائش اور رقم مالگزاری بمشکل حاصل ہوتے ہیں۔

لیکن مزارعین کی اس شکایت سے ہمیں اتفاق نہیں ان کا یہ خیال کہ چونکہ تر زمینات کے مقابل خشک زمینات کی مالگزاری کم ہوتی ہے لہٰذا ان کے لئے بہتر اور مناسب یہ ہے کہ موضع کی زمینات کا ایک بڑا حصہ خشک اراضیات پر مشتمل ہو[۲] بہت ہی غیر معقول ہے۔ تر زمینات کی کاشت میں انہیں قلیل آمدنی محض اس لئے نہیں ہورہی ہے کہ خشک زمینات کے مقابل تر زمینات کی مالگزاری زیادہ ہے۔ بلکہ قلیل آمدنی کی اصلی اور بنیادی وجہ غیر اصولی نظام زراعت ہے۔ پیدایش دولت کا خواہ کوئی شعبہ کیوں نہ ہو عاملین پیدائش کا ایک موزون اور مفید تناسب میں مشغول رہنا ضروری ہے۔ ورنہ خاطر خواہ آمدنی کی توقع نہیں رکھی جاسکتی۔ موضع ہذا میں ہمیں متعدد مثالیں ایسے کسانوں کی ملتی ہیں جن کے ہاں زرعی عوامل پیدائش زمین، زرعی محنت اور زرعی راس المال بہت ہی غیر متناسب ہیں یا نہ صرف عوامل پیدائش میں عدم تناسب پایا جاتا ہے بلکہ زرعی طریقہ ہائے کاشت بھی ناقص ہوتے ہیں۔ دھان کی کاشت جوار کے مقابل بہت ہی

---

[۱] ضمیمہ دوم ملاحظہ فرمایا جائے۔

۱۳۳۴ف	۱۳۳۶ف	۱۳۳۸ف	۱۳۴۰ف
۱۳۳۵ف	۱۳۳۷ف	۱۳۳۹ف	۱۳۴۱ف

[۲] ضمیمہ دوم بیان نمبر (۲) دیکھئے۔

اہتمام طلب ہوتی ہے۔ اس کے لئے نہ صرف زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے بلکہ سرمایہ اور کھاد بھی زیادہ صرف کرنا پڑتا ہے محنت کے لحاظ سے ہمارے کسان کبھی پیچھے نہیں ہٹتے۔ لیکن جب روپیہ اور کھاد کا سوال اٹھتا ہے تو اس کی بہم رسانی سے قاصر رہتے ہیں۔ دھان کی فصلیں بھی دو چند کسانوں کے سوائے عموماً اسی لاپرواہی سے بوئی جاتی ہیں جس طرح کہ جوار بوئی جاتی ہے۔ کھاد بہت ہی قلیل مقدار میں دیجاتی ہے اور بعوبیہ بچانے کی خاطر ضروری کلپائی نہیں کی جاتی نتیجہ یہ کہ پیداوار نی ایکر بہت ہی ادنیٰ اور معمولی ہوتی ہے۔ اس پیداوار کو فروخت کرنے کے طریق بھی حد درجہ ناقص ہوتے ہیں[1]۔ لہٰذا ان حالات کے تحت اگر آمدنی بہت ادنیٰ ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ یہ امر واقعہ ہے کہ کسانوں کو بعض مرتبہ تر زمینات کی کاشت سے اس قدر آمدنی بھی نہیں ہوتی کہ اس سے صرف مصارف پیدائش اور مالگزاری وصول ہو سکیں۔ لیکن ہمیں اس امر کا بخوبی علم ہونا چاہیئے کہ ادنیٰ آمدنی اس لئے نہیں ہو رہی ہے کہ حکومت نے نہر جاری کی یا تر زمینات کی مالگزاری خشک اراضیات کے مقابل زیادہ ہے بلکہ اس کے سب سے اہم وجوہ جن سے تقریباً تمام کسان ناواقف ہیں، زرعی عوامل پیدائش کا عدم تناسب۔ غیر اصولی طریقہ ہائے کاشت، ناقص طریقہ ہائے فروخت اور ناجائز طریقہ ہائے لین دین ہیں[2]۔ لیکن افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے کسان جب کبھی ادنیٰ آمدنی پر غور کرتے ہیں تو وہ مذکورہ وجوہ میں سے ایک وجہ کا بھی لحاظ نہیں کرتے اور یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ چونکہ خشک زمینات کے مقابل تر زمینات کی مالگزاری زیادہ ہے لہٰذا انہیں خشک اراضیات کے مقابل تر اراضیات کی کاشت میں کوئی قابل لحاظ فائدہ نظر نہیں آتا۔ بالفاظ دیگر وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ خشک اراضیات کی بجائے تر اراضیات کی کاشت میں انہیں نقصان ہوتا ہے۔ مگر ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اگر تر زمینات کی کاشت مناسب اور موزوں طریق پر کی جائے تو خشک زمینات سے کہیں زیادہ منافع تر زمینات سے حاصل ہو سکتا ہے لیکن کسان اس بات کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ جہاں تک ہو سکے کم سے کم تر اراضی کاشت کی جائے تاکہ زیادہ سے زیادہ نقصان برداشت نہ کرنا پڑے۔ اجمل کسان تر زمینات کی کاشت اس لئے کرتے ہیں کہ انہیں خشک زمینات

---

[1] فروخت پیداوار کے عنوان پر آٹھویں فصل میں مفصل بحث کی جائے گی۔
[2] مقروضیت کے عنوان پر آٹھویں فصل میں بحث کی جائے گی۔

دستیاب نہیں ہوتیں چنانچہ ان کا بیان ہے کہ اگر انہیں خشک زمینات دستیاب ہوں تو وہ تر زمینات کی کاشت سے بڑی حد تک دست کش ہو جائیں گے[1]۔ مزارعین کے اس رجحان کا نتیجہ یہ ہے کہ تقریباً تمام خشک اراضی زیر کاشت رہتی ہے۔ برعکس اس کے تر زمینات کا بہت بڑا حصہ خارج از کاشت رہتا ہے جس کی وجہ سے حکومت کو موضع ہذا کے ذرائع آبپاشی کا لحاظ کرتے ہوئے ، جس قدر آمدنی ہونی چاہئیے تھی نہیں ہو رہی ہے۔ بندوبست اراضی کا لحاظ کرتے ہوئے حکومت کو موضع زیر بحث سے سالانہ ۱۹۲۷۴ روپئے وصول ہونا چاہئیے تھا لیکن چونکہ تر زمینات کا ایک بڑا حصہ خارج از کاشت رہتا ہے۔ لہذا اب صرف ۹۰۲۴ روپئے وصول ہو رہے ہیں۔ بالفاظ دیگر ۱۳۴۷ف (مطابق ۶ اکتوبر ۱۹۳۷ء تا ۵ اکتوبر ۱۹۳۸ء) میں متوقعہ رقم مالگذاری (۱۹۲۷۴) سے ۱۰۲۵۰ روپئے کم وصول ہوئے۔ آمدنی کا نقصان کس طرح قابل قبول ہو سکتا ہے۔

اگر ذرائع آبپاشی سے حقیقی معنی میں فائدہ اٹھایا جائے اور حکومت کو متوقعہ آمدنی وصول ہو تو اسکے ذریعہ فلاح عامہ کے بہت سے تعمیری کام کئے جا سکتے ہیں

ذرائع آبپاشی سے خاطر خواہ طور پر استفادہ کرنے کا مسئلہ بہت ہی اہم ہے۔ یہاں تک تو ہم نے

۲- زرعی اصل طائر زرعی اصل کے ایک جز یعنی زرعی اصل قائم (جس میں مویشی۔ آلات زراعت اور مصنوعی ذرائع آبپاشی کو شامل کیا گیا ہے) کے حالات بیان کئے۔ لیکن اب ہم زرعی اصل کے ایک دوسرے جز یعنی زرعی اصل طائر (جس میں کھاد اور تخم شامل ہیں) کے حالات بیان کریں گے۔

(الف) کھاد —— خشک اراضیات میں کاشت کی جانے والی اجناس کو (مرچ و تمباکو کے سوا) کسی قسم کی کھاد نہیں دی جاتی۔ ان اراضیات کی قوت زرخیزی کو برقرار رکھنے کے لئے ادواری طریق کاشت سے مدد لی جاتی ہے۔ ادواری طریقہ کاشت کے تحت کسان مقررہ کھیتوں میں ہر سالی اجناس بدل کر بوتے ہیں جس کی وضاحت صفحۂ آئندہ میں کی گئی ہے۔

---

[1] ضمیمہ سوم - بیانات نمبر (۳) [illegible]۔

سال	کھیت			
	پہلا	دوسرا	تیسرا	چوتھا
پہلا	جوار	تل	السی	کپاس
دوسرا	تل	السی	کپاس	جوار
تیسرا	السی	روئی	جوار	تل
چوتھا	کپاس	جوار	تل	السی
پانچواں	جوار	تل	السی	کپاس

حسب صراحت بالا فرض کیجئے کہ ایک کسان کے ہاں کھیت کے چار ٹکڑے ـــــ پہلا۔ دوسرا۔ تیسرا اور چوتھا ـــــ ہیں۔ پہلے سال ان چار ٹکڑوں میں سے ایک ٹکڑے پر جوار کی کاشت کیجاتی ہے۔ دوسرے پر تل بویا جاتا ہے۔ تیسرے پر السی اور چوتھے پر کپاس۔ دوسرے سال مذکورہ کھیتوں میں علی الترتیب جوار۔ تل السی اور کپاس کاشت نہیں کئے جاتے کیونکہ اس طرز عمل سے زمین کی قوت پیدائش نسبتاً گھٹ جاتی ہے لہذا اس قوت کو برقرار رکھنے کے لئے اجناس کاشت بدل دیئے جاتے ہیں۔ مثلاً پہلے سال جس کھیت میں جوار بوئی گئی تھی دوسرے سال تل کی کاشت کی جاتی ہے جس کھیت میں تل بویا گیا تھا اس میں السی کاشت کی جاتی ہے۔ جس میں السی کاشت کی گئی تھی اس میں کپاس بوئی جاتی ہے اور جس میں کپاس بوئی گئی تھی اس میں جوار بوئی جاتی ہے۔

اس طرح ہم دیکھ رہے ہیں کہ سال اول جوار پہلے کھیت میں بوئی گئی تھی تو اب وہ چوتھے کھیت میں بوئی گئی ہے۔ تل دوسرے کھیت میں بویا گیا تھا تو اب وہ پہلے کھیت میں بویا گیا ہے۔ السی کی کاشت تیسرے کھیت میں کی گئی تھی تو اب دوسرے کھیت میں کی گئی ہے۔ کپاس چوتھے کھیت میں بوئی گئی تھی تو اب تیسرے کھیت میں بوئی گئی ہے۔

جدول کے دیکھنے سے واضح ہو رہا ہے کہ تیسرے سال پھر اسی قسم کا رد و بدل کیا جاتا ہے۔ چوتھے سال بھی یہی تبدیلی جاری رہتی ہے حتیٰ کہ پانچویں سال زیر بحث چاروں کھیتوں میں بالترتیب وہی اجناس کاشت کئے جاتے ہیں جو کہ چار سال قبل کاشت کئے گئے تھے۔ مابعد سالوں میں پھر وہی ترکیب اختیار کی جاتی ہے۔

واضح رہے کہ مزارعین کے بیان کے مطابق جوار کی کاشت سے زمین کے بہت سے قوتی اجزا کم ہو جاتے ہیں لیکن جب دوسرے سال جوار کے کھیت میں تل کی کاشت کیجاتی ہے تو تل کے پودوں کی پتیاں کھیت میں جھڑتی ہیں اور ان پتوں کی بدولت کھیت کو قوت حاصل ہوتی ہے۔ چونکہ تل کی کاشت کی وجہ سے زمین قوت دار ہو جاتی ہے لہٰذا تل کے بعد السی کی کاشت کی جاتی ہے۔ جوار کی طرح (مزارعین کے بیان کے مطابق) السی کے پودے بھی زمین کی بہت قوت کھینچ لیتے ہیں لہٰذا اسکے بعد کپاس بوئی جاتی ہے۔ کپاس کی پتیاں بھی زمین کو قوت دیتی ہیں۔ کپاس کی کاشت کے بعد جب زمین قوت دار ہو جاتی ہے تو پھر جوار بوئی جاتی ہے۔ اس طرح کسان ایک مرتبہ ایسے پودوں کی کاشت کرتے ہیں جو زمین کی قوت بہت کچھ کھینچ لیتے ہیں۔ دوسری مرتبہ اس نوعیت کے پودے لگائے جاتے ہیں جو زمین کی قوت کو جذب کرنے کی بجائے اپنی پتیوں کی ذریعہ اس کو زرخیز بناتے ہیں۔ جوار اور السی کی کاشت سے زمین کی زرخیزی گھٹ جاتی ہے لیکن تل اور کپاس کی کاشت سے اس کی زرخیزی پھر عود کر آتی ہے۔ لہٰذا کسان جوار۔ السی۔ تل اور کپاس میں رد و بدل کر کے کاشت کرتے رہتے ہیں۔ اور داری طریق کاشت کسانوں کے حق میں بہت مفید ہے چونکہ وہ اس کے ذریعہ کھاد میں بہت کچھ کفایت کر سکتے ہیں۔ چنانچہ اس طریق پر عمل پیرا ہو کر وہ خشک زمینات پر کاشت کی جانے والی اجناس کو (سوائے مرچ و تمباکو کے) کھاد نہیں دیتے۔[1]

جہاں تک کہ استعمال کھاد کا تعلق ہے سیدھی سادی اور قدرتی کھاد استعمال کی جاتی ہے۔ گوبر کے ساتھ مکانات کا کوڑا کرکٹ خراب گھانس اور کڑبی وغیرہ جمع کی جاتی ہے۔ جب یہ چیزیں سڑ گل کر گوبر میں مل جاتی ہیں تو اس مرکب کو بطور کھاد استعمال کیا جاتا ہے۔ اس مرکب کو گوبر کی کھاد کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مینگنی کی کھاد گوبر کی طرح جمع نہیں کی جاتی بلکہ کھیتوں میں سیدھے بٹھائے جاتے ہیں۔

مزارعین کا بیان ہے کہ موضع کی زمینات کا لحاظ کرتے ہوئے شدہ پیداوار حاصل کرنے کے لئے

---

[1] واضح رہے کہ کھاد صرف دھان، مرچ، تمباکو اور نیشکر کے کھیتوں میں ڈالی جاتی ہے۔ باقی اجناس کی کاشت بلا کھاد کی جاتی ہے۔

دھان کے کھیت میں فی ایکڑ اوسطاً پندرہ بنڈی (چھکڑا) مرچ کے کھیت میں بیس بنڈی اور نیشکر کے کھیت میں چالیس بنڈی کھاد دی جانی چاہیئے۔ ۱۳۴۷ف (مطابق ۶ اکتوبر ۱۹۳۶ء تا ۵ اکتوبر ۱۹۳۷ء) میں دھان کا جملہ سالانہ رقبہ کاشت (یک فصلہ و دو فصلہ) ۱۴۸ ایکڑ تھا۔ سات ایکڑ پر مرچ کی کاشت کی گئی تھی اور دس ایکڑ پر گنّا لگایا تھا۔ مزارعین کے مذکورہ حساب کے مطابق (عمدہ پیداوار حاصل کرنے کے لئے دھان، مرچ اور نیشکر کے مندرجہ رقبہ جات مزروعہ کیلئے بالترتیب ۱۲۲۰۔ ۱۴۰ اور ۳۶۰ بنڈی کھاد درکار تھی۔ بالفاظ دیگر ۱۳۴۷ف (مطابق ۶ اکتوبر ۱۹۳۷ تا ۵ اکتوبر ۱۹۳۸ء) میں دھان مرچ اور گنّے کا جو رقبہ کہ کاشت کیا گیا اُس سے عمدہ پیداوار حاصل کرنے کے لئے بحیثیت مجموعی ۱۷۱۰ بنڈی کھاد مطلوب تھی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ۱۳۴۷ف (مطابق ۶ اکتوبر ۱۹۳۷ء) میں جملہ کتنے بنڈی مینگنی اور گوبر پیدا ہوا اس میں کوڑا کرکٹ اور دیگر اشیاء کو مخلوط کرکے کتنے بنڈی کھاد تیار کی گئی کیا یہ کھاد مطلوبہ مقدار (۱۷۱۰ بنڈی) کے مساوی تھی۔ اگر مساوی نہ تھی تو کس قدر؟ اولاً ہم گوبر کی پیداوار کا اندازہ لگائیں گے۔

پانچویں فصل میں ہم معلوم کرآئے ہیں کہ موضع زیر بحث میں ۱۳۴۷ف (مطابق ۶ اکتوبر ۱۹۳۷ تا ۵ اکتوبر ۱۹۳۸ء) کے اعداد کے مطابق زرعی جانوروں کی جملہ تعداد ۹۷۵ ہے۔ ۹۷۵ جانوروں میں سے ۳۰۵ جانوروں کی عمر ۴ سال سے کم ہے اور ۶۷۰ جانور زیادہ از ۴ سال عمر والے ہیں۔ مزارعین کا بیان ہے کہ چار سال سے کم عمر والے سو جانوروں سے روزانہ ۲ بنڈی گوبر حاصل ہوتا ہے اور علاوہ ازیں چار سال عمر والے سو جانوروں سے ڈیڑھ بنڈی فی یوم جب کہ چار سال سے کم اور چار سال سے زائد عمر والے جانوروں کی تعداد علی الترتیب ۳۰۵ اور ۶۷۰ ہے تو ان سے روزانہ بالترتیب ۲ء۲ اور ۱۰ء۰۱ بنڈی گوبر حاصل ہوگا بحیثیت مجموعی تمام زرعی جانوروں سے روزانہ ۲ء۱۲ بنڈی گوبر دستیاب ہوگا جب کہ گوبر کی جملہ روزانہ پیداوار ۱۲ء۲ بنڈی ہو تو سالانہ پیداوار (۱۲ء۲ × ۳۶۵) ۴۴۳۲ بنڈی ہوگی۔

واضح رہے کہ گوبر کی یہ تمام مقدار کھاد بنانے کے لئے استعمال نہیں کی جاتی۔ بلکہ اسکا کافی حصہ جلانے میں صرف ہوتا ہے اور ایک قابل لحاظ حصہ کو مکانات کے لیپنے اور ان کے چبوترے کا [illegible] صرف کیا جاتا ہے۔ مزارعین کا بیان ہے کہ موضع ہٰذا میں نصف اپلی اور نصف لکڑی جلائی جاتی ہے۔ ایک خاندان جو اوسطاً پانچ افراد پر مشتمل ہو روزانہ دس اپلیاں جلاتا ہے جب کہ ایک خاندان روزانہ دس اپلیاں جلائے

تو چونکہ جملہ ۲۳۶ خاندان ہیں لہذا روزانہ جلنے والی اپلیوں کی تعداد ۲۳۶۰ ہوگی۔ مزارعین کے بیان کے مطابق ایک بنڈی گوبر میں ۵۰۰ اپلیاں تیار ہو سکتی ہیں۔ جب کہ ۵۰۰ اپلیاں مساوی ہیں ایک بنڈی گوبر کو تو ۲۳۶۰ اپلیوں کے لئے روزانہ ۴٫۹ بنڈی گوبر درکار ہوگا جب کہ روزانہ ۴٫۹ بنڈی گوبر مطلوب ہے تو سالانہ (۴٫۹×۳۶۵) ۱۷۸۸٫۵ بنڈی گوبر اپلیوں کی خاطر مطلوب ہوگا۔ فرض کیجئے کہ مکانات کے لیپنے اور چھڑکاؤ کرنے میں (ماہانہ دو بنڈی کے حساب سے) سالانہ چوبیس بنڈی گوبر صرف ہوتا ہے۔ اس طرح جملہ ۱۸۱۲٫۵ بنڈی گوبر ہر سال جلانے لیپنے اور چھڑکنے میں صرف ہوگا۔ پیچھے ہم معلوم کر آئے ہیں گوبر کی سالانہ پیداوار ۴۴۵۳٫۰ بنڈی۔ اگر اس مقدار میں سے ۱۸۱۲٫۵ بنڈی منہا کر دیئے جائیں تو ۲۶۴۰٫۵ بنڈی گوبر بچ رہے گا جس کی کھاد بنائی جا سکتی ہے۔ مزارعین کا بیان ہے کہ ایک بنڈی خالص گوبر میں مکانات کا کوڑا کرکٹ، جلی ہوئی اپلیوں کی راکھ، اور خراب گھاس و کڑبی وغیرہ جمع کر کے دو بنڈی کھاد تیار کی جاتی ہے۔ اس حساب سے ۲۶۴۰٫۵ بنڈی خالص گوبر میں ۵۲۸۱ بنڈی کھاد تیار ہوگی۔

گوبر کی کھاد کا اندازہ لگانے کے بعد اب ہم مینگنی کی کھاد کا تخمینہ لگائیں گے۔ موضع زیر تحقیق میں جملہ ۶۰ مینڈھے اور مینڈیاں ہیں۔ واضح رہے کہ جنگل میں جہاں کہیں بھی گوبر پایا جائے اس کو چن لیا جاتا ہے[1] لیکن مینگنیاں نہیں چنی جا سکتیں کیونکہ جانور پہاڑ کے دامن میں ادھر ادھر چرتے رہتے ہیں۔ البتہ سال میں تقریباً تین مہینے کھیتیوں میں چرنے کا موقع ملتا ہے۔ لہذا کھیتوں میں گری ہوئی مینگنیاں کھاد کے کام آتی ہیں۔ اس طرح ۳۶۵ دنوں کے منجملہ ۹۰ یوم۔ رات اور دن کی مینگنیاں کھاد کے کام آتی ہیں۔ باقی ۲۷۵ یوم صرف رات کی مینگنیاں کام آ سکتی ہیں۔ ان تمام جزویات کا لحاظ کرتے ہوئے (دہقانوں کی مدد سے) ہم نے اندازہ لگایا ہے کہ ۶۰ مینڈھے اور مینڈیوں وغیرہ سے سالانہ ۱۲۰ بنڈی مینگنی حاصل ہوتی ہے۔ جان کینی کی کتاب "ہندوستان میں کاشت عمیق" کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مینگنی گوبر کے مقابل تقریباً دو گنی مقوی ہوتی ہے[2]۔ لہذا ہم مینگنی کی بنڈیوں کو گوبر کی بنڈیوں میں تبدیل کرنے کے لئے ۱۲۰ بنڈیوں کو دو سے ضرب

---

[1] دیہات میں چھوٹی لڑکیوں کا ایک فریضہ یہ بھی ہے کہ صبح ہوتے ہی جنگل سے سوکھا گوبر چن لائیں

[2] ترجمہ مظفر حسین صاحب صفحہ (۱۳۲) دیکھئے۔

دیں گے۔ جس کے بعد ۱۲۰ بنڈی مینگنی ۲۴۰ بنڈی خالص گوبر کے مساوی ہوگی۔ ایک بنڈی خالص گوبر میں چونکہ دو بنڈی کھاد تیار ہوتی ہے۔ لہٰذا ۲۴۰ بنڈی خالص گوبر ۴۸۰ بنڈی کھاد کے مساوی ہے۔ اس طرح ہم دیکھ رہے ہیں کہ گوبر کی کھاد کی سالانہ پیداوار (۵۶۸۱ + ۴۸۰) ۶۱۶۱ بنڈی ہوگی۔

واضح رہے کہ گدھے اور گھوڑوں کی لید بھی رائیگاں نہیں کی جاتی۔ سال میں جسقدر لید حاصل ہوتی ہے اس کو جمع کرکے بطور کھاد استعمال کیا جاتا ہے۔ پانچویں فصل میں ہم معلوم کر آئے ہیں کہ موضع ہذا میں جملہ ۳۵ گدھے اور دو گھوڑے ہیں۔ دیہاتیوں کے اندازہ کے مطابق ان جانوروں سے سالانہ ۲۴ بنڈی لید حاصل ہوتی ہے جان کینی نے بتلایا ہے کہ گوبر کے مقابل لید ڈیڑھ گنی مقوی ہوتی ہے[1]۔ اس حساب کے مطابق لید کی ۲۴ بنڈیوں کو گوبر کی بنڈیوں میں تبدیل کرنے سے ۳۶ بنڈیاں حاصل ہونگی۔ چونکہ ایک بنڈی خالص گوبر میں دو بنڈی کھاد تیار ہوتی ہے لہٰذا ۳۶ بنڈیوں میں ۷۲ بنڈی کھاد تیار ہوگی۔ اگر ہم ان بنڈیوں کو کھاد کی سابقہ بنڈیوں (۶۱۶۱) میں جمع کرلیں تو موضع زیر بحث میں کھاد کی سالانہ پیداوار مکمل طور پر حاصل ہوگی۔ اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ موضع ہذا میں سالانہ (۷۲ + ۶۱۶۱) ۶۲۳۳ بنڈی کھاد تیار ہوتی ہے۔ فرض کیجئے کہ ایک سو بنڈی کھاد کی حمل و نقل میں ایک بنڈی ضایع ہوتی ہے۔ لہٰذا ۶۲۳۳ بنڈی کھاد کی حمل و نقل میں ۶۲ بنڈی سے کسیقدر زیادہ کھاد ضایع ہوگی۔ ۶۲۳۳ بنڈی میں سے ضایع شدہ ۶۲ بنڈی منہا کرنے کے بعد ۶۱۷۱ بنڈی کھاد بچ رہی جس کو سنہ ۱۳۴۷ف (مطابق ۶ اکتوبر سنہ ۱۹۳۷ع تا ۵ اکتوبر سنہ ۱۹۳۸ع) میں دھان مرچ اور نیشکر کی کاشت کے لئے استعمال کیا گیا۔ واضح رہے کہ عمدہ پیداوار حاصل کرنے کے لئے بحیثیت مجموعی ۱۲۷۱۰ بنڈی کھاد مطلوب تھی۔ لیکن صرف ۶۱۷۱ بنڈی دستیاب ہوئی۔ کھاد کی اس کمی کو بیان کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ عمدہ پیداوار حاصل کرنے کے لئے اگر سو بنڈی کھاد درکار تھی تو صرف ۴۸.۵۵ بنڈی دستیاب ہوسکے۔ یا بالفاظ دیگر یوں کہا جاسکتا ہے کہ عمدہ پیداوار حاصل کرنے کے لئے بحیثیت مجموعی جس قدر کھاد مطلوب تھی اس سے ۵۱.۴۵ فی صد کم دستیاب ہوئی۔ جب کہ کمی کھاد کی یہ حالت ہو تو

---

[1] ہندوستان میں کاشت تحقیق مترجمہ منظر حسین صاحب صفحہ (۱۴۳) دیکھئے۔

جب کہ یہی حالت کم و بیش کئی سال سے جاری ہے تو بھلا ایسی صورت میں زمین کی قوت پیداواری ایک اچھے معیار پر کیوں کر برقرار رہ سکتی۔ جس طرح ناکافی اور غیر صحت بخش غذا کی وجہ سے نسل انسانی دن بدن کمزور ہوتی چلی آرہی ہے اسی طرح ناکافی اور ناقص طریق کھاد کی بدولت زمین کی زرخیزی کا مسئلہ بھی اہم سے اہم تر ہوتا جارہا ہے۔

(ب) تخم —— یہاں تک تو ہم نے زرعی اصل وائٹر کے ایک جزو یعنی کھاد کی تشریح کی لیکن اب اُس کے دوسرے جزو یعنی تخم کا حال معلوم کرینگے۔

عمدہ پیداوار حاصل کرنے کے لئے جہاں اور امور کا لحاظ ضروری ہے ساتھ ہی ساتھ عمدہ تخم کی اہمیت کو بھی کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ کھاد کسقدر زائد کیوں نہ ڈالی جائے اگر تخم بھی عمدہ نہ ہوں تو خاطرخواہ پیداوار نہیں حاصل ہوسکتی۔

جملہ اجناس کے تخم مقامی طور پر حاصل کئے جاتے ہیں۔ تقریباً تمام کسان اختتام فصل پر اجناس کا ایک مناسب حصہ آئندہ تخم ریزی کے خاطر احتیاط کے ساتھ محفوظ کرلیتے ہیں۔ دھان کے تخم عام طور پر گمیوں میں رکھے جاتے ہیں۔ گمی بانس کی بنی ہوئی ہوتی ہے۔ تخم کو گمی میں بھرنے کے بعد اس پر دھان کا گھاس ڈالا جاتا ہے۔ اور بعدازاں مٹی کی ایک پتلی تہہ اس طور پر بچھا دی جاتی ہے کہ گمی کا منہ مکمل طور سے بند ہوجائے۔ تخم ریزی سے قبل گمی کو چار پانچ مرتبہ کھولا جاتا ہے اور دھان سوکھائے جاتے ہیں۔ دھان کو سوکھانے کے بعد گمی کو پھر اسی طرح بندکردیا جاتا ہے۔ مزارعین کا بیان ہے کہ اس طرز عمل سے بیج خراب ہونے نہیں پاتا۔ چنے مونگ وغیرہ کے تخم میں راکھ نیم کا پتا اور بھلانوے ڈالکر کسی محفوظ چیز میں رکھ دیا جاتا ہے۔

حفاظت تخم کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ کسان انتہائے ہوشیاری کے ساتھ اسکو عمدہ حالت میں رکھنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن قسم تخم پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت ہی ادنیٰ اور معمولی ہے۔ نہ صرف دھان بلکہ ہر جنس گھٹیا قسم کی بوئی جاتی ہے ناکافی کھاد اور گھٹیا تخم کی وجہ سے پیداوار فی ایکڑ بھی ادنیٰ ہوتی ہے چنانچہ ہم ضلع ہذا کی مختلف پیداواروں کا تفصیلی حال آئندہ فصل میں بیان کریں گے۔

ساتویں فصل

طریقہ ہائے کاشت۔ زرعی پیداوار۔ زرعی فروخت

۱۔ **طریقہ ہائے کاشت** | دیگر امور کے علاوہ زرعی پیداوار کی زیادتی یا کمی پر طریقہ ہائے کاشت کا بھی بہت گہرا اثر پڑتا ہے۔ اگر طریقہ ہائے کاشت اصولی ہوں تو پیداوار بھی زیادہ ہوگی۔ برعکس اس کے غیر اصولی طریقہ ہائے کاشت کی بنا پر پیداوار کی تخفیف ایک لازمی امر ہے۔ اصولی طریقہ ہائے کاشت سے ہماری مراد یہ ہے کہ کھیت کی جتائی۔ کھاد ڈلائی۔ بوائی۔ کلپائی (ویڈنگ)۔ سینچائی۔ نکائی۔ اور کٹائی بروقت اور مناسب طریق پر کی جانی چاہیئے۔ خصوصاً اچھی جتائی عمدہ پیداوار حاصل کرنے کے لئے نہایت ضروری ہے۔ جتائی کی اہمیت کے متعلق جیتھرو ٹل (جو کہ بہت بڑا عالم زراعت گذرا ہے) کہتا ہے کہ "کھیت کی جتائی کرنا کھاد دینا ہے"۔ کانپور کے سرکاری مزرعہ زراعت پر ۲۵ سال متواتر تجربہ کے بعد یہ ثابت ہوا ہے کہ اچھی جتائی کھاد دینے سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔ (واضح رہے کہ اچھی جتائی کا مدار بڑی حد تک عمدہ آلات پر بھی ہے۔) حقیقت تو یہ ہے کہ کھاد کا پورا پورا فائدہ بھی اسی وقت اٹھایا جا سکتا ہے جب کہ کھیت عمدگی کے ساتھ جوتا گیا ہو۔ عمدہ پیداوار حاصل کرنے کے لئے کھیت کو نہ صرف عمدگی کے ساتھ جوتنا چاہیئے بلکہ اس کا بروقت جوتا جانا بھی ضروری ہے۔ ماہرین کی رائے میں کھیت کی جتائی بارش سے قبل ہو جانی چاہیئے کیونکہ اس کی وجہ سے مختلف فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ بارش کا پانی گہرائی تک پہنچ سکتا ہے جنگلی پودے بہت کم اُگتے ہیں اور ہوا کی کیڑے بھی مر جاتے ہیں ...

واضح رہے کہ موضع زیر بحث میں ۲ قسم کے کسان ہیں۔ ایک وہ جن کو "کبنی" کہا جاتا ہے۔ "کبنی"

(مطبوعہ مطبع نظام دکن واقع بازار عیسیٰ میاں)